اردو

جلد ۱۳ — جنوری سنہ ۱۹۳۳ ع — حصہ ۴۹

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۱)

از اڈیٹر

مرحوم میں اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ایک عزیز چیز تھی جسے زمانے کے اتفاقات اور حالات نے عین ایسے وقت میں زندہ دفن کردیا جب کہ اس کے عروج کا وقت آیا تھا اور جب کہ وہ گذشتہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے ملک کے لئے تبلیغ علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز بن سکتا تھا - اس کے ثبوت میں صرف ان ناموں کا گنا دینا کافی ہے جنھوں نے محض اس کالج کے فیض سے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی اور علم کی ایسی خدمت کی جو مدتوں یادگار رہے گی - اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا - اگرچہ اس کے مٹتے ہی یہ طریقہ بھی مٹ گیا لیکن اتنی مدت کے تجربے کے بعد ہماری یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ پھر اسی طرف عود کر رہی ہیں اور آخر وہی مسلک اختیار کرنا پڑے گا - ایسی حالت میں اسے مرحوم تو کیا شہید بھی کہیں تو بجا ہے - کیوں کہ وہ بلا وجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے بھینٹ چڑھا دیا گیا - دلی کو سیاسی انقلاب نے جہاں اور داغ دیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا - افسوس اب لوگ اس کا نام بھی بھولتے جاتے ہیں - اب میں اس عزیز کی کہانی جہاں تک مجھے نئے پرانے کاغذات اور کتابوں میں

میں ملی یا اس کے سوگواروں کی زبانی معلوم ہوئی ہے، آپ کو سناتا ہوں اور اس کے کارناموں کی یاد دلاتا ہوں —

تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس تعلیم گاہ کی ابتدا سنه ۱۷۹۲ ع میں ہوئی * لیکن مسٹر ٹامسن وزیٹر † اورنٹیل کالجز ممالک مغربی شمالی اپنی تعلیمی رپوٹ بابت سنه ۴۲-۱۸۴۱ ع میں لکھتے ہیں کہ اورنٹیل کالج دہلی کو عالم وجود میں آئے سولہ سال ہوتے ہیں - اس حساب سے اس کی ابتدا کا سنه ۱۸۲۵ ع ہوتا ہے - لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی تعلیمی اور دفتری تحریروں میں اس کے ابتدائی قیام کا سنه ۱۷۹۲ ہی لکھا ہے - اور ۳۹-۱۸۳۸ ع کی تعلیمی رپوٹ میں اس سال کو کالج کا سینتالیسواں سال اور سنه ۱۸۴۰ ع کی رپوٹ میں چالیسواں سال بتایا ہے - مسٹر ٹامسن نے غالباً اس کے قیام کا شمار اس وقت سے کیا ہے جب اس کی جدید تنظیم ہوئی اور انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس کا آغاز سنه ۱۷۹۲ ع میں ہوا - اور قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بسم اللہ دہلی کی اس خوبصورت اور تاریخی عمارت میں ہوئی جو غازی الدین خاں کے مدرسہ کے نام سے مشہور ہے اور نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی خلف نواب نظام الملک آصف جاہ کا بنایا ہوا ہے - مخیر بانی کی نیک نیتی کا پھل ہے کہ اب تک وہاں تعلیم کا فیضان جاری ہے اور اینگلو عربک اسکول جو اب کالج ہوگیا ہے، سالہاسال سے اس کے درس و تدریس کا سلسلہ وہیں قائم ہے

---

* دی بنگال اینڈ آگرہ اینول گائڈ اینڈ گزیٹیر سنه ۱۸۴۱ ع

† وزیٹر اس زمانے میں ایسا ہی تھا جیسے آج کل انسپکٹر

البتہ یہ نہیں کھلتا کہ اس وقت مدرسے کی کیا حالت تھی، تعلیم کیسی هوتی تھی تعلیم دینے والے کون تھے، دلی میں مقبول تھا یا نہیں۔ غرض اس کے سو سالہ حالات پر بالکل پردہ پڑا هوا هے۔ قیاس غالب یہ هے کہ یہاں بھی مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم هوتی هوگی اور وهی رنگ هوگا جو اُس وقت دوسرے مدرسوں کا تھا۔ کیوں کہ سنہ ۱۸۲۵ ع سے قبل اُن مدارس میں بھی جو سرکاری کہلاتے تھے، مشرقی السنہ و علوم هی کی تعلیم دی جاتی تھی اور اُن میں وهی پرانا طریقۂ تعلیم، وهی حالات اور وهی رنگ تھا۔ اس کی تصدیق بعض سرکاری تحریروں سے بھی هوتی هے خصوصاً ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال کے تعلیمی تبصرے سے جس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا هے —

سنہ ۱۸۲۳ ع کے اواخر میں مجلس تعلیم عامہ (General Committee of Public Instruction) نے ایک مطبوعہ گشتی چٹھی دهلی، آگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی، جس میں اُن اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کئے گئے تھے۔ نیز یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ ان مقامات میں توسیع و ترقیء تعلیم کے لئے کیا کیا وسائل اور ذرائع اختیار کئے جاسکتے هیں۔ اُن کے استفسارات یہ تھے کہ اُن اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون کون سے مکتب یا تعلیم گاهیں هیں۔ اُن میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی هے اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی هیں۔ اُن میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد و اعانت کے مستحق معلوم هوتے هیں اور اس امداد کی کونسی صورت زیادہ مناسب اور بہتر هوگی۔ ان سب امور کے بیان کرنے کے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی کہ گورنمنت کا منشا دلی میں کالج قائم کرنے کا هے۔ نیز کمیٹی نے یہ خواهش بھی ظاهر کی کہ اگر اُن مقامات میں ایسے اوقاف

موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کے لئے کام آسکیں تو ان سے بھی مطلع کیا جاے —

دھلی کی مقامی مجلس نے جنوری سنہ ۱۸۲۴ ع میں اپنا جواب بھیجا جس میں اُس نے مختلف امور سے بحث کی ھے - اس میں یہ بیان کیا گیا ھے کہ وھاں بہت سے خانگی مدارس موجود ھیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں دستور ھے یہ کار خیر سمجھ کر قائم کئے گئے تھے - ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ھوتی ھے - طالب علموں کا بہت سا وقت قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے اور فقہ کی تعلیم میں صرف ھوتا ھے - آبادی کے مقابلے میں طالب علموں کی تعداد بہت ھی کم ھے بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ کچھ نہیں - حاضری بے قاعدہ ھے اور جو تعلیم کہ ان مدرسوں میں دی جاتی ھے اس سے بہت ھی کم فائدہ پہنچتا ھے —

اس جواب میں اس کا ذکر بھی تھا کہ کچھ دنوں پہلے یہاں متعدد درسگاھیں حکومت وقت کی طرف سے قائم تھیں لیکن اب وہ نہایت خراب و خستہ حالت میں ھیں - ان کے مصارف کے لئے جو انتظام تھا وہ سیاسی انقلاب کی وجہ سے درھم برھم ھوگیا ھے اور اب اُن رقوم کا پھر حاصل کرنا امکان سے باھر ھے —

دھلی میں سرکاری درسگاہ کے قیام کے متعلق مقامی مجلس نے لکھا کہ اس کی امداد کے لئے ساڑھے تین ھزار روپے سالانہ کی گنجائش نکل سکتی ھے اور کچھ دنوں بعد اس میں اضافہ بھی ممکن ھے —

اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دھلی جیسے آباد شہر میں ایسے اشخاص کی خاصی بڑی تعداد موجود ھے جو کسی زمانے میں بہت مرفہ الحال تھے لیکن سیاسی تغیرات کی وجہ سے اب نان شبینہ کو محتاج ھیں مگر اس

پر بھی وہ کسی ادنیٰ پیشے کو اختیار کرنا باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں - اس لئے اگر مجوزہ کالج قائم ہوگیا تو اس قبیل کے بعض لوگ ضرور اس کی طرف مائل ہوں گے تاکہ تعلیم پاکر عزت سے بسر کرسکیں —

مجلس نے یہ بھی تجویز کیا کہ یہ کالج بلا تاخیر فوراً قائم کردیا جائے اور تعلیم کے لئے مولویوں کا تقرر کیا جائے - اور چونکہ یورپی علوم کی تعلیم اس کا خاص مقصد ہوگا لہذا بعض اعلیٰ درجے کی کتابیں جو مشرقی زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں، اس کالج کے لئے مہیا کی جائیں - مجلس نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ اس نئے طریقے کے جاری کرنے میں اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ طالب علموں کے لئے اس میں ایسی کشش ہو کہ وہ خوشی خوشی اس تعلیم کو حاصل کریں اور وہ کشش ملازمت کی توقع ہوسکتی ہے —

مجلس نے اپنے جواب کو بہت ہی پرجوش الفاظ پر ختم کیا ہے جن سے دلی کی محبت ٹپکتی ہے - وہ لکھتے ہیں —

" جب آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گزشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جب کہ دلی اس عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا شاندار دارالخلافہ تھی، جو علوم و فنون کی سرپرستی اور ہنر پروری کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور تھی اور اس کے زرخیز و خوش حال خطوں کے فرزند علم کے شوق میں اس مشرقی علوم کے گہوارے میں جوق جوق آتے تھے اور جہاں ایسے ایسے شاعر اور حکیم پیدا ہوے ہیں جن کے نام اب تک تاریخ کے صفحات پر یادگار ہیں،

اور پھر جب آپ کے ارکان اُن بیشمار تعلیم گاہوں کے کھنڈروں کا خیال کریں گے جو اُن شاہانہ فیاضیوں کے آثار ہیں جو علم کی اشاعت و ترقی کے لئیے وقف تھیں اور اب خراب و خستہ اور شکستہ حال ہیں - اور جب وہ گزشتہ عہد کی اُن مقدس علمی یادگاروں کو دیکھیں گےجن پر اب ویرانی و بیکسی برستیھے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تو ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ارکان کے دلوں میں دلی کی ہمدردی کا جوش پیدا ہوگا اور آپ ' جن کے ہاتھوں میں رعایا کی دماغی ترقی و اصلاح کا کام تفویض کیا گیا ہے ' ضرور دلي کے لیے اس عطیے کا ایک حصہ مخصوص کردیں گے جو گورنمنٹ نے اس غرض کے لیے منظور کیا ہے " —

جس عطیے کی طرف اوپر کی تحریر میں اشارہ کیا گیا ہے یہ وہ رقم تھی جو جنرل کمیٹی کی تفتیش حالات تعلیم کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما کی سفارش پر پارلیمینٹ نے ہندوستان کی تعلیم کے لیے سنه ۱۸۲۴ ع میں منظور کی تھی - اس کی کل مقدار ایک لاکھ روپیہ تھی —

غرض اس مجوزہ کالج کا افتتاح سنه ۱۸۲۵ ع میں ہوا اور اُس " شاہانہ عطیے " میں سے اس کالج کے لیے پانسو روپیہ ماہانہ مقرر کیے گئے - مسٹر جے - ایچ ٹیلر مقامی مجلس کے سکرٹری ایک سو پچھتر روپیہ ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوے - ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے ' باقی پچیس پچیس اور تیس تیس کے تھے ' طلبہ کے لیے بھی وظائف مقرر ہوئے سالانہ رپوٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں

مولویوں کے عزل و نصب ' سالانہ امتحانات کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے —

انگریزی زبان کی تعلیم کی ابتدا

سنہ ۱۸۲۸ ع میں جب سر چارلس مٹکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش پر کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا تو اوکل فنڈ کی تعلیمی بہت سے دو سو پچاس روپے * اور کالج کے لیے منظور کیے گئے —

اس بدعت سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی - دیندار بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے مذہب بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب کے پھیلانے کی ترکیب ہے - یہی مشکل بنگال میں بھی پیش آئی تھی ' لیکن وہاں راجہ موہن رائے جیسا روشن خیال اور زبردست رہنما موجود تھا ' وہاں یہ آندھی اٹھی تو سہی مگر چند ہی روز میں بیٹھ گئی - وہاں مخالفت برہمنوں سے شروع ہوئی تھی تو یہاں مسلمان پیش پیش تھے - یہ بدگمانی کچھ زیادہ بیجا بھی نہ تھی - بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب لڑکے انگریزی مدرسوں میں داخل ہوئے اور انہوں نے وہاں نئی نئی چیزیں دیکھیں اور پڑھیں تو وہ اس قسم کی واہی تباہی باتیں کرنے لگے جس سے پرانے خیال کے لوگوں کو خواہ مخواہ بدگمانی کا موقع ملا - یہ بھی ایک وجہ ہے (جیسا کہ آگے چل کے معلوم ہوگا) کہ مسلمان طلبہ کی تعداد انگریزی شعبے میں

---

* مسٹر ٹامس فشر (searcher of Records) نے جو یاد داشت سنہ ۱۸۲۸ ع میں ایسٹ انڈیا ہوس میں مرتب کی تھی اس میں تحریر ہے کہ دهلی کالج کے لیے چھ سو روپے ماہانہ تعلیمی فنڈ سے اور دوسو پچاس روپے ماہانہ دهلی کے فنڈ سے منظور کئے گئے اور دهلی مدرسہ کے لیے سات سو روپے ماہانہ اور اس کے علاوہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مسٹر ٹیلر کا الونس منظور کیا گیا جو اس کے مہتمم مقرر ہوئے —

اکثر کم رہی - مولانا حالی نے ایک موقع پر اس کا اشارہ کیا ہے جس سے اس وقت کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

" اگرچہ اِس وقت قدیم دهلی کالج خوب رونق پرتھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر سمجھا جاتاتھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر قصبۂ پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ھی سننے میں نہیں آتاتھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھہ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے - بلکہ بر خلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے - دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھہ کو شب روز رهنا پڑا وهاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاهل سمجھتے تھے - غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا - ڈیڑہ برس دهلی میں رهنا هوا اس عرصے میں کبھی کالج کو جاکر آنکھہ سے نہ دیکھا اور نہ اُن لوگوں سے ملنے کا اتفاق هوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے " مگر رفتہ رفتہ یہ تعصب کم هوتا گیا - زمانہ ایسی چیزوں کی اصلاح خود کر دیتا ہے - اگر چہ بعد میں بعض واقعات ایسے پیش آے کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ان کی بدگمانی بیجا نہ تھی —

نواب اعتماد الدولہ کا وقف

سنہ ۱۸۲۹ ع کی رپوٹ * غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے - ایک بات تو قابل ذکر یہ ہے کہ ایک اعزازی جماعت ایسی بنائی گئی جس نے طلبہ میں خاص جوش اور شوق پیدا کردیا - دوسری چیز کتب خانے کی توسیع ہے اور اس کے علاوہ سب سے بڑہ کر قابل ذکر اور لایق ستائش بادشاہ اودہ کے وزیر کا فیاضانہ عطیہ اور وقف ہے جس کا مختصر واقعہ یہ ہے —

---

* تبصرہ تعلیم عامہ احاطہ بنگال نوشتہ مسٹر جے - کر بابت سنہ ۱۸۳۵ ع تا سنہ ۵۱ ع (حصہ دوم - باب ۹)

نواب اعتمادالدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے دهلی کے رزیڈنٹ سے یہ خواهش ظاهر کی کہ وہ ایک لاکھہ ستر هزار کی رقم اس غرض سے گورمنٹ کے حوالے کرنا چاهتے هیں کہ اس کی آمدنی سے دهلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے واسطے ایک درس گاہ قائم کی جاے اس کی صورت وقف کی هوگی اور یہ رقم گورمنٹ کے پانچ فیصدی والے قرضے میں لگا ی جاے —

گورمنٹ نے اس فیاضانہ عطیے کو نہایت شکریے کے ساتھہ قبول کیا مگر جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کے مشورے کے بعد نواب صاحب کو جو راے دی وہ رزیڈنٹ دهلي کی حسب ذیل تحریر میں مندرج هے —

" اس خیال سے کہ پانسو روپے ماهوار مقصد پیش نظر کی تکمیل کے واسطے کافی نہیں هیں لاٹ صاحب دوستانہ مشورہ دیتے هیں کہ مذکورۂ بالا مقصد کے لئے جو رقم آپ خرچ کرنا چاهتے هوں اگر اسے اس رقم میں شامل کرلیا جائے جو گورمنٹ نے شہر دهلی میں اپنے کالج کے واسطے مقرر کی هے اور یہ دونوں رقمیں مل کر موجودہ کالج پر خرچ هوں تو لوگوں کو متوقع نفع حاصل هو گا اگر آپ اس تجویز کو منظور فرمالیں گے تو آپ گورمنٹ کالج کے معاملات کے مہتمم یا افسر سمجھے جائیں گے اور پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر آپ کے نام سے هوگا ـ"

نواب صاحب نے اسے منظور فرمایا اور سنہ ۱۸۳۰ ع میں جو وصیت نامہ نواب صاحب نے اس کے متعلق تحریر فرمایا اس میں یہ الفاظ درج هیں —

"................... میں ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم
نیک نیتی سے اس کالج کی امداد کے واسطے برٹش
گورمنٹ کی تحویل میں چھوڑتا ہوں جو نواب
غازی الدین خاں مرحوم نے میرے وطن دھلی میں عربی
و فارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا
جو میرے مذھبی علوم ھیں اور اخلاق کے سر چشمہ ھیں
اور میں وصیت کرتا ھوں کہ رقم موقوفہ کا منافع ان
علوم کے طلبہ اور اساتذہ پر خرچ کیا جائے"

اس وصیت نامے میں انھوں نے اپنے داماد سید حامد علی خان کو ان شرائط کا نگران بنایا تھا کہ اگر گورمنٹ کی طرف سے بوجہ کثرت مشاغل یا دیگر غیر متوقع اسباب کی وجہ سے تساھل واقع ھو تو وہ گورمنٹ کو اس طرف توجہ دلائیں اور بصورت ناکامی گورمنٹ سے ایک جداگانہ کالج قائم کرنے کی درخواست کریں * —

سنہ ۱۹۳۰ ع میں نواب صاحب کا انتقال ھوگیا - مگر افسوس کہ حسب وعدہ نہ پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر ان کے نام سے ھوا نہ وظائف ان کے نام سے دئے گئے نہ کسی قسم کی کوئی یادگار کالج میں ان کی قائم کی گئی - البتہ اتنا ضرور ھوا کہ اس رقم سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ھوگیا - نواب حامد علی خاں نے اس رقم کے بیجا صرف ھونے کی طرف بارھا توجہ دلائی اور اھل دھلی نے اس رقم سے علحدہ کالج بنانے کی بھی درخواست کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ نواب حامد علی خان بھی کالج کمیٹی کے

---

* کانفرنس گزٹ علی گڑہ - ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۰ ع ترجمہ مضمون مسٹر سہائی؟

ممبر بنائے گئے ۔ آخر جہاں یہ جانہار کالج گیا وہیں یہ عطیہ بھی گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کیا حشر ہوا —

کالج کی ترقی کا سال

اس سال کی رپوٹ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سال کالج کے بڑے عروج کا زمانہ تھا ۔ امتحان کی کامیابی پر عام طور سے بڑی تعریف و تحسین ہوئی ۔ سکریٹری صاحب اپنی رپوٹ میں لکھتے ہیں کہ جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے اس لئے کہ طلبہ کی استعداد ایسی عمدہ اور ان کے جوابات ایسے کامل تھے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل تھی ۔ بہت سے دیسی شرفا جو امتحان کے وقت موجود تھے ' اپنے شہر کے ہونہار بچوں کی لیاقت دیکھہ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے —

انگریزی جماعت کی علحدگی

غالباً اسی زمانے میں لوگوں کی مخالفت اور شور و غوغا کی وجہ سے انگریزی جماعت مشرقی مدرسہ سے علحدہ کردی گئی ۔ لیکن یہ علحدگی برائے نام تھی ' پرنسپل دونوں کے ایک ہی تھے اور نگراں کمیٹی بھی ایک ہی تھی —

اگر چہ ابتدا میں انگریزی جماعت کے قیام کی بہت کچھہ مخالفت ہوئی مگر تین ہی سال میں (یعنی سنہ ۱۹۳۱ ع میں) انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد تین سو * تک پہنچ گئی ۔ یہ زمانے کی ہوا تھی —

اس زمانے کی دلی

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز ملک کے اندرونی خرخشوں سے نچنت ہوگئے تھے ۔ بنگالہ مدت ہوئی ان کے قبضے

* ذکاءالدہ آف دہلی مصنفۂ سی ۔ ایف انڈریوز ۔ غالباً یہ تعداد پورے کالج کی تھی جس میں شعبۂ مشرقی اور انگریزی کے کل طلبہ شریک تھے جس کی تصدیق آیندہ اوراق سے ہوگی —

میں آچکا تھا ۔ جنوب میں مرہٹوں اور خاص کر ٹیپو سلطان کا کھٹکا تھا سو وہ کانٹا بھی نکل گیا تھا ۔ ملک میں امن و امان تھا اور یہ امن خاص کر دلی شہر میں جو ایک مدت سے ارضی و سماوی آفات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا ، اور بھی اجاگر نظر آتا تھا ۔ چیزیں سستی تھیں ، روپے کی کمی نہ تھی ، حرفت و صنعت فروغ پر تھی ، لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے ۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ، ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی ، خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی ۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آج کل اس کا یقین کرنا مشکل ہے ۔ ایک دوسرے کی غمی شادی اور تیوہاروں میں بے تکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے ۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے لیکن کیا ہندو کیا مسلمان سب ان سے محبت کرتے اور ان پر جان فدا کرتے تھے ۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا ۔ چنانچہ مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ قلعۂ معلی میں عجیب ماجرا تھا کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگر چہ قدرتاً ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے ۔ اگر چہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے وہ عام طور پر پایا جاتا تھا ، یہاں تک کہ ان پڑھ بھی اہل ذوق کی فیض صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے ۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلی کا جوہر تھا ۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی جس نے دلی نہیں دیکھی یا جو دلی میں

نہیں رہا وہ زباندان ہی نہیں ' گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں ادبستان زبان تھیں - شاعری کا گھر گھر چرچا تھا ' خود بادشاہ شاعر تھے ' شعر و سخن کے قدردان تھے - قلعہ معلی کی زبان فصاحت کی جان تھی —

یہ خوش حالی اور زندہ دلی جو بظاہر نظر آتی تھی ' اس کی بنیاد کھوکھلی ہو چکی تھی ' تساہل اور غفلت جو اعمال کا نتیجہ ہیں اپنا کام کرچکے تھے - یہ ساری چہل پہل عادتاً اور روایتاً ہوتی چلی آتی تھی اور کسی اصل کی نقل معلوم ہوتی تھی - ایسے وقت میں زمانے کا رنگ پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے اور پہچانتے کیونکر سب پر ایک ہی رنگ چھایا ہوا تھا اور وہ ایسا رچ پیچ گیا تھا کہ اس کا نکلنا آسان نہ تھا - دلی والوں میں دو بڑے عیب تھے اور شاید اب بھی ہیں ایک تو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور دوسرے کسی نئی چیز کے آسانی سے قائل نہیں ہوتے - ایسی عادت کا ہونا لازمی اور قدرتی تھا کیونکہ ان کا شہر وہ تھا جو صدہا سال سے تہذیب و شایستگی اور علوم و فنون کا مرکز تھا ' جہاں کی ہر بات دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید تھی ' وہ دوسروں کے کیونکر قائل ہوتے - یہ سب کچھ سہی ' لیکن اس زمانے کی ایک یادگار نہایت قابل قدر ہے - وہ اردو زبان کی ترقی ہے - اس زمانے میں اور اس کے بعد ایسے ایسے صاحب کمال گزرے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے نام خصوصیت کے ساتھہ ذکر کئے جائیں گے اور ان کا کلام ہمیشہ ذوق شوق کے ساتھہ پڑھا جاے گا - یہ زمانہ ابتدا ی ترقی کا تھا اور اس وقت سے ایسی بنیاد پڑی کہ یہ زبان آگے ہی بڑھتی گئی - یہ سب کچھہ فارسی کا طفیل تھا - کئی صدی سے فارسی کی تعلیم کا رواج عام طور پر چلا آرہا تھا یہ کسی ایک مقام سے مخصوص نہ تھا بلکہ بنگال ' بہار ' دوآبہ ' پنجاب ' گجرات ' دکن ' مدراس

سب جگہہ اس کا تسلط ہوگیا تھا - ہمارے اخلاق و آداب ' طور طریقے ' نشست برخاست ' طرز کلام وغیرہ پر فارسی کا اثر صاف نظر آتا تھا - اور یہ کچھہ مسلمانوں ہی پر موقوف نہ تھا' ہندو مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے - بات بات میں فارسی امثال اور جملے ' سعدی و حافظ ' رومی و جامی یا خسرو کے اشعار بے ساختہ زبان سے نکل جاتے تھے - گلستاں بوستان ' دیوان حافظ ' یوسف زلیخا ' سکندر نامہ اور شاہنامے کا پڑھنا قومی شعار ہوگیا تھا - مدرسوں ہی میں نہیں ' ہر گھر میں یہ کتابیں نظر آتی تھیں - اُس وقت کے کسی ہندو مصنف کی کتاب اُٹھا کر دیکھئے ' وہی طرز تحریر ہے اور وہی اسلوب بیان ہے - ابتدا میں بسم‌اللہ لکھتا ہے ' حمد و نعت و منقبت سے شروع کرتا ہے ' شرعی اصطلاحات تو کیا حدیث و نص قران تک بے تکلف لکھہ جاتا ہے - ان کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی نہیں - قومی یکانگت میں تہذیب و ذوق کی یکسانی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے —

جب فارسی اس طرح چھا گئی تھی تو بول چال کی عام زبان اس سے کس طرح بچ سکتی تھی - اردو نے اس کا دودھ پیا تھا ' اسی کے سہارے پروان چڑھی اور وہ رنگ روپ نکالا کہ سب میں مقبول ہوگئی رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ اسی کا چلن ہوگیا - یہ ایک قدرتی اصول تھا - جس طرح باپ کا جانشین بیٹا ہوتا ہے اسی طرح فارسی کی قائم مقام اردو ہوگئی - یہی وہ زمانہ تھا کہ دلی کالج کا فروغ شروع ہوا —

ذریعہ تعلیم

اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اس کی کامیابی

کا راز تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا - عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو ہی تھا لیکن سرکاری حلقے میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو رہی تھی جسے مشرقی تعلیم سے سخت سوء ظنی تھی اور جب مشرقی اور مغربی تعلیم کا قضیہ پیش ہوا تو بازی اُسی کے ہاتھ رہی —

۱۸۳۵ ع ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز سال ہے. اس تاریخ سے اس ملک کی تعلیم کی کایا پلٹ ہوتی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے - اب تک یہاں کی تعلیم کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں - ایک تو جتنے مدارس تھے، خواہ سرکاری، یا غیر سرکاری، اُن سب میں مشرقی السنہ و علوم (عربی، سنسکرت، فارسی) کی تعلیم ہوتی تھی، طریقۂ تعلیم بھی مشرقی تھا، ذریعۂ تعلیم بھی مشرقی زبانیں تھیں: غرض سارا رنگ ڈھنگ مشرقی تھا - وہ کمیٹی جو تعلیم عامہ کی نگراں کی گئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مشرقی السنہ کی تعلیم کی ترقی میں کوشش کرے - اگرچہ دہلی اور بنارس کے کالجوں میں انگریزی مدرسے بھی ملحق کردیے گئے تھے اور کلکتہ مدرسہ اور کلکتہ سنسکرت کالج میں بھی انگریزی جماعتوں کا اضافہ کردیا گیا تھا اور چند درسگاہوں میں جغرافیہ ہیئت، ہندسہ اور تشریح کی تعلیم بھی جاری کردی گئی تھی لیکن ان کی حالت محض ابتدائی تھی اور مشرقی تعلیم کے سامنے ان کا چراغ جلنے نہیں پایا تھا - دوسری بات یہ تھی کہ جتنے سرکاری اور امدادی مدارس تھے اُن میں تقریباً سب طلبہ کو وظیفے دیے جاتے تھے ایک تیسری بات اور تھی، یعنی سنسکرت اور عربی کی ترقی کی خاطر ان قدیم زبانوں میں تراجم کے لئے فیاضی سے امداد دی جاتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے

کے لحاظ سے یہ علمی سرپرستی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے - چنانچہ صرف ایک کتاب کے عربی ترجمے کے لئے بتیس ہزار روپے کی منظوری دی گئی - بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر ترجمہ ایسا ہوتا جو سمجھ میں نہ آتا تو اس کی تشریح کے لئے مترجم کو معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جاتا - بہت سا روپیہ ان کتابوں کے چھاپنے پر صرف ہوتا تھا، لیکن چھپنے کے بعد ایک دوسری مشکل کا سامنا ہوتا تھا کہ یہ ڈھیر کے ڈھیر رکھے کہاں جائیں - اس ذخیرے کے لئے مکان کا انتظام کرنا پڑتا تھا - چونکہ ان کتابوں کی عام طور پر تو مانگ ہوتی نہ تھی اس لئے ان کا سارا بار الماریوں پر تھا - یہ لکھتے ہوے مجھے حیدرآباد دکن کی مجلس دائرۃ المعارف یاد آتی ہے اور اگر جلد خبر نہ لی گئی تو ڈر ہے کہ دارالترجمہ کا بھی کہیں یہی حشر نہ ہو —

ان لوگوں کی نظروں میں جو مشرقی تعلیم کو بیکار محض خیال کرتے تھے، یہ تینوں باتیں سخت قابل اعتراض تھیں، حالانکہ اگر دیکھا جاے تو ان میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر واویلا مچایا جاے - اول تو گورنمنٹ کا تعلیم پر صرف ہی کیا ہوتا تھا، اور اگر اس کے انتظام کا دوسرے شعبوں سے مقابلہ کیا جاے تو اس رقم کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی جو تعلیم پر صرف کی جاتی تھی - رہے ترغیبی وظائف، تو اس وقت کی حالت کے لحاظ سے اس کا دینا ضروری اور قرین مصلحت تھا - جب تعلیم کا شوق پیدا ہو جاتا تو رفتہ رفتہ کم کردئے جاتے اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا - اب رہا کتابوں کا ترجمہ اور طبع کے مصارف، سو اس کے متعلق شکایت کرنا کسی قدر تنگ نظری ہے - اسے تجارتی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے - بیشک اس وقت ان کی مانگ نہ

تھی' لیکن هر چیز کے لئے یه ضروری نهیں هے که مانگ هو تو بهم پهنچائی جاے۔ بعض اوقات مانگ پیدا کرنی پڑتی هے۔ ان کتابوں کا وجود میں آجانا هی غنیمت تها' خواه کوئی لے یا نه لے' کیوں که انهیں پر آینده علم کی ترقی و اشاعت کا دار و مدار تها۔ اُس وقت کا یهی اقتضا تها اور انهیں کے طفیل میں ایک وقت ایسا آتا که اس قسم کی کتابیں هاتهوں هاتهه بکتیں۔ مانگ یا قدر کے لئے یه کیا ضرور هے که فوراً هی هو۔ آج وهی کتابیں هیں که اُن کے دیکهنے کو آنکهیں ترستی هیں' ڈهونڈهتے هیں اور نهیں ملتیں۔ کبهی کبهی تجارتی نظر سے هٹ کر بهی دیکهنا پڑتا هے —

اس میں شک نهیں که نقص تهے' انهیں رفع کرنا چاهئے تها۔ خرابیاں تهیں' ان کی اصلاح هونی چاهئے تهی۔ لیکن یه کیا که سرے سے عمارت هی کو جڑ بنیاد سے اکهاڑ کر پهینک دیا جاے —

بهر حال لارڈ بینٹنگ کے رزولیوشن مورخه ۷ مارچ سنه ۱۸۳۵ ع نے ان سب کا خاتمه کر دیا۔ وه رزولیوشن جسے اب تاریخی حیثیت حاصل هوگئی هے' یه هے —

"گورنر جنرل باجلاس کونسل کی یه راے هے که حکومت برطانیه کا بڑا مقصد اهل هند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا هے اور جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لئے مخصوص هیں وه صرف انگریزی تعلیم پر صرف هونی چاهئیں —

هز لارڈ شپ کا یه منشا نهیں هے که دیسی تعلیم کے کسی ایسے کالج یا مدرسے کو توڑ دیا جاے جس کے

فوائد سے دیسی لوگوں میں تمتع حاصل کرنے کا شوق پایا جاتا ہو —

گورنر جنرل باجلاس کونسل طلبہ کو زمانۂ تعلیم میں وظائف دینے کا عمل قطعاً قابل اعتراض خیال کرتے ہیں - اُن کی رائے میں یہ اُن علوم کی تشویق کی مصنوعی ترغیب ہے اور جب زیادہ مفید علوم کی تعلیم دی جائے گی تو یہ خود بخود ان پر سبقت لے جائیں گے اس لئے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ آیندہ کسی طالب علم کو کسی قسم کا کوئی وظیفہ نہ دیا جائے - اور جب کبھی مشرقی تعلیم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو اس کی رپوٹ گورمنٹ کو کی جائے اور ساتھہ ہی یہ بتایا جائے کہ جو جماعت اس کے زیر تعلیم تھی اس میں طلبہ کی کیا تعداد ہے اور اُس جماعت کی کیا حالت ہے تا کہ گورمنٹ اس کے جانشین کے تقرر پر غور کر سکے —

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل کو یہ اطلاع ملی ہے کہ کمپنی نے رقم خطیر مشرقی کتب کے طبع میں صرف کی ہے - ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت کرتے ہیں کہ آیندہ ان رقوم کا کوئی جز اس کام میں نہ لایا جائے —

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ تمام رقوم جو ان اصلاحات کے رو سے کمپنی کے قبضے

میں آئیں وہ آئندہ دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے
ذریعہ سے انگریزی علم ادب اور سائنس کی اشاعت میں
صرف کی جائیں" —

اس حکم کے جاری ہونے پر بڑا ہنگامہ مچا۔ صرف وہی لوگ اس کے مخالف نہ تھے جن کی روزی پر اس سے آنچ آتی تھی بلکہ اُن بڑے بڑے صاحب اثر یورپین عہدہ داروں نے بھی جو مشرقی علوم و السنہ کے حامی تھے اس کی اسی زور سے مخالفت کی ۔ مشرقی علوم و السنہ کا سب سے بڑا حامی اور اس معاملے میں میکالے کا بہت بڑا حریف مسٹر ہنری ٹامس پرنسپ تھا جو گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر تھا اور بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر ہوگیا۔ اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کونسل میں پرنسپ اور میکالے میں بہت تیز اور سخت بحث ہوئی —

لیکن احکام جاری ہوچکے تھے اور ناطق تھے ۔ تعلیمی کمیٹی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تعمیل کرے۔ کمیٹی کے صدر مسٹر شیکسپیر نے بنا راضی احکام استعفا دیدیا اور ان کی جگہ مسٹر میکالے (مشہور لارڈ میکالے) کا تقرر ہوا ۔ یہ شخص یک بکا اور اپنی رائے کا بڑا پکا تھا لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن پر اسی کے خیالات کا اثر پڑا ' مشرق و مغرب کے مسئلے میں وہ اپنی خوش بیانی اور طلاقت کے زور سے بازی لے گیا ۔ اس نئے صدر کے تحت میں ' جو در حقیقت خود ہی اس تجویز کا بانی تھا ' کمیٹی نے احکام بالا کی تعمیل بڑے شد و مد سے کی —

اگرچہ لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن میں آنسو پونچھنے کے لئے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اس سے ایسے دیسی علوم کے مدارس کا بند کرنا مقصود نہیں ہے جن کے فوائد سے دیسی لوگوں کو متمتع ہونے کی توقع ہے لیکن کمیٹی نے

اس ریزولیوشن کی تعمیل ایسے عجیب طریقے سے کی کہ مشرقی تعلیم کا خاتمہ ہی ہوگیا —

ان احکام کی تعمیل میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ سرکاری مدارس میں دیسی زبانوں کی تعلیم کس حد تک ہو۔ بعض کہتے تھے کہ گورمنٹ کے ریزولیوشن کے رو سے دیسی زبانیں بالکل خارج ہوگئی ہیں اور تمام رقم صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئے - جنرل کمیٹی نے فوراً اس غلطی کی اصلاح کی اور ایک بیان شایع کیا جس میں اس نے اظہار افسوس کیا کہ ریزولیوشن کے یہ معنے لئے گئے ہیں اور یہ بیان کیا کہ ان احکام کے جاری ہونے سے پہلے اس مسئلے کے متعلق جو بحث ہوئی تھی اس میں ہر فریق نے دیسی زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کیا تھا - اصل تنازع انگریزی زبان اور مشرقی علمی زبانوں کے درمیان تھا ' دیسی زبانوں سے اسے کچھ تعلق نہ تھا —

مگر اس بیان سے بھی تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا - جنرل کمیٹی کا منشا یہ تھا کہ دیسی لڑکوں لڑکیوں کو بالکل ابتدائی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے دی جاسکتی ہے —

اصل بحث مشرقی اور مغربی علوم السنہ کی تھی' اس میں غریب دیسی زبان مفت میں پٹ گئی - آپس کے مباحثے اور نزاع کی گرما گرمی میں صحیح رستہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا - صحیح فیصلہ دونوں کے بین بین تھا - مغربی علوم اور انگریزی زبان کے فوائد سے کسے انکار ہوسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی قدیم زبانوں کو کیوں کر چھوڑ سکتے تھے جن پر ہماری تہذیب کی بنیاد ہے - دوسرا مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا تھا - مقصد تو حصول علم سے تھا اور اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں کہ علم کی تحصیل جس آسانی اور خوبی سے اپنی زبان کے واسطہ سے ہوسکتی ہے

غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔ اس کی طرف کسی کا خیال نہ گیا۔
اس کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں
تو کتابیں کہاں سے لائیں۔ بیشک یہ بڑا نقص تھا مگر لا علاج نہ تھا۔
لارڈ بنٹنک کے ریزولیوش نے اس کی گنجائش نہ چھوڑی اور ذریعۂ تعلیم
بھی انگریزی ہی قرار پایا —

لارڈ بنٹنک کے ریزولیوشن سے اور خاص کر جس نامناسب اور ناگوار
طریقے سے تعلیمی کمیٹی نے اس کی تعمیل کی تھی اس سے جو بے اطمینانی
اور بدگمانی پیدا ہوگئی تھی وہ رفع نہ ہوئی۔ اس بے اطمینانی کے
اسباب یہ تھے —

۱ - سب سے پہلی بات یہ تھی کہ مشرقی مدارس کو کم زور کر دیا گیا۔
اُن کی رقمیں اُن سے چھین کر یا تو ایسی انگریزی جماعتوں کی
اعانت میں صرف کی گئیں جو اُن کی نظر کے سامنے ایک ہی چھت
کے نیچے تعلیم پاتی تھیں یا اضلاع (مفصلات) کے ایسے مدارس کی
مدد کے لئے مخصوص کردیں جہاں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔
یہ عمل خلاف انصاف اور خلاف احکام گورنمنٹ خیال کیا گیا —

۲ - جہاں کہیں دیسی زبان کی تعلیم کے لئے جداگانہ جماعتیں تھیں،
انھیں توڑ دیا گیا اور ذریعۂ تعلیم کے لئے عام طور پر انگریزی کو
دیسی زبان پر ترجیح دی گئی اور دیسی زبان کی تعلیم برائے
نام انگریزی تعلیم کے ساتھ لگا دی گئی —

۳ - وظائف مسدود کر دیے گئے جس سے دہلی اور دوسرے مقامات میں
بہت ناراضی پھیلی کیوں کہ لوگ تعلیم کو کار خیر سمجھتے تھے۔
دوسری بات یہ تھی کہ اکثر طالب علم نادار تھے اور وہ اپنی تعلیم

زیادہ دنوں تک جاری نہیں رکھہ سکتے تھے —

اس عام بے اطمینانی کی بنا پر لارڈ آکلنڈ نے جو لارڈ بنٹنگ کے بعد ھندوستان کے گورنر جنرل ھوکر آے' ان تمام امور پر غور کیا اور ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۳۹ ع کو جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کے نام ایک یاد داشت لکھی - یہ یاد داشت بہت اہم ھے - اس نے ان غلط فہمیوں کو رفع کیا جو لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن سے پیدا ھوگئی تھیں —

لارڈ آکلنڈ نے صاف الفاظ میں یہ فیصلہ کیا کہ مشرقی مدارس میں مشرقی تعلیم کی تکمیل و ترقی کو قطعی طور سے ترجیح دی جاے اور کامل ترقی و تکمیل کے بعد (اس سے قبل ھرگز نہیں) جو رقم بچے وہ انگریزی تعلیم کی ترقی میں صرف کی جاے - مشرقی مدارس کی بہتری اور اصلاح کے لئے یہ مناسب ھوگا کہ اعلی قابلیت کے دیسی مدرسین مقرر کئے جائیں اور یہ اُسی صورت میں ھوسکتا ھے کہ ان کو معقول تنخواھیں دی جائیں - طلبہ کے وظائف کا دستور پھر جاری کیا جاے - مشرقی زبانوں کی مفید کتابیں شایع کی جائیں - تجربہ کار اور واقف کار یورپین وزیٹر کا تقرر کیا جاے تاکہ وہ اُن پر نگرانی رکھے اور وقتاً فوقتاً ان کا معائنہ کرتا رھے —

یہ تجویزیں بہت معقول تھیں اور کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی اپنی راے میں انھیں خیالات کا اظہار کیا - انھوں نے لکھا کہ ھمارا منشا بھی یہی ھے کہ جو رقم جس مشرقی مدرسے کے لئے مخصوص کردی گئی ھے وہ بالکلیہ اُسی مدرسے کی تعلیم پر صرف کی جاے اور مدرسے میں مشرقی تعلیم کی ترقی و تکمیل سب سے مقدم رکھی جاے —

اس بنا پر لارڈ آکلنڈ نے یہ حکم دیا کہ لارڈ بنٹنگ کے ریزولیوشن

سے قبل جو جو رقمیں جن جن مشرقی مدارس کے لئے مخصوص تهیں وہ سب اُن کو واپس کردی جائیں اور اگر انگریزی تعلیم کی ترقی کے لئے مزید رقم کی ضرورت هوئی تو اس کے لئے جدید منظوری دی جاے گی —

انگریزی اور دیسی زبان مدارس کا ذریعۂ تعلیم

لارڈ آکلنڈ نے ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر بهی کامل غور کیا اور گزشتہ اور موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی اور دیسی زبان کی مشترکہ تعلیم کا جو اصول اس وقت رائج هے' وهی مناسب هے اور فی الحال اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں - البتہ جب دیسی زبانوں میں اچهی کتابوں کا سلسلہ تیار هوجاے تو پهر اس میں کسی قدر تغیر و تبدل کی ضرورت واقع هوگی - اُس وقت مسئلہ یہ هوگا کہ آیا صوبے کے مدارس میں تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے دی جاے یا دیسی زبان کے ذریعہ سے - اُن کے خیال میں جب ایسی کتابوں کا سلسلہ تیار هوجاے تو یہ جو قاعدہ هے کہ ان مدارس میں دیسی زبانوں کی جماعتیں جاری نہ رکهی جائیں اُسے نرم کرنا پڑے گا - اُس وقت انگریزی یا دیسی زبان لازمی طور پر پڑهنے کی شرط لگانی ضروری نہ هوگی بلکہ طالب علم کو پوری آزادی هوگی کہ خواہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرے یا دیسی تعلیم —

بهر حال لارڈ آکلنڈ کی راے میں مزید تجربے کی ضرورت تهی - اُس وقت دو بڑے تجربے زیر امتحان تهے - ایک بنگال میں جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم تهی اور دوسرا احاطۂ بمبئی میں جہاں دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی تهی - ان دونوں طریقوں کو ابهی اور آزادی سے چلنے دینا چاهئے اور اُن کے نتائج پر نظر رکهنی چاهئے —

غرض گورنر جنرل بہادر کا منشا یہ تها کہ تعلیم کی اشاعت اعلیٰ

اور اوسط دونوں طبقوں میں ہونی چاہئیے - موجودہ طریقے سے تعلیم صرف ایک چھوٹے سے طبقے میں محدود رہے گی، لہذا ملک کے باقی حصے کو دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے پر قناعت کرنی چاہئیے اگرچہ وہ انگریزی کے مقابلے میں کم درجے کی ہوگی —

اسی زمانے میں تعلیمی کمیٹی نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ جس اصول پر وہ عامل ہے وہ اس کی رائے میں بالکل صحیح ثابت ہوا ہے اور کمیٹی اس امر کی کوشش کرتی رہے گی کہ بڑے بڑے شہروں میں اینگلو ورنیکلر مدارس کو ترقی دے اور جہاں تک حالات مساعدت کریں تعلیم کو ملک کے با اثر طبقے میں شایع کرے - کمیٹی کو توقع ہے کہ جب وہ طالب علم جو ان مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں مغربی علوم سے کامل واقفیت حاصل کر لیں گے تو سارے ملک میں ترقی کی ایک لہر دوڑ جائے گی اور بالآخر ملک کا ہر طبقہ اس کے فوائد سے مستفید ہوگا —

دیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کے متعلق جو دلخوش کن توقع لارڈ آکلنڈ نے اپنے فیصلے میں دلائی تھی وہ کاغذ ہی پر رہ گئی - اس میں سلسلۂ کتب تیار ہونے کی شرط تھی اور یہ شرط بڑی کڑی تھی - کتابیں کیسے تیار ہوتیں جب کہ اُن کے تیار کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ اور سچی کوشش نہیں کی گئی - آنے والے ماہرین تعلیم نے اسے بالکل نظر انداز کردیا اور سہل رستہ اختیار کرلیا کہ مغربی علوم کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے سے ہو جائے، اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سنسکرت، عربی، فارسی کی تعلیم بھی انگریزی کے ذریعے ہونے لگی - دیسی زبانوں کی بدقسمتی کا کچھ ٹھکانا ہے-سنہ ۱۸۳۵ ع سے قبل تقریباً تمام مدارس میں عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم ہوتی تھی اور گورنمنٹ بھی اس کی پوری تائید پر تھی اور ساری

توجہ اور معلمت اسی پر صرف کی جاتی تھی اور دیسی زبانوں کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ جب لارڈ بنٹنگ کا ریزولیوشن عمل میں آیا تو انگریزی نے وہ زور پکڑا کہ اس نے عربی، سنسکرت ھی کو نہیں بٹھا دیا بلکہ دیسی زبانیں بھی کس مپرسی کی حالت میں آگئیں۔ ایک دھلی کالج ایسا تھا جہاں مغربی علوم یعنے ھیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی اور باوجود اُن تمام موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ھر موقع پر پیش کرتے تھے وہ نہایت کامیاب رھا —

اس کی تصدیق مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج کے اُس بیان سے ھوتی ھے جو ان کی سالانہ رپوٹ بابت سنہ ۱۸۵۲ ع میں درج ھے۔ وہ لکھتے ھیں کہ :

" مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ھوا ھے " —

اس کے بعد ھی وہ اس پر اظہار افسوس کرتے ھیں کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں ورنہ اس کا علم اور بھی بہتر ھوتا۔ پھر وہ لکھتے ھیں کہ :

" حال ھی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور اُن سے علم ھیئت، جنرل سائنس، اخلاقی اور مذھبی مسائل میں گفتگو کی۔ اِن سب کا یہ بیان ھے کہ اس شعبے میں قطعی

طور پر بہت بڑی ترقی پائی جا تی ھے اور مختصر
یہ کہ تمام ھندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے
آثار نہیں نظر آتے " —

اس رپوٹ پر لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے تبصرے میں مشرقی شعبے کے متعلق جو یہ الفاظ تحریر کئے ھیں :

" طلبہ (شعبۂ مشرقي) کی سائنس کی ترقی
کے متعلق جو تیقن دلایا گیا ھے اُس سے بےحد مسرت ھوئی"—

سنہ ۱۸۵۶ ع کی رپوٹ میں درج ھے کہ عربی فارسی کی جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں نہایت احتیاط سے مغربی سائنس زبان اردو کے ذریعہ کامل طور پر پڑھائی جاتی تھی - ماسٹر رام چندر اور دیگر اساتذہ کی قابلانہ درس تدریس سے طلبہ ایسے ھوشیار ھوگئے تھے کہ وہ ریاضی ' نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کے طلبہ کو نیچا دکھانے لگے تھے اور مقابلے کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے —

رام سرن داس صاحب ڈپٹی کلکٹر اور ممبر لوکل کمیٹی دلی کالج نے اس سال طلبہ کا امتحان لیا اور انھوں نے اس بارے میں جو کیفیت درج کي ھے وہ طلبہ کی محنت و ذکاوت پر دلالت کرتی ھے - طلبہ نے نہایت اطمینان بخش جوابات دیے اور ممتحنین اس سے بہت خوش ھوے - طلبہ بالعموم تمام مضامین میں نہایت اچھے نکلے - صرف ایک چیز کی یعنے بد خطی کی شکایت کی ھے اور یہ شکایت غالباً ھمارے کالجوں اور مدرسوں میں اب بھی پائی جاتی ھے —

مسٹر فریڈرک جان موات Mouat ایم - ڈی ' ال ال - بی فسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ و سکرٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے اپنی رپوٹ

میں دھلی کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی استعداد اور قابلیت اور خاص کر ان کی سائنس کی واقفیت پر بہت قابل تحسین الفاظ میں تعریف کی تھی - گورنمنٹ ممالک متحدہ مغربی شمالی نے جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپوٹ بابت سنہ ۱۸۵۳ - ۵۴ پر جو ریزو لیوشن لکھا ھے اس میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ھے —

" اردو کے ذریعے سے دھلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ھے اس کی مسٹر موات نے بہت تعریف کی ھے - ھزآنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ھے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی ' بہت قدر کرتے ھیں " —

یہ ساری برکت اس کی تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور تمام مضامین اسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے جس کی تائید میں ھم اُس وقت کے دو ذمہ دار ماھران تعلیم کی رائیں پیش کرتے ھیں - مسٹر کر ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال اپنے تبصرہ تعلیمی بابت سنہ ۱۸۵۳ ع میں لکھتے ھیں کہ :—

" ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرھی ھے جو اُسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ھے اور وہ یہ ھے کہ وھاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ھے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفۂ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ھے - اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بترو نے اپنے زمانہ پرنسپلی میں

استقلال کے ساتھہ عملدرآمد کیا اور اُن کے جانشین
ڈاکٹر سپرنگر نے اُسی جوش کے ساتھہ اُسے جاری رکھا '
یہ اب دهلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم
کر لیا گیا ھے - مناسب یہ ھے کہ اسے آزادی کے ساتھہ
بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے - چند سال بعد ھمیں
اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے
کا موقع ملے گا "

افسوس یہ موقع کبھی نہ آیا !!

ناظم صاحب تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے اپنی رپوٹ سنه ۱۸۵۹ ع
میں شعبۂ مشرقی کے قائم رکھنے پر اسی لئے زور دیا ھے کہ اس کی وجہ
سے اردو کے ذریعے علوم کی اشاعت ھوتی اور روشن خیالی پھیلتی ھے —

تعلیمی حالت

مشرقی شعبہ کالج کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تر فارسي اور عربی کی
تعلیم ھوتی تھی - اس کے ساتھہ سنکرت کا شعبہ بھی تھا -
حساب اور مبادیات اقلیدس کی بھی کچھہ کچھہ تعلیم دی جاتی تھی - کالج کی
رپوٹوں میں بار بار اس کا ذکر ھے کہ تقسیم انعام کے موقعوں پر فارسی
خوشخطي کے نمونے اور فارسي کے مضامین بطور نمائش کے رکھے جاتے تھے —

سنه ۱۸۲۹ ع کا حال میں لکھہ چکا ھوں کہ اس سال کے امتحان کے
عمدہ نتائج پر بڑی تعریف ھوئی اور جس قدر انعام طلبہ کے لیے رکھے گئے
تھے اس سے زیادہ دینے پڑے کیونکہ طلبہ کی تعداد ایسی اچھی اور ان کے

جوابات ایسے بر جستہ اور معقول تھے کہ وہ طلبہ کو انعام محروم نہ کر سکے —

سنہ ۱۸۳۱ ع میں جب لارڈ بنٹنک نے کالج کا معائنہ فرمایا تو لارڈصاحب کی فرمائش پر مسٹر میکناٹن نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی اعلی جماعتوں کا امتحان لیا - نتیجہ کچھہ زیادہ قابل اطمینان نہ پایا گیا - ممتحن کی رائے میں طلبہ کا علم شرح محمدی (فقہ) میں زیادہ وسیع نہ تھا اور طلبہ کی زیادہ تر تعداد فارسی میں گلستان بوستان سے آگے نہ بڑھی تھی حالانکہ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ کالج میں داخل ہونے سے پہلے پڑھ کر آنی چاہئیں —

یہ رپوٹ جنرل کمیٹی کو بھیجی گئی تو اُس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور لکھا کہ کالج کی حالت کئی سال سے روبہ تنزل ہے - لوکل کمیٹی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ طلبہ عموماً کچھہ شد بد ہونے کے بعد تلاش معاش کی خاطر کالج کو خیر باد کہہ دیتے ہیں - بعض مشرقی شعبے کو چھوڑ کر انگریزی شعبے میں چلے جاتے ہیں - کمیٹی نے آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ کسی ایسی ترغیب کا ہونا ضروری ہے کہ جس کی وجہ سے طلبہ زیادہ مدت تک کالج میں رہ سکیں —

کالج کے سکرٹری نے اپنی سالانہ رپوٹ بابت سنہ ۱۸۳۳ ع میں لکھا کہ عربی کی اعلی جماعت میں صرف تین طالب علم ہیں - بہت لوگوں کا خیال ہے کہ عربی کی تعلیم نہ تو ویسی عام رہی ہے اور نہ ویسی پختہ جیسی پہلے تھی - اب یہ ذریعہ معاش بھی نہیں رہی اور خالی خولی نام یا شہرت کا موجب رہ گئی ہے - یہ امر قابل افسوس ہے کہ طلبہ فارسی کا نصاب ختم کرکے کالج چھوڑ دیتے ہیں اور جو عربی پڑھتے ہیں اُن

کا یہ حال ہے کہ کافیہ اور دوسری آسان کتابوں سے آگے نہیں بڑھتے اور سو میں بہ مشکل چار پانچ ایسے نکلتے ہیں جو اعلیٰ شعبوں تک پہنچتے ہیں * —

سنہ ۱۸۳۵ ع کی تعلیم عامہ کی رپوٹ میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ فارسی اور عربی کا اب وہ شوق نہیں رہا جو انگریزی کا ہے۔ لوکل کمیٹی کو یہ شکایت ہے کہ فارسی عربی کی اعلیٰ قابلیت جو بڑی محنت، وقت اور روپیہ صرف کرنے سے حاصل ہوتی ہے ، حصول معاش میں کچھہ کام نہیں آتی۔ جنرل کمیٹی نے اس شکایت پر تعجب ظاہر کیا کہ اس وقت جب کہ فارسی دفتری زبان ہے اُس کا یہ حال ہے تو آئندہ جب کہ دیسی زبان کا سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں رواج ہو جاے گا اور سب غیر زبانیں مساوی حالت میں ہوجائیں گی تو وہ نظام تعلیم جو اس وقت مشرقی شعبے میں جاری ہے اور بھی بے سود ہوجاے گا —

سنہ ۱۸۳۷ ع میں جو امتحان ہوا۔ اس میں ممتحنین نے تعلیمی حالت کی تعریف کی ہے —

سنہ ۱۸۳۸ ع کے آخر میں سالانہ امتحان ہوا امتحان کے وقت شہر کے بہت سے شرفا مدرسے میں جمع تھے۔ وہ طلبہ کی لیاقت اور جوابات سے بہت خوش ہوے۔ جماعت اعلیٰ کے عربی ترجمے اور فارسی انشاپردازی کے نمونے گورمنٹ میں بھیجے گئے اور گورمنٹ نے انھیں پسند فرمایا۔ سنسکرت کی جماعت کی حالت بھی قابل اطمینان بتائی گئی —

---

* تبصرۂ تعلیم عامہ احاطۂ بنگال بابت سنہ ۱۸۵۳ ع مسٹر جے۔ کر ڈائرکٹر پبلک انسٹر کشن —

سنہ ۴۰ - ۱۸۳۹ ع کی رپوٹ سے معلوم هوتا هے کہ اس سال بهی تعلیمی حالت قابل اطمینان تهی اگرچہ نصاب گذشتہ سالوں سے بڑها هوا تها - عربی کی اعلیٰ جماعت شمس بازغہ ختم کرچکی تهی اور میر زاهد معہ حاشیہ عبدالعلی اور مقامات حریری کا درس لے رهی تهی - اردو کی جماعتوں نے خاص کر بہت قابل تعریف ترقی کی تهی —

مسٹر ٹامسن مشرقی کالجوں کے وزیٹر (انسپکٹر) نے اپنی رپوٹ بابت سنہ ۴۲ - ۱۸۴۱ میں دهلی کالج کے طلبہ کی استعداد کے متعلق اچهی راے نہیں دی - اُن کا مقصد یہ تها کہ تعلیم اس سے اعلیٰ هونی چاهئے وہ لکهتے هیں کہ اکثر طلبہ عربی صرف و نحو یا عربی کی آسان کتابیں پڑهتے تهے - شعبۂ سنسکرت کی جماعت اعلیٰ میں پانچ طالب علم آسانی سے سنسکرت عبارت کی لکهہ سکتے تهے اور نظم بهی خاصی لکهہ لیتے تهے - اُن کی راے میں سنسکرت کی تعلیم اچهی تهی اور طلبہ اس زبان میں پوری مهارت رکهتے تهے —

اس کے چند سال بعد لوکل کمیٹی نے فارسی اور عربی شعبوں میں کامل اصلاح کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ باقاعدہ نصاب تعلیم میں صرف کارآمد علوم کي تعلیم رکهی جاے اور عربی نحو اور منطق کی اعلیٰ کتابوں اور فقہ کی مستند کتب اور احادیث پر " فری لکچر " هوا کریں اس تجویز کے جواب میں لفٹنٹ گورنر بهادر نے جواب دیا کہ کمیٹی نصاب تعلیم میں اس قسم کا تغیر و تبدل کر سکتی هے جو مناسب غور کے بعد مفید معلوم هو —

سنہ ۱۸۴۵ ع میں ڈاکٹر سپرنگر پرنسپل کالج نے جن کا تقرر اسی سال هوا تها ممالک مغربی شمالی کی گورنمنٹ کی خدمت میں یہ تجویز

پیش کی کہ مدرسے کی بعض ابتدائی جماعتیں توڑدی جائیں اور اُن کی بجائے ابتدائی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا جائے جس میں لڑکے مدرسے کی تعلیم کے لیے تیار کئے جائیں - لفٹنٹ گورنر بہادر نے اگرچہ اس تجویز کو پسند کیا اور اسے بھی تسلیم کیا کہ جب تک لڑکے خاص درجے کی لیاقت نہ رکھتے ہوں مدرسے میں داخل نہ کئے جائیں لیکن مدرسہ سے متعلق مجوزہ اسکول قائم کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کی سود مندی مشتبہ ہے - اس رائے کی تائید میں بعض وجوہ یہ بیان کی گئیں :—

" جہاں تک ہماری درسگاہیں دیسیوں کو اُن مضامین کی تعلیم دیتی ہیں جن کی تعلیم وہ دوسری جگہہ نہیں حاصل کرسکتے یا اگر وہ اُن مضامین کو دوسری جگہہ حاصل کرسکتے ہیں مگر ہم عمدہ طریقہ پر دیتے ہیں تو وہاں تک ان درسگاہوں کا فائدہ بہت بڑا ہے - لیکن جب ہماری درسگاہیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کرتی ہیں جسے لوگ دوسری جگہہ بخوبی حاصل کرسکتے ہیں یا خود اس کا انتظام کرنے کے لیے آمادہ ہیں تو ہماری درسگاہوں کا فائدہ بہت کچھہ کم ہوجاتا ہے بلکہ شاید مضر ہے - اس لئے کہ ہم یہ تعلیم مفت دیتے ہیں جس کے لیے لوگ اجرت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس طرح ہم لوگوں کی ذاتی مساعی کے مانع ہوتے ہیں —

دیسی زبانوں کی ابتدائی تعلیم کالج کے باہر آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے اور روز بروز ان کی تعلیم سہل ہوتی جاتی ہے -

پڑھنا لکھنا اور تقسیم تک حساب دیسی لوگ خود اپنے
طریقے پر سکھا سکتے ھیں اور انگلستان نے یه طریقه
اُنھیں سے سیکھا ھے اور اسے ان کے قومی طریقه سے نام زد
کیا ھے ' ان چیزوں کو ھمارے کالج میں پڑھانا گویا وقت اور
روپے کا ضائع کرنا ھے - مناسب یه ھوگا که فی الحال
بہترین دیسی لڑکے داخل کرلیے جایا کریں اور انھیں علم
کی اُن شاخوں میں اعلیٰ تعلیم دی جاے جن میں
هم اُن کی ترقی چاھتے ھیں —

داخلے کے لیے سه ماهی امتحانات لیے جائیں اور حسب
گنجائش بہترین امیدوار انتخاب کرلیے جائیں - اگر درسگاہ
مقبول نہیں تو تعداد کم ھوجاے گی ورنه زیادہ ھوجاے گی
اور غالباً اس قدر زیادہ که تعلیمی فیس لگانی پڑے اور
اس سے بہتر کیا ھوگا —

یه توقع کی جاتی ھے که اگر کالجوں کی حالت
اچھی رھے اور جو تعلیم وھاں دی جاتی ھے اس کی
قدر کی گئی تو داخلے کا معیار بڑھا دیا جاے اور رفته
رفته وہ ابتدائی تعلیم موقوف کردی جاے جو اب
ادنیٰ جماعتوں کو دی جاتی ھے — "

ان خیالات کی بنا پر ادنیٰ وظائف کے مستحق باھر والے بھی قرار
دئیے گئے - جس کا ذکر اس کے موقع پر کیا جاے گا —

مسٹر بٹرو جو اس وقت پرنسپل تھے اور نہایت قابل اور ھمدرد شخص
تھے اس سال (سنه ۱۸۴۵ ع) بوجه علالت دو سال کی رخصت لیکر انگلستان

چلے گئے۔ انھوں نے اپنی آخری رپورٹ میں مشرقی شعبے کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ھیں اُن کا خلاصہ ھم یہاں پیش کرتے ھیں ' اس سے معلوم ھوگا کہ اس طریقۂ تعلیم نے کیا کیا کام کیا تھا —

مسٹر بترو نے اپنی ان مساعی پر جو انھوں نے کالج میں تاریخ ' اخلاق اور سائنس کی تعلیم کے متعلق کی تھیں ' اپنا پورا اطمینان ظاھر کیا اور اس امر کی توقع ظاھر کی کہ اگر ایک سال اور اسی طرح کوشش جاری رھی تو مشرقی شعبے کے طالب علم سوائے تاریخ کے کسی علم میں انگریزی شعبے والوں سے کم نہیں رھیں گے۔ تاریخ کی کمی پوری کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے کی ضرورت ھے ' اس وقت تک جو ترجمے ھوے ھیں وہ کافی نہیں ھیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ جو تعلیم مشرقی کالج کے نوجوانوں کو دی گئی ھے اس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ھے کہ اُن میں سے متعدد طالب علم اپنی فرصت کے اوقات میں انگریزی زبان کی تحصیل میں بڑی مستعدی سے کوشش کررھے ھیں تاکہ وہ تلاش حق میں زیادہ آزادی سے کام کرسکیں۔ یہ بھی معلوم ھوا ھے کہ ان میں سے بعض نوجوان آئندہ سال سینیر انگلش وظائف کے لئے مقابلے کی کوشش کریں گے۔ مسٹر بترو نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ مشرقی کالج کے نصاب تعلیم میں علاوہ ان علوم کے جو عام طور پر دیسی مدارس میں پڑھائے جاتے ھیں بعض دوسرے علوم کے داخل کرنے کا یہ نتیجہ ھوا کہ ان علوم نے اس تعصب اور تنگ خیالی میں جو محض عربی فارسی کے طلبہ میں پائی جاتی ھے تخفیف اور اعتدال پیدا کردیا ھے —

ایک دوسرا امید افزا واقعہ مسٹر بترو نے یہ بیان کیا ھے کہ دیسی شرفا و امرا میں جو بدگمانی انگریزی طریقۂ تعلیم کی طرف سے تھی اس میں بہت کچھ کمی نظر آتی ھے۔ اس کے ثبوت میں دو امیر خاندانوں کے

لڑکوں کا ذکر کیا ہے جو کالج میں داخل ہوئے - ایک تو نواب جھجھر کا بیٹا اور دوسرا سوہن لال وزیر اعظم بادشاہ دہلی کا بیٹا - اور امید ظاہر کی ہے کہ اس طبقے کے اور طالب علم بھی کالج میں داخل ہوں گے —

انگریزی شعبہ

انگریزی جماعت کا اضافہ سنه ۱۸۲۸ ع میں کیا گیا تھا - اول اول ان تمام طلبہ کو داخل ہونے کی اجازت دی گئی جو مشرقی السنہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ وہ وظیفے بھی پاتے رہیں اور اپنے نام بھی مشرقی شعبے میں بدستور رہنے دیں - لیکن اس انتظام میں دقت معلوم ہوئی کیوں کہ نصف سے زیادہ طلبہ نے انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی - لہذا انگریزی شعبے کو علحدہ قائم کرنے کی راے قرار پائی - پندرہ وظیفے صرف انگریزی جماعت کے لئے الگ قائم کئے گئے - اور یہ قاعدہ قرار دیا گیا کہ مشرقی شعبے کا جو طالب علم اُس شعبے کو چھوڑ کر انگریزی شعبے میں داخل ہونا چاہے گا تو وہ اس وظیفے سے محروم کر دیا جاے گا جو اُسے مشرقی شعبے میں مل رہا ہے - انگریزی خواں طلبہ کے وظائف کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھا دی گئی —

سنه ۱۸۲۹ ع میں ممتحن کی رپوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ نے انگریزی تعلیم میں خاطر خواہ ترقی کی ہے اور تاریخ انگلستان کے ابتدائی حصے کے واقعات سے نہایت تفصیل کے ساتھ واقف ہیں ممتحن کہتا ہے کہ میں گھنٹے بھر جرح کرتا رہا لیکن کوئی ایک غلطی بھی طالب علموں نے اپنے جوابات میں نہیں کی، اُن کو نہایت جزئی اُمور بھی صحت کے ساتھ یاد تھے - انگریزی صرف و نحو کے قواعد سے بھی وہ بخوبی واقف تھے البتہ فارسی اُردو سے صحیح انگریزی میں ترجمہ کرنے میں ناقص تھے —

دوسرے سال کے امتحان میں یہ معلوم ہوا کہ لڑکوں نے انگریزی پڑھنے

کے طریقے میں خاصی ترقی کی ہے اور انگریزی میں گفتگو بھی کرسکتے ہیں مگر بے تکلفی ساتھہ کے نہیں اور نحوی قواعد کی صحت کا بھی خیال نہیں کرتے - انگریزی ترجمے میں بھی ممتحن نے ان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے " ترجمے ایسے ہی اچھے تھے جیسی ان سے توقع ہو سکتی تھی "

سنہ ۱۸۳۴ ع میں نصاب میں جیومیٹری (علم ہندسہ) کا اضافہ کیا گیا - اُس سال کی رپوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ نے کچھہ زیادہ ترقی نہیں کی - رپوٹ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اب وہ اس درجے کو پہنچ گئے ہیں کہ جہاں ترقی اُستاد کی کوشش پر نہیں بلکہ اپنی محنت پر ہے —

سنہ ۱۸۳۵ ع کی رپوٹ میں جنرل کمیٹی نے یہ راے ظاہر کی کہ انگریزی شعبے میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کے وسائل مہیا کئے جائیں - لوکل کمیٹی سے یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہ کالج کی تنظیم کی اسکیم پیش کرے جس میں پروفیسروں کا تقرر بھی شریک ہو - جب لارڈ آکلنڈ نے ایک یا دو سال بعد کالج کا معائنہ فرمایا تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اعلیٰ جماعت کے لئے اعلیٰ قسم کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے - دیسی مدرسین کی تنخواہ بہت کم ہے یعنے دس روپے ماہانہ سے کچھہ ہی زیادہ - جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کم لیاقت لوگ رکھنے پڑے ہیں - ان نقائص کی اصلاح اس وقت ہوئی جب سنہ ۱۸۴۰ ع میں درسگاہوں کی جدید تنظیم عمل میں آئی اور مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا —

انگریزی شعبے کے ابتدائی زمانے میں ممتحنین کو اس امر کی بڑی شکایت تھی کہ طلبہ زبان میں ناقص تھے - سنہ ۱۸۳۶ ع میں ممتحن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بعض طلبہ نے انگریزی زبان میں کافی لیاقت بہم پہنچانے سے قبل سائنس

شروع کردی۔ اس کی راے میں زبان کی تعلیم کی مدت بڑھا دی جاے اور اس کے بعد سائنس وغیرہ شروع کرائی جائیں۔ چند سال بعد سر ای۔ ریان نے معائنہ کے وقت یہ بیان کیا کہ سارے مدرسہ میں شاید ھی کوئی لڑکا ھو جو انگریزی صحت اور اچھے تلفظ کے ساتھہ پڑہ سکتا ھو، اگرچہ ان میں سے بعض ہرنکلے کی ھیئت پڑھتے تھے —

سنہ ۱۸۳۹ ع میں تعلیمی ترقی کے بہت اچھے آثار نظر آتے ھیں چنانچہ سالانہ امتحان میں ممتحنوں نے اعتراف کیا کہ طلبہ کی لیاقت ریاضیات کی مختلف شاخوں میں بہت اچھی ھے اور ملٹن کی کتاب Paradise Lost سے جو اشعار تشریح کے لئے دیے گئے تھے ان کے معانی و مطالب خوبی سے بتاے اور سوالات کے جوابات بہت معقول دیے۔ مضامین اور ترجمے جو گورمنٹ کی خدمت میں بھیجے گئے تھے وہ پسند کئے گئے۔ ادنی جماعتوں کی حالت بھی قابل اطمینان پائی گئی —

مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام

انگریزی اور مشرقی شعبے کئی سال تک نصاب تعلیم نیز تقریباً ھر پہلو سے ایک دوسرے سے جدا اور مختلف رھے جب پرنسپل کا تقرر ھوا تو اس نے (مسٹر بٹرو نے) اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دونوں شعبوں کی تعلیم کو ملا کر ایک کردیا جاے اور اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے کامل کوشش کی جاے تاکہ بالآخر ان دونوں کی تعلیم اگر بالکل یکساں اور ایک نہ ھو سکے تو کم سے کم برابر ضرور ھو جاے —

اس مقصد کے مد نظر سنہ ۱۸۴۳ ع میں دونوں شعبوں کا امتحان لیا گیا اور جہاں تک ممکن ھوا یہ امتحان ایک ھی مضامین میں لیا گیا اور ایک ھی سوالات دیے گئے۔ نتیجے میں مشرقی شعبہ کسی طرح مغربی شعبے سے کم نہ رھا۔

لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس کے قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کی - نیز انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دونوں شعبوں کو ایک ہی مکان میں ایک چھت کے نیچے تعلیم دینے سے اس تجویز کی کامیابی میں زیادہ سہولت پیدا ہوگی ' علاوہ اس کے بعض اور وجوہ بھی ہیں جن کی بنا پر ان کا ایک جگہ رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے - چنانچہ دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۱۸۴۴ ع میں اس پر عمل در آمد شروع ہوگیا —

دونوں شعبوں کی تعلیم کو ایک کردینے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں شعبوں میں تاریخی ' اخلاقی اور سائنٹفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جاے - ان مضامین کے ذیل میں حساب ' جیومیٹری ' الجبرا نیچرل فلاسفی ' جغرافیہ ' تاریخ ہند ' معاشیات (پولیٹیکل اکانومی) اور اصول قانون (جورس پرڈنس) کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا - کالج کے پرنسپل مسٹر بٹرو کا خیال تھا کہ ایسے مضامین اور علوم کی تعلیم سے جو دیسی مدارس میں عموماً نہیں پڑھاے جاتے اُس تعصب اور تنگ خیالی میں کمی پیدا ہوگئی ہے جو صرف عربی فارسی پڑھنے والوں میں پیدا ہوجاتی ہے - اور جب موجودہ نسل کے اساتذہ رخصت ہوجائیں گے اور اِن کے جانشین وہ ہوں گے جنہوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے - تو روشن خیالی میں اور بھی زیادہ ترقی ہوجاے گی —

انگریزی اور مشرقی شعبوں کے نصاب تعلیم کے یکساں کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مبارک کام یہ ہوا کہ دیسی زبان (اردو) کی تعلیم و تکمیل کی طرف بھی توجہ شروع ہوگئی - یہ غالباً لفٹنٹ گورنر بہادر کی اس راے کا اثر معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے صوبے کی تعلیمی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوے ظاہر کی تھی کہ " دہلی میں بھی ' جہاں فصیح ترین زبان بولی

جاتی ہے اور جسے ہر طبقہ کے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں ، طلبہ کو نصیح زبان میں انشاپردازی یا با محاورہ ترجمہ سکھانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اکثر یہ ہوتا ہے کہ جملوں کی نحوی ساخت بدل دی جاتی ہے لیکن اصل زبان کا اسلوب بیان اور طرز ادا جوں کا توں رہتا ہے"—

سالانہ رپوٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں انگریزی پڑھنے کا شوق دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ اس شوق کا پتا سنہ ۱۸۳۳ ع کی روئداد سے لگتا ہے جب کہ انگریزی شعبے میں ۱۱۶ نئے طالب علم داخل ہوے۔ سنہ ۱۸۴۵ ع میں پرنسپل نے رپوٹ کی کہ ابتدائی جماعتوں میں طالب علموں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ عملے اور مکان میں اضافے کی ضرورت پڑے گی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے جواب دیا کہ اگر تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی تعلیم آسانی سے ممکن نہیں تو داخلے میں کمی کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو داخلے کی فیس بڑھا دی جاے یا داخلے کا معیار لیاقت زیادہ کر دیا جاے۔ امیدواروں میں سے سب سے مستعد اور ہوشیار لڑکوں کے انتخاب کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ اُمیدوار زیادہ تیاری کرکے آئیں گے اور ابتدائی جماعتیں خود بخود برخاست ہو جائیں گی۔ اب چونکہ دونوں شعبے ایک ہوگئے ہیں ، اس لئے ان کا ذکر الگ الگ نہیں کیا جاے گا ، دونوں ساتھ ساتھ آئیں گے۔ البتہ اس قدر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوگا اور یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سال (سنہ ۱۸۴۵ ع) طالب علموں کی تعداد ۴۶۰ ہوگئی۔ انگریزی کے ۲۴۵ ، عربی کے ۷۵ ، فارسی کے ۱۰۹ ، سنسکرت کے ۳۱ طالب علم تھے۔ جن میں ۱۵ عیسائی ۱۴۶ مسلمان اور ۲۹۹ ہندو تھے—

اس سے ظاہر ہے کہ پرانی بدگمانی رفع ہو گئی تھی اور کالج رفتہ رفتہ مقبول ہوتا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہ تھی تاہم کافی تھی —

انگریزی شعبے کے طلبہ میں سے ۲۴۰' سنسکرت کے تمام طلبہ یعنے اکتیس کے اکتیس اُردو پڑھتے تھے ناگری یا ہندی پڑھنے والے کلّہم ۴۲ تھے —

یہ تعداد خود اپنی زبان سے اُردو کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔ یعنے ۴۶۰ میں سے ۴۵۵ اُردو پڑھنے والے تھے اور ہندی پڑھنے والے فقط ۴۲۔ اور یہ بھی ہندی اس لئے پڑھتے تھے کہ بعض ان میں سے فوج میں منشی گری کی نوکری کر لیتے تھے اور وہاں اس کی ضرورت پڑتی تھی —

سنہ ۴۶ - ۱۸۴۵ کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نصاب کی کتابوں کا تعین گورنمنٹ کی منظوری سے ہوتا تھا لیکن کام کی مقدار کا تعین پرنسپل اور مدرسین کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض طلبہ جو غیر معمولی طور پر ذہین اور محنتی ہوتے تھے وہ باقی طلبہ سے آگے نکل جاتے تھے۔ مدرس زیادہ تر ایسے ہی طلبہ کی طرف توجہ کرتے تھے کیوں کہ اُن کی وجہ سے اُن کے کام کی داد ملتی تھی۔ اس طرح ایک جماعت کے دو دو تین تین فریق ہو جاتے تھے۔ سال کے آخر میں صرف ایک ہی فریق نصاب پورا کرتا تھا' باقی طلبہ کی تعلیم میں بہت کم ترقی ہوتی تھی۔ اس سے جماعت کی عام ترقی پر برا اثر پڑتا تھا۔ لہذا کمیٹی نے یہ تجویز کی کہ ہر سال کے شروع میں جماعت کا سال بھر کا کام پہلے سے مقرر کردیا جائے اور پھر اُسے بارہ مہینوں میں تقسیم کیا جائے اور ماہانہ امتحانات میں دیکھ لیا جائے کہ اس مہینے میں جو سبق پڑھائے گئے ہیں وہ طلبہ نے بخوبی سمجھہ

لیے هیں یا نہیں - سال کے آخر میں اسی مدرس کا کام سب سے بہتر سمجھا جاے گا جس کے طالب علم زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب هوں گے ۔ جو طالب علم زیادہ ذهین اور محنتی هیں وہ اپنا وقت اپنے ذوق کے مطابق دوسرے مضامین کے مطالعہ میں صرف کریں اور جو طالب علم باقی جماعت کے ساتھہ نہیں چل سکتے وہ آیندہ سال نیچے کی جماعت کے ساتھہ اسی نصاب کو پھر پڑھیں —

یہ تجویز بہت مناسب اور معقول خیال کی گئی اور کمیٹی نے یہ خود پیش کی کہ آیندہ امتحان کے بعد جہاں تک جلد ممکن هو هر جماعت تجویز بالا کے مطابق ایک گوشوارہ هر جماعت کی تعلیم کا تیار کرکے پیش کیا جائے تاکہ وہ گورمنٹ میں بغرض اطلاع بھیج دیا جائے —

اس سال میقات ختم هونے پر ۲۹ دسمبر ۱۸۴۹ ع کو تقسیم انعامات کا جلسہ هوا اعلی جماعتوں کے امتحان کے لیے تاریخ ' انگریزی ' عربی ' سنسکرت کے سوالات کے پرچے گورمنٹ کی جانب سے وصول هوے اور قانون ' سیاست مدن (معاشیات) نیچرل فلاسفی Smiths, Moral Sentiments کے سوالات اور انشاپردازی کا پرچہ کالج هی میں مرتب کیا گیا —

ریاضی ' طبیعیات ' نیچرل تھیالوجی اور سیاست مدن کے سوالات کے پرچے انگریزی اور مشرقی شعبے کے لیے ایک هی تجویز کئے گئے تاکہ دونوں شعبوں کی استعداد کا مقابلہ کیا جاسکے - مضمون نگاری کا موضوع بھی دونوں کے لئے ایک هی رکھا گیا ' جو یہ تھا —

" بالائی (شمالی) هندستان پر ریلوں کے جاری
هونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا " —

تاریخ کے سوالات جدا جدا تھے ' کیونکہ مشرقی شعبے میں یہ مقابلہ

انگریزی شعبے کے اس مضمون کی تعلیم کم ہوی تھی - جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تاریخ کی کتابوں کے ترجمے مہیا نہیں ہوسکے تھے - تاہم دونوں شعبوں کے طلبہ کے جوابات بہت قابل اطمینان پائے گئے —

ادنی جماعتوں کا امتحان ڈاکٹر راس نے لیا اور طلبہ کی استعداد ترقی پر اظہار مسرت کیا اور خصوصاً مبتدیوں کے عمدہ تلفظ کو بہت پسند کیا —

سالانہ امتحان کے موقع پر دهلي اور قرب و جوار کے فارسی طلبہ کو ادنی وظائف کے مقابلے کی دعوت دی گئی باهر سے ۲۸ طالب علم شریک ہوے جن میں سے سات نے چار چار روپے ماهانہ کا وظیفہ حاصل کیا —

پرنسپل صاحب (ڈاکٹر سپرنگر) نے اپنی رپوٹ میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ فارسی جماعتوں کی تعلیم ناقص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب (مدرسین فارسی) پر تکلف یعنے مسجع مقفی طرز تحریر کے دلدادہ ہیں اور متاخرین کے کلام کو پسند کرتے ہیں —

سنسکرت کے شعبے کی حالت خراب پائی گئی جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ پنڈت صاحبوں پر پوری نگرانی نہیں رکھی جاتی - البتہ جب پرنسپل صاحب سنسکرت سے زیادہ واقف ہو جایئں گے تو اس شعبے میں ضرور ترقی ہوگی —

ہندی کی تعلیم بھی اچھی نہیں تھی - دونوں استادوں نے ہندی خود ہی محنت سے پڑھی ہے اور با وجود مقدور بھر کوشش کے ان میں معلم ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوی —

شعبۂ مشرقی کے طلبہ انشا پردازی میں خاص طور پر ناقص پائے گئے اس کے متعلق ڈاکٹر سپرنگر نے مفصلۂ ذیل راے کا اظہار کیا : —

" مولوی صاحب جو اپنے شاگردوں سے فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کراتے ھیں وہ اس قدر لفظی ہوتا ھے کہ میں نے اکثر یہ دیکھا ھے کہ اگرچہ طالب علم اپنے استاد کے منشا کے مطابق ترجمہ کرلیتا ھے لیکن اصل مفہوم سے نا آشنا رھتا ھے ' یہی وجہ ھے کہ مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ھوتی ھے - اُن کے خیالات ملایانہ طرز تعلیم کی وجہ سے نہایت محدود ھوتے ھیں - میری راے میں مشرقی شعبے کے تمام نقائص میں سے سب سے پہلے اس کی اصلاح ھونی چاھئے اور مجھے یقین ھے کہ اس کے بعد دوسرے ھی امتحان میں ترقی نظر آئے گی " —

دھلی کے شرفا اور امرا میں زیادہ تر تعداد مسلمانوں کی تھی - ڈاکٹر سپرنگر چونکہ عربی زبان سے واقف تھے اس لئے انھوں نے وھاں کے شرفا میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی —

کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ میں جو یورپین ادب و علوم کا ذوق پیدا ھوگیا تھا وہ برابر جاری رھا - اس میں دھلی ورنیکلر سوسائٹی کی کوششوں نے بہت مدد دی اور اس سوسائٹی کے روح و رواں ڈاکٹر صاحب ھی تھے —

سنہ ۱۸۴۷ ع کا امتحان اس سال کے آخر اکتوبر میں شروع ھوا اور ۲۴ دسمبر تک رھا اور میقات ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۴۷ ع کو ختم ھوگئی —

اس سال بھی یہ اهم اصول مد نظر رہا کہ مشرقی شعبے کے درجوں کو مغربی علوم کی مبادیات کی تعلیم دی جاے - کمیٹی نے اس امتحان کا جو گوشوارہ تیار کیا تھا اس کے دیکھنے سے معلوم هوتا هے کہ امتحان کے مضامین دونوں شعبوں میں تقریباً یکساں تھے - مثلاً احصاے تفرقات (Differential Calculus)' علم مثلث (Trignometry) ' اقلیدس' نیچرل فلاسفی' الجبرا' جغرافیہ' مضمون نویسی یہ سب مضامین دونوں کے هاں تھے - البتہ تاریخ کے مضمون میں کچھہ فرق تھا - انگریزی شعبے میں مارشمین' هیوم' گبن وغیرہ کی تاریخیں تھیں اور مشرقی شعبے میں مختصر خاکۂ تاریخ اور جامع‌التواریخ تھی - وجہ یہ تھی کہ انگریزی تاریخیں جو انگریزی شعبے میں پڑھائی جاتی تھیں ان کا ترجمہ اردو میں موجود نہ تھا اور یہ مجبوری تھی -

امتحان کے نتائج دیکھنے سے معلوم هوتا هے کہ دونوں شعبوں کی کامیابی قریب قریب یکساں هے -

عربی اور فارسی شعبوں کی مجوزہ اصلاح

کمیٹی نے بہ نظر اصلاح یہ تجویز کی کہ عربی اور فارسی شعبوں میں صرف مفید اور کار آمد علوم کا درس دیا جاے اور عربی صرف و نحو' منطق' فقہ اور حدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں نصاب تعلیم میں نہ شریک کی جائیں بلکہ ان کی تعلیم عام لکچروں کے ذریعہ دی جاے - اس کے متعلق کمیٹی کو اطلاع دی گئی کہ کمیٹی نصاب تعلیم میں اس قسم کے تغیر و تبدل کی مجاز هے جس سے طلبہ کی دماغی ترقی متصور هو' اگر ضرورت هو تو وہ ایسے اصحاب کو بلا معاوضہ لکچر دینے کی اجازت دے سکتی هے جو اس کام کے اهل هوں' گورنمنٹ کوبھی ان اشخاص کے تقرر میں کوئی عذر نہ هوگا -

سنسکرت اور هندی کے شعبے

جب کمیٹی کی توجہ اس طرف منعطف کی گئی کہ سنسکرت اور هندی شعبوں میں کسی قسم کی کوئی ترقی نظر

نہیں آتی تو کمیٹی نے یہ تجویز کی کہ سنسکرت کی جماعت توڑ دی جاے - اور ہندی کے شعبے کو زیادہ کارآمد اور بہتر بنایا جاے - ہندی زبان تمام طلبہ کے لئے لازمی کردی جاے اور وظیفے کے لئے ہندی کا جاننا لازم قرار دیا جاے - لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور یہ لکھا کہ سنسکرت کی جماعتوں کا برخاست کرنا اہل ملک اور طلبہ کو ملک کی ایک قدیم اور علمی زبان کے علم سے محروم رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا - ہندی کے متعلق یہ لکھا کہ ایک ایسی زبان کا علم تمام طلبہ کے لئے لازم قرار دینا جو ملک کی سرکاری اور دفتری زبان نہیں ہے ہماری راے میں درست نہیں - علاوہ اس کے مسلمان طلبہ جن کی تعداد اس کالج میں بہت بڑی ہے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے -

انگریزی شعبے کی ترقی

دو سال قبل انگریزی شعبے کے صرف چھ طالب علم ایسے تھے جو امتحان میں سوالات کے جوابات انگریزی میں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے - اس سال ۵۲ نے تاریخ کے سوالات کے جواب انگریزی میں لکھے اور ۴۵ طالب علموں نے (علاوہ درجۂ اول کے طلبہ کے) جیومیٹری (علم ہندسہ) کا مطالعہ شروع کیا اور ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی تعلیم چار سال سے اوپر کی ہو - لہذا کمیٹی نے یہ راے ظاہر کی کہ صرف چند منتخب طلبہ پر خاص توجہ مبذول نہیں کرنی چاہئے بلکہ عام طور پر ترقی کا خیال رکھنا چاہئے —

سنہ ۱۸۴۸ ع کا امتحان

سنہ ۱۸۴۸ ع کا امتحان ۲۴ نومبر سے ۲۱ دسمبر تک یعنی ۲۱ دن تک رہا - (باستثنائے ایام تعطیلات) —

ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورمنٹ نے مرتب کراکر بھیجے باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کئے - باقی جماعتوں کا امتحان اردو کے مولوی مملوک علی نے اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا —

مسعودی ' تاریخ یمینی ' قدوری ' میر قطبی ' حماسہ ' حسینی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور سنی اور شیعہ طلبہ کی اعلیٰ جماعتوں کو دیے گئے - ان کے تحریری جواب مفتی صدرالدین صاحب نے معائنہ کئے - عربی کی باقی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ھی نے لیا - عربی جماعتوں کے پرچے ڈاکٹر سپرنگر نے بھی دیکھے - فارسی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ھی نے لیا - ان کی رائے میں ان جماعتوں کے طلبہ کی قابلیت نہایت عمدہ تھی - تاریخ اور سائنس وغیرہ کا امتحان ' جن کی تعلیم اردو میں ھوتی تھی ' تحریری ھوا اور جوابات قائم مقام پرنسپل نے ماسٹر رامچندر اور اجودھیا پرشاد (مدرسین سائنس) کی معیت میں دیکھے —

مضمون نویسی کے لئے عنوان مسٹر کوپ نے دیا تھا اور یہ مضمون انگریزی کی دو اعلیٰ جماعتوں اور مشرقی شعبے کی چار جماعتوں کے طلبہ کو لکھنے کے لیے دیا گیا - انگریزی میں موتی لال کا مضمون بہ لحاظ زبان اور بہ لحاظ طریقۂ بیان سب سے بڑھ کر رھا - مشرقی شعبے کے طلبہ میں محمدحسین * کا مضمون سب سے بہتر خیال کیا گیا - بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں جو نصاب تعلیم میں شریک نہ تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دھلی گزٹ یا دھلی اردو اخبار سے تھا اور اس لئے اُسے اردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی اور ان سے اس نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں - اس لئے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ بعض اردو اخبار ھندوستان میں صحیح اور مفید معلومات کی اشاعت میں بہت اچھا کام کررھے ھیں —

---

* شمس‌العلما محمدحسین آزاد ھیں —

ہندی اگرچہ ہندی کی تعلیم لازمی نہ تھی لیکن اس کی طرف ہر سال زیادہ توجہ ہوتی جاتی تھی - عربی کے ۸۳ اور انگریزی کے ۶۵ طلبہ بیتال پچیسی پڑھ سکتے تھے اور ۱۹ پریم‌ساگر ' اور بہت سے ناگری خط میں لکھ سکتے تھے —

تمغہ یاب اس سال انگریزی جماعت میں مسٹر گوپال سہائے کو برنکلے کی کتاب ہئیت کے بہترین جوابات دینے پر چاندی کا تمغہ عنایت ہوا جو سر تی - مٹکاف نے کمیٹی کو اسی غرض سے دیا تھا - انہوں نے الفسٹن کی تاریخ ہند کے لئے بھی ایک تمغہ تجویز کیا تھا وہ کوئی حاصل نہ کرسکا —

سنہ ۵۰ - ۱۸۴۹ اس سال ۸۷ طلبہ فارغ التحصیل ہوے جن میں سے پانچ رڑکی کالج کی جماعت سوم میں گئے اور دس نے ملازمت حاصل کی —

سالانہ مضمون نویسی کے لئے مسٹر جے گبنز نے ذیل کا مضمون تجویز کیا :—

" اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا
کے بارے میں کیا فرق تھا " —

اس مضمون کے جوابی پرچوں میں تاریخی اور عام معلومات اچھی خاصی پائی گئیں اور لکھنے والے قومی تعصبات سے بری تھے - موتی لال کا مضمون انگریزی میں اور محمد حسین کا اردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا - موتی لال نے اس کے علاوہ مضمون نویسی کے دو تمغے بھی حاصل کئے ایک نقرئی تمغہ انگریزی مضمون کا تاریخ برطانیۂ ہند پر ' یہ سر تی مٹکاف کا عطا کردہ تھا - دوسرا طلائی تمغہ جو اردو مضمون کے لئے سرهنری میڈوک نے عطا کیا تھا - یہ مضمون دونوں شعبوں کے طلبہ کے لئے

تھا - مضمون کا عنوان یہ تھا : —

" مختلف آزاد پیشے اور مفید کار و بار جو هندستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے هیں اور هر ایک میں کامیابی کے بہترین طریقے، خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا ما بعد کی مساعی کے اعتبار سے "—

موتی لال اس کے بعد لاهور کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن میں ایک سو پچاس روپے ماهانہ پر ملازم هوگئے —

کالج کی حالت اب بہت درست هوگئی تھی اور هر طرف سے اطمینان حاصل هوگیا تھا اور زیادہ توجہ اب نصاب تعلیم کی اصلاح کی طرف هوگئی تھی سنہ ۱۸۵۳ ع میں طلبہ کی تعداد یہ تھی —

انگریزی	۱۹۹	جملہ ۳۲۰
عربی	۳۹	
فارسی	۵۷	
سنسکرت	۲۵	

عیسائی	۱۰	۳۲۰
مسلمان	۹۳	
هندو	۲۱۷	

انگریزی شعبے کے سب کے سب یعنی ۱۹۹ طالب علم اور سنسکرت شعبے کے بھی کل طالب علم یعنی پچیس کے پچیس اردو پڑھتے تھے - فارسی عربی والوں کو تو یوں بھی پڑھنی هی پڑتی تھی —

فارسی شعبے میں سے ۷ انگریزی اور فارسی عربی کے ۷۴ ناگری اور انگریزی شعبے کے ۸ فارسی پڑھتے تھے —

ماسٹر رام چندر اور چمن لال کے عیسائی ہونے سے شہر میں ہیجان

اس سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے کالج کو کسی قدر دھچکا لگا - وہ یہ تھا کہ ماسٹر رام چندر جو اردو میں سائنس پڑھاتے تھے اور لالہ چمن لال فرسٹ سب اسسٹنٹ سرجن دھلی دونوں کے دونوں عیسائی ہوگئے - اس سے دلی کی مخلوق بہت بگڑی اور شہر میں بڑا غلغلہ پیدا ہوا - ایسا سننے میں آیا ھے کہ بعض اور طالب علم عیسائی ہونے پر تلے ہوے تھے لیکن دلی والوں کے ڈر سے رہ گئے - لیکن تارا چند نے بعد میں عیسائی مذھب قبول کر لیا - جو ریورنڈ تاراچند کے نام سے مشہور ہوے اور چند سال ہوے کا عرصہ ہوا اجمیر میں انتقال کر گئے - ۱۱ جولائی کو ماسٹر رام چندر اور چمن لال نے بپتسمہ لیا - ۱۰ جولائی تک کالج میں داخلہ برابر ہوتا رہا اور طلبہ کی تعداد ۳۴۲ تھی لیکن اس خبر کے اڑتے ھی دفعتاً داخلہ بند ہوگیا اور چوبیس پچیس لڑکوں نے فورا اپنے نام کٹوالئے - لیکن جنوری سنہ ۵۳ ع میں لوگوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑگیا اور پھر لڑکے داخل ہونے شروع ھو گئے —

مسٹر کارگل پرنسپل کالج نے مشرقی شعبے کے نصاب تعلیم کے متعلق ایک تجویز گورمنٹ میں پیش کی - وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی طرف سے جو بدگمانی اور تعصب تھا وہ اب کم ہوتا جا رہا ھے اور " اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ تاریخ اور نیچرل سائنس کی تعلیم منطق ' فقہ اور تفسیر کے مقابلے میں زیادہ اہم ھے - منطق و فقہ و تفسیر کا پڑھنا نہایت ضروری ھے تاکہ طلبہ عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف ھو جائیں - کیونکہ تاریخ اور نیچرل سائنس پر کافی

کتابیں نہیں ہیں جن کے مطالعہ سے ان زبانوں کا علم حاصل ہوسکے ، لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر اس قسم کی کتابیں مہیا ہو جائیں تو منطق و فقہ کی کتابیں پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ، لہذا گورنمنٹ کی توجہ اس جانب مبذول کی جاتی ہے کہ کالجوں میں عربی اور فارسی کی تاریخوں کے بہت اچھے کتب خانے قائم کئے جائیں - ایسے منطق پر زیادہ تر توجہ صرف کرنا جس میں نہ فلسفہ ہے نہ عقلیت بے سود ہے - اب رہی فقہ ، سو اس کا بالکل خارج کر دینا خلاف دانشمندی ہوگا - عربی کے علما ایک معقول اور مختصر نصاب تعلیم اس مضمون کا انتخاب کرکے مرتب کرسکتے ہیں - ریاضیات اور نیچرل سائنس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ جب انگریزی کا نصاب قطعی طور سے متعین ہو جائے تو اس کا اردو میں ترجمہ کرکے مشرقی شعبے کے لئے مقرر کر دیا جائے - ایسے نصاب کی سخت ضرورت ہے - گزشتہ تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایسی کتابوں کے ترجمے اور طبع پر وقت اور روپیہ صرف کرنا جو کبھی پڑھنے میں نہ آئیں گی ، بیکار ہے - مشرقی شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کے طالب علم سے پیچھے نہیں ہے ، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ مناسب کتابوں کے نہ ہونے سے وہ بخوبی اس علم کو حاصل نہیں کرسکتا جو کتابوں کے موجود ہونے سے کرسکتا تھا -

حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے - انھوں نے

مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور اُن سے علم هئیت ' جنرل سائنس ' اور اخلاق اور مذھبی مسائل پر گفتگو کی - ان سب کا یہ بیان ھے کہ اس شعبے میں قطعی طور سے بہت بڑی ترقی پائي جاتی ھے اور مختصر یہ کہ تمام ھندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے آثار نظر نہیں آتے "

اسی پر لفٹننٹ گورنر بہادر نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ھے —

لفٹننٹ گورنر ' پرنسپل صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ھیں اسلامی فقہ ' مذھب اور منطق کی تعلیم اُسي حد تک ھونی چاھئے جہاں تک ان کے مطالعہ سے زبان اور اصول فقہ کے علم حاصل ھونے میں مدد ملے ان خاص اور رسمی علوم کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں معلوم ھوتا - عربی ادب سے ایسے مفید انتخابات جو مستند اور اعلیٰ درجے کي کتابوں سے کئے جائیں گے کالجوں میں جاری کرنے سے موجودہ نظام تعلیم کی خرابیاں بہت کچھہ کم ھو جائیں گی - ایسے انتخاب کی ترتیب کے لئے دھلی کمیٹی کے پاس خاص سہولتیں موجود ھیں اور اگر وہ اس معاملے میں کوشش کرے گي تو ھز آنر اُسے بنظرتحسین دیکھیں گے - مشرقی شعبے کے طلبہ کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو تیقن دلایا گیا ھے اس پر بیحد مسرت کا اظہار فرمایا - اور آخر میں یہ تحریر فرمایا کہ لفٹننٹ گورنر کی خوشی کا موجب ھوگا اگر کمیٹی اردو تعلیم کے ایسے نصاب کے انتخاب کا اھتمام کرے گی جس کی سفارش سکرٹری نے کی ھے " —

سنہ ۱۸۵۴ ع

وہ طوفان جو ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال کے تبدیل مذھب پر اٹھا تھا ' بالکل فرو ھوگیا اور طلبہ کی تعداد میں کسی قدر اضافہ ھوا - سنہ ۵۳ ع میں تعداد ۳۱۵ تھی ' اس سال

۳۳۳ ھوگئی —

مسلمان طلبہ میں انگریزی زبان سکیھنے کا شوق بڑھتا جاتا تھا اور گورمنٹ نے بھی لوکل کمیٹی کے یہ امر ذھین نشین کرنے کی کوشش کی کہ گورمنٹ کا ھرگز یہ منشا نہیں ھے کہ مشرقی شعبے کے تمام طلبہ انگریزی پڑھنے پر مجبور کئے جائیں ' لیکن اس کی تمنا ضرور ھے کہ اگر انگریزی زبان نہ سیکھیں تو کم از کم مغربی سائنس ھی کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں ' کیونکہ تجربے نے ثابت کر دیا ھے کہ اس طریقہ سے بھی نہایت مفید اور کار آمد معلومات حاصل کی جاسکتی ھیں —

تعداد طلبہ بحیثیت تعلیم زبان		
	صرف انگریزی پڑھنے والے	۱۹
	انگریزی اور اردو پڑھنے والے	۱۹۲
انگریزی اردو اور فارسی مل کر پڑھنے والے		۱
صرف اردو پڑھنے والے		✦
اردو کے ساتھ فارسی اور عربی پڑھنے والے		۹۵
اردو کے ساتھ ھندی یا سنسکرت پڑھنے والے		۲۷
محض ھندی پڑھنے والے		✦
ھندی اور سنسکرت پڑھنے والے		✦
ھندی اور فارسی و عربی پڑھنے والے		۹۵
محض فارسی پڑھنے والے		۵۷
محض عربی پڑھنے والے		۳۸
محض سنسکرت پڑھنے والے		۲۷

عربی فارسی کے تمام متعلمین ھندی پڑھتے تھے اس میں مصلحت یہ تھی کہ ان زبانوں کے طلبہ عموما اعلی قابلیت کے ھوتے تھے اور جب وہ

دیہات میں جاتے تھے تو گانو والوں سے معاملہ کرنے میں یہ زبان کار آمد ثابت ہوتی تھی - سنسکرت پڑھنے والے بلا استثنا اردو پڑھتے تھے - ان کے لئے ہندی کا پڑھنا ضروری نہیں تھا اس لئے کہ سنسکرت اور اردو کا طالب علم ہندی زبان لازمی طور پر سمجھتا ہے —

تعداد طلبہ بلحاظ مذہب			
	عیسائی	۱۵	جملہ ۳۳۳
	مسلمان	۱۱۲	
	ہندو	۲۰۶	

اس سال مسلمان طلبہ کی تعداد میں بین اضافہ ہوا اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس سال زبان اردو کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا تھا ' اس لئے مسلمان زیادہ داخل ہوے اور ان میں سے نصف تعداد نے انگریزی بھی سیکھنی شروع کردی تھی - اس پر انگریزوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں - مسٹر کار گل نے جو کہا تھا کہ مسلمانوں میں سے تعصب اٹھتا جاتا ہے وہ بات سچ نکلی —

اس سال انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی خاص مشق کرائی گئی - اس کام کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ وقف کر دیا گیا تھا - بہت سے طالب علم ایسے تھے جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو کافی تھا لیکن وہ آسانی سے صحیح ترجمہ کرنے سے قاصر تھے - فارسی زبان کے اساتذہ سینیر یا اعلی جماعتوں کو اردو پڑھاتے تھے —

انگریزی اور اردو میں مضمون نویسی کے لئے تمغے

مٹکاف صاحب مرگئے تھے' اس لئے کالج فنڈ سے ہر سال بیس روپیہ کا تمغہ تیار کرایا جاتا تھا اور انگریزی میں سب سے بہتر مضمون لکھنے والے کو ملتا تھا اس سال یہ تمغہ بھگوانداس کو ملا -

مفتی صدرالدین صاحب کا تمغہ اردو زبان میں بہترین مضمون لکھنے والے

کو دیا جاتا تھا وہ خواجہ ضیاءالدین کو ملا - مضمون کا عنوان یہ تھا :-

"شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر ہے

اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ ہے ؟" —

مسٹر وھرٹر نے ایک نقرئی تمغہ میکینکس کے لئے دیا - مضمون اردو میں لکھوایا گیا - شیخ ضیاءالدین کو ملا -

نیچرل فلاسفی پر اردو میں لکچر

ڈاکٹر میوآت نے ہز آنر کو لکھا تھا کہ اردو کے شعبۂ سائنس میں ریاضی ھی پر تمام کوشش نہیں صرف ہونی چاھئے بلکہ نیچرل فلاسفی اور مخلوط ریاضی پر بھی اردو زبان میں لکچر دینے چاھئیں- ہز آنر نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور بیان کیا کہ بنارس اور آگرہ کے کالجوں میں اس طریقے سے بیحد فائدہ پہنچایا جارھا ھے' یہی التزام دلی میں بھی ہونا چاھئے - کلکتہ سے جو آلات منگائے گئے ھیں ان سے کام لیا جائے - چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی - تقریباً چھ سو روپے کے آلات کلکتہ سے آئے تھے - ماسٹر رام چندر سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دیتے تھے —

سنہ ۱۸۵۴ ع اور ناظم تعلیمات کا تقرر

سنہ ۱۸۵۴ ع تک ممالک مغربی شمالی میں محکمۂ تعلیمات کا کوئی ناظم نہ تھا - یہ محکمہ براہ راست لفٹنٹ گورنر کے ماتحت تھا - ٹامسن صاحب گورنر ممالک مغربی شمالی تھے اور وھی اس صوبے کے تمام کالجوں کے وزیٹر تھے - اس وقت صوبے میں تین کالج تھے - دلی' آگرہ اور بنارس - بعد میں ایک کالج بریلی میں قائم کیا گیا -

کالجوں کے قیام کا منشا

کالجوں کے قیام کا منشا یہ تھا کہ ھندوستانیوں کو زبان اردو کے ذریعہ ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے- اس مقصد میں حکومت کو ایک گونہ کامیابی ہوئی - اس سال کالجوں میں جدید قواعد و ضوابط کا نفاذ ہوا - اس کا نتیجہ طلبہ کے حق میں اچھا نکلا اور یہ

سال تمام کالجوں میں سالہاے ماسبق کے مقابلے میں مسعود ثابت ہوا - سواے دلی کے باقی تمام کالجوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا - دھلی میں مسلمان طلبہ کی کمی کی یہ وجہ بیان کی گئی کہ چھہ مسلمان طالب علم جو عربی فارسی کی اعلی جماعتوں میں تعلیم پاتے تھے ناظم صاحب تعلیمات نے ڈپٹی کمشنر جہلم کی درخواست پر فارسی اور اردو کے مدرسین کی حیثیت سے ضلع جہلم کے مدارس میں بھیج دیے - اسی طرح اور طلبہ نے بھی ملازمتیں اختیار کرلیں - البتہ دوسرے کالجوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد میں نسبتاً ترقی نظر آتی ھے خصوصاً بریلی کالج میں - مسلمانوں کے لیے بڑی کشش شعبۂ علوم مشرقیہ میں تھی - ان تمام کالجوں میں مسلمان ۳۵۳ اور ھندو ۱۵۱۹ تھے - مسٹر ٹیلر پرنسپل دھلی کالج جن کا تعلق اس کالج سے عرصۂ دراز سے تھا اور اس کی حالت سے خوب واقف تھے ، اُن کا بیان ھے کہ دھلی کالج میں مسلمان طلبہ کی کمی کا ایک باعث یہ تھا کہ شہر میں متعدد فارسی اور عربی درسگاھیں کھل گئی تھیں اور عربی فارسی پڑھنے والے طلبہ ان قومی درسگاھوں میں ہٹ گئے تھے - کالج کی عربی جماعت میں اُنیس کے انیس طالب علم مسلمان تھے - فارسی کی جماعتوں میں ۲۵ اور انگریزی میں ۲۱ - اس کے باوجود فارسی زبان تحصیل کرنے والے طلبہ میں ھندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی —

شہر میں ایک فارسی اردو کا مدرسہ تھا اس کے مدرس مسلمان تھے - ۱۰۴ طلبہ اس میں تعلیم پاتے تھے ان میں سو ھندو تھے اور چار مسلمان - اس سے صاف ظاھر ھے کہ اس زمانے میں ھندوؤں کو فارسی پڑھنے کا کس قدر شوق تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے مدرسے میں غیر مسلم طلبہ کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی —

مسٹر ٹیلر نے ایک اور بات بھی لکھی ھے وہ کہتے ھیں کہ مسلمان شرفا ، نواب اور سلاطین دلی کالج کو ایک خیراتی درس گاہ تصور کرتے تھے

اور اس بنا پر اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کی غرض سے نہیں بھیجتے تھے لہذا انھوں نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ استادوں کو ملازم رکھ کر اپنے بچوں کو گھروں پر تعلیم دلاتے تھے لیکن اس کے برعکس ہندو مالدار سے مالدار اور عزت دار سے عزت دار ' دلی کالج کو تمام خانگی درس گاہوں پر ترجیح دیتا تھا اور اپنے بچے کو وہاں تعلیم دلانا پسند کرتا تھا اس وجہ سے ہر شعبے میں ہندو طلبہ کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ رہتی تھی —

عیسائیوں کی تعداد تمام کالجوں میں گھٹتی جاتی تھی - اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے مدارس میں جہاں صرف انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں کی تعلیم ہوتی تھی ' الگ کھول لئے تھے - آگرہ میں اس قسم کا مدرسہ قائم ہوگیا تھا —

اُصول تعلیم کا تعین

تعلیم کا اصول یہ رکھا گیا تھا کہ گورمنٹ کالجوں میں آیندہ ایسے مضامین کی تعلیم دی جائے جو دیسی مدارس میں میسر نہ آسکے اور ہندوستانیوں کو اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے - ناظم سررشتۂ تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے لفٹنٹ گورنر سے اس پر عمل در آمد کی شد و مد سے التجا کی تھی اور اس غلطی پر متنبہ کیا تھا کہ بعض طالب علم محض اس خیال سے کالجوں میں داخل ہوجاتے ہیں کہ وہاں تعلیم کا نرخ ارزاں ہے اور تعلیم بھی کونسی جو کالج کے باہر بھی میسر آسکتی ہے - لہذا انھوں نے استدعا کی کہ ایسے طلبہ کو داخل ہی نہ کیا جائے (در اصل دلی کالج میں یہ صورت پیش آئی تھی ' بنارس کالج اس سے مستثنیٰ تھا) ناظم تعلیمات نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ طلبہ کی دماغی اور ذہنی قوتوں کو علم کے ایسے شعبوں پر مرکوز کرایاجائے جو سب سے زیادہ کار آمد اور اہم ہیں موجودہ طرز تعلیم سے اساتذہ اور طلبہ

دونوں کی جان ضیق میں آجاتی ھے ' ان کے سامنے اتنے مضامین گڈ مڈ کر کے رکھہ دیے جاتے ھیں جن کا بار اُٹھاے نہیں اٹھتا اور غریب طلبہ کی راہ ترقی سنگلاخ ھوجاتی ھے - لہذا یہ تجویز کی جاتی ھے کہ کوئی لڑکا دو زبانوں سے زیادہ نہ سیکھے - ھر ایسا طالب علم جو انگریزی پڑھتا ھے صرف اردو لازمی طور پر پڑھے اور ناگری حروف سے بخوبی شناسا ھوجاے تاکہ انھیں کامل صحت اور پوری آسانی سے بے روک ٹوک اور بے جھجک اُٹھا لے اور اگر وہ گورمنٹ کا افسر مال گذاری ھوجاے تو اُسے کوئی دقت پیش نہ آئے —

هندی اُڑا دی جاے اور اردو کو ترقی دی جاے

اس کے ساتھہ یہ بھی تجویز کی کہ بنارس ' ساگر اور اجمیر کے علاوہ باقی کالجوں میں سے ھندی کو یکسر اُڑا دیا جاے - وجہ یہ بیان کی گئی کہ تحصیلی اور دیگر مدارس میں ھندی پڑھنے پڑھانے کا کافی انتظام ھے - تمام فارسی طلبہ پر اردو پڑھنا لازمی کیا جاے اور انھیں کسی دوسری زبان سیکھنے کی اجازت نہ دی جاے - شعبۂ عربی پر بھی یہ بات لازمی کردی جاے اور اس طرح جونیر کلاسوں کے تمام طلبہ عربی' فارسی' انگریزی' اردو میں ایک جگہ ملا دیے جائیں اور زبان اردو کا ایک الگ شعبہ قائم کیا جاے جس میں حساب' جبرومقابلہ ' جیومیٹری (علم ھندسہ) تاریخ اور جغرافیہ سے پوری واقفیت اور آگاھی حاصل کی جاے یعنے طلبہ زبان اردو کے ذریعے اِن مضامین میں مہارت تامہ حاصل کریں اور انگریزی عربی فارسی زبانوں کی تحصیل نکتہ فہمی اور دقیقہ سنجی کے ساتھہ علحدہ علحدہ جماعتوں میں کی جاے - مزید برآں شعبۂ اردو میں قواعد اردو اور زبان اردو میں مضمون نگاری کی کامل دسترس حاصل کی جاے ؛ انگریزی ' فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے

کی مشق بہم پہنچائی جاے - اسی طرح انگریزی فارسی اور عربی کی جماعتوں میں طلبۂ کو ایسی تربیت دی جاے کہ وہ اردو سے ان زبانوں میں ترجمہ کرنے کا ملکہ پیدا کرلیں " * —

لفٹنٹ گورنر کی منظوری

لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا اور خاص طور پر اردو شعبے کے علحدہ طور پر قائم کرنے کو بہ نظر استحسان دیکھا —

هندی اردو دھلی کالج میں

دلی کالج میں نہ تو کوئی با قاعدہ هندی جماعت تھی اور نہ کوئی طالب علم - شعبۂ سنسکرت کی جونیر جماعتوں میں حساب ' الجبرا ' جیومیٹری اردو زبان میں پڑھائی جاتی تھی - عربی فارسی کے طلبہ بیتال پچیسی ' سنگھاسن بتیسی اور پریم ساگر پڑھتے تھے ' یہ اس خیال سے کہ اگر کوئی طالب علم فوجی منشی گری کی خدمت قبول کرے تو اسے انجام دے سکے —

بنارس میں تمام جونیر جماعتوں میں هندی اور اردو ساتھ ساتھ پڑھای جاتی تھی —

۱۸۵۶ ع کی حالت

دسمبر سنہ ۱۸۵۵ ع اور دسمبر ۱۸۵۶ ع کے اختتام پر طلبہ کی تعداد علی الترتیب ۳۷۲ اور ۳۴۵ تھی - طلبہ کی تعداد میں کمی کو پرنسپل صاحب نے حسب ذیل وجوہ سے منسوب کیا —

۱ - شعبۂ سنسکرت دلی کالج سے اُڑا دیا گیا - اس سے ۱۳ کی کمی هوی —

۲ - سرکاری اور دوسرے محکموں میں دلی کالج کے ۳۷ طلبہ ملازم

---

* مراسلۂ ناظم تعلیمات نشان ۴ مورخہ ۲ مئی سنہ ۱۸۵۵ ع مع رپوٹ دلی کالج -

ھوکر چلے گئے —

۳ - بعض غریب اور نادار طلبہ کے پاس اتنے دام نہ تھے کہ کتابیں خرید کر اگلی جماعتوں میں شریک ھوتے -

۴ - غیر حاضری کے متعلق نہایت سخت قواعد کا نفاذ ' جس کے سبب سے ۴۵ طلبہ کے نام خارج کردیے گئے -

۵ - ناظم صاحب کے حکم کے بموجب ھر چھمائی پر داخلہ عمل میں آیا اس لیے طلبہ کم داخل ھوے —

۶ - شہر میں مشن ھائی اسکول نے نادار طلبہ کی دستگیری کا ایسا بیڑا اتھایا کہ کالج کی طرف غریب طلبہ نے رخ کرنا چھوڑ دیا —

طلبہ کی تعداد باعتبار قومیت | عیسائی ۴ ' ھندو ۲۸۵ ' مسلمان ۸۳ —

اردو | تمام طلبہ اردو میں درس پاتے تھے ' عربی اور فارسی کے طلبہ نے ھندی میں کافی استعداد پیدا کرلی —

مصارف تعلیم | ھر طالب علم پر اس سال تقریباً ۹۰ روپیہ ۸ آنے صرف ھوے —

ملازمت | چودہ طلبہ شعبۂ انگریزی کے اور ۲۳ شعبۂ مشرقیہ کے ملازم ھوے افسران کالج نے نئے پرانے طلبہ کو ملازمتیں حاصل کرنے میں بہت مدد دی —

شعبۂ علوم مشرقی | شعبۂ مشرقی میں فارسی کی تین جماعتیں تھیں ' ھر ایک جماعت کے دو فریق تھے اور چار عربی کی جماعتیں تھیں - شعبۂ فارسی میں ۶۶ اور شعبۂ عربی میں ۳۹ طالب علم تھے - اِن جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں بڑی احتیاط سے مغربی سائنس زبان اردو کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھی - ماسٹر رام چندر اور دیگر اساتذہ بڑے شوق اور قابلیت سے درس دیتے تھے اور طلبہ ریاضی '

نیچرل فلاسفی اور تاریخ میں ایسے مستعد ھوگئے تھے کہ شعبہ انگریزی کے طلبہ سے برابر کا مقابلہ کرتے تھے اور اکثر بازی لے جاتے تھے - اس بارے میں رام سرن داس صاحب کی راے پہلے لکھہ چکا ھوں —

سنہ ۵۷ ع کے غدر میں کالج کا حشر

گیارھویں مئی پیر کا دن تھا - کالج کا وقت صبح کا تھا - پڑھائی حسب معمول ھورھی تھی - ساڑھے آٹھہ بجے چند لالہ ھانپتے کانپتے آئے ' ان کی سراسیمگی اور وحشت کا عجیب عالم تھا - دوڑے آے اور جماعتوں میں بے تحاشا گھس گئے اور اپنے لڑکوں سے کہا ' گھر چلو ' بھاگو ' غدر مچ گیا ' سپاھی اور سواروں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ھے - یہ سنتے ھی لڑکے اپنے اپنے بستے سنبھال چمپت ھونے لگے - پرنسپل صاحب حیران و ششدر تھے کہ یہ کیا تماشا ھے - اتنے میں میگزین کا چپراسی آیا اور کمانڈنٹ کا خط لایا ' اس میں مرقوم تھا کہ شورش برپا ھوگئی ھے اور حالت لمحہ بہ لمحہ خطر ناک ھوتی جاتی ھے ' مصلحت یہ ھے کہ آپ فوراً مع انگریزی اسٹاف یہاں آجائیں اور میگزین میں پناہ لیں - پرنسپل ٹیلر ' رابرٹس ھیڈ ماسٹر ' اسٹوارٹ سیکنڈ ماسٹر ' اسٹینر تھرڈ ماسٹر بوکھلاے ھوے بھاگے اور میگزین میں پناہ گزیں ھوے —

مسٹر ٹیلر کالج ھی کی کوٹھی میں رھتے تھے ' رابرٹس کا بنگلہ بھی کالج کے احاطے میں تھا ' ان کے بیوی بچے بھی ساتھہ رھتے تھے ' اسٹوارٹ منصور علی خاں کی حویلی میں اور اسٹینر کشمیری دروازے کی طرف کسی مکان میں اقامت گزیں تھے - پروفیسر یسوع داس رام چندر چاندنی چوک میں ایک کوٹھے پر رھتے تھے —

اس کے بعد ھندوستانی سپاھیوں نے میگزین کو گھیر لیا - وہ ھر

انگریزی چیز کو تباہ کرتے چلے آتے تھے میگزین میں پانچ چھ انگریز افسر اور دو تین سارجنٹ تھے۔ ان لوگوں نے اپنی ننھی سی جماعت سے بڑی پا مردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستانی سیڑھیاں لگا کر میگزین کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ جب انگریزوں کو کمک کی کوئی توقع نہ رہی تو انھوں نے میگزین کو آگ لگا دی اور ہزاروں ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کوئی پانچ انگریز خود بھی لقمۂ اجل ہوے —

مسٹر ٹیلر اور مسٹر اسٹیفنز جان بچا کر بھاگے اور میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آے، لیکن ہوش و حواس باختہ۔ حیران تھے کہ کہاں جائیں، ہر سمت موت کھڑی نظر آتی تھی۔ رابرٹس غریب تو وہیں ڈھیر ہوگیا اور اسٹوارٹ بھی میگزین کے شعلوں کے نذر ہوے۔ بہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں محمد باقر صاحب مولوی محمد حسین آزاد کے والد ماجد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے روز جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوسناک حشر ہوا قریب بیرام خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بیچارے نے وہیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھاے گئے، اور اُن کا کوئی عذر نہ چلا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔

مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی تھی اور ان پر بھی قوی شبہہ تھا، مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سر زمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آے —

مسٹر ٹیلر نہایت قابل، نہایت ہمدرد اور شریف النفس انسان تھے ان کے مرنے کا سب کو رنج اور صدمہ تھا۔ ان کے حالات میں کالج کے اساتذہ کے عنوان کے تحت الگ لکھوں گا، اس سے معلوم ہوگا کہ یہ کیسا عجیب و غریب شخص تھا —

اسٹیفنر صاحب سب سے اچھے رہے، میگزین اُڑنے سے جو اس کی چار دیواری میں درز پڑ گئی تھی اس سے ٹیلر صاحب کے ساتھ باہر نکل آے۔ ٹیلر صاحب کی اجل تو اُنھیں کالج کی طرف لے گئی اور ان کی حیات انھیں جمنا پار میرٹھ لے گئی۔ وہاں یہ زندہ پہنچ گئے اور غدر کی پر آشوب دارو گیر سے بچ گئے —

رہے پروفیسر رام چندر، یہ پیدل چل کر پن چکی کی سڑک پر ہوتے ہوے قلعے کے سامنے آے۔ انھوں نے دیکھا کہ چند ترک سوار یا مغلوں کا دستہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ہوے لال ڈگی کی سڑک پر آ رہا ہے یہ اسے دیکھ کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئے اور چاندنی چوک کے کوٹھے پر صحیح سلامت پہنچ گئے۔ وہاں سے انھیں ان کے بھائی رائے شنکر داس اپنے ساتھ لے گئے اور کایستوں کے محلے میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جا چھپایا مگر ان کے اقربا نے کہا اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم پر آفت نہ آے ان کا وہاں زیادہ قیام گوارا نہ کیا۔ ان کا ایک قدیم نوکر جاٹ تھا اس نے بڑی وفاداری اور رفاقت کی۔ انھیں جاٹ بنا کر گنواروں کے سے کپڑے

پہنا پگڑ بندھوا اپنے گاؤں لے گیا اور وھاں رکھا - وھاں سے یہ باولی کی سرا میں انگریزی لشکر سے جا ملے —

راہرٹس صاحب کی دو لڑکیاں اور پانچ عیسائی طلبہ بھی اِن بے رحموں کے ھاتھہ سے مارے گئے —

کالج کا کتب خانہ

دن کے بارہ بجے کے کچھہ دیر بعد کالج کا کتب خانہ لٹنا شروع ھوا - لٹیرے بڑے بے ڈھب تھے - انگریزی کی تمام کتابوں کی خوبصورت خوبصورت سنہری فرموں کی جلدیں پھاڑ لیں اور ورقوں کا کالج کے تمام باغ میں دو دو انچ موٹا فرش بچھا دیا - عربی فارسی اردو کی جتنی کتابیں تھیں ان کی گٹھریاں باندہ باندہ کر اپنے گھر لے گئے اور پھر کباڑیوں اور مولویوں کے ھاتھہ کوڑیوں کے مول فروخت کردیں - سائنس ڈیپارٹمنٹ میں جتنے آلات تھے انھیں بھی توڑ پھوڑ ڈالا اور لوھا پیتل وغیرہ دھاتیں لے گئے —

غدر کے بعد کالج سنہ ۱۸۶۴ ع میں از سر نو جاری ھوتا ھے

غدر میں جو کالج بند ھوا تو بند کا بند ھی رھا، کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی؛ حالات ھی کچھہ ایسے رونما ھوگئے تھے کہ کوئی توجہ کرتا تو کیا کرتا - آخر مئی ۱۸۶۴ ع میں اس کی قسمت جاگی اور از سرنو کھلا - شروع شروع میں سارا کام پروفیسر ھٹن (Hatton) کی نگرانی میں رھا، اس کے بعد اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ ع کے آخر میں مسٹر اڈمنڈ ولمٹ (Edmand wilmot) بی - اے، ٹرنٹی کالج کیمبرج نے انگلستان سے آکر پرنسپل کی خدمت کا "چارج" لیا - اور جب پروفیسر ھٹن لفٹنٹ ھارائڈ کی جگہ انبالہ سرکل کے انسپکٹر مقرر ھوے تو اُن کی جگہ مسٹر سی - ک - کوک بی - اے سن جان کالج کیمرج کا تقرر انگریزی زبان کی پروفیسری پر ھوا - لیکن جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع میں

مسٹر ولہمث کو ایسا سخت حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں اپنا تعلق کالج سے قطع کرنا پڑا - انھوں نے نہایت قابلیت اور جوش سے ریاضیات پر لکچر دینے شروع کئیے تھے اور اُن کے طریقۂ تعلیم سے بہت کچھہ توقعات پیدا ھوگئی تھیں' لیکن ایک اتفاقی حادثے نے ان توقعات کا خاتمہ کردیا - اس کام کا بار بھی پروفیسر کک پر آپڑا اور انھوں نے اس فرض کو بڑی محنت اور خوبی سے انجام دیا —

ایس - پی - جی مشن اسکول کا الحاق دلی کالج سے

اس سال ریورنڈ آر - ڈنٹر R.Dinter صدر ایس - پی - جی مشن نے اپنی درسگاہ (سن اسٹیفن کالج) کے شعبے کو بند کر دیا اور اپنے ھاں کے میٹریکولیشن کامیاب طلبہ کو دلی کالج میں بھیج دیا —

انگریزی کھیل

یہ پہلا سال تھا کہ کالج میں انگریزی کھیل اور ورزشیں جاری کی گئیں —

اخبارات کے مطالعہ کی ترغیب

اس سال طلبہ کو اخبارات کے مطالعے کی ترغیب دی گئی اور " پنجاب ایجو کیشنل میگزین " جاری کیا گیا - چونکہ طلبہ کے مطالعے میں انگریزی کے قدیم اساتذہ کا کلام رھتا تھا اس لئیے وہ معمولی خط و کتابت میں بھی مرصع اور پر شکوہ عبارت لکھتے تھے اور سادہ زبان لکھنے کے عادی نہ تھے - اس نقص کے رفع کرنے کے لئیے کالج میں السٹرٹیڈ لنڈن نیوز (Illustrated London News) منگا یا گیا ' اس کے علاوہ صوبے کے اخبار بھی منگائے جاتے تھے —

کالج کی جماعتیں

کالج میں اس وقت دو جماعتیں تھیں - اعلی جماعت یعنے سال دوم میں ۱۳ طالب علم تھے جو کلکتہ یونیورسٹی

کے امتحان فسٹ آرٹس (سنہ ۱۸۶۵ ع) کے لئے تیاری کررہے تھے —

طلبہ کی تعلیمی حالت

پرنسپل کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان میں طلبہ کی حالت بہت قابل اطمینان رہی - انہوں نے طلبہ کی محنت اور ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور بعض طلبہ کا خصوصیت کے ساتھہ ذکر کیا ہے —

نصاب تعلیم میں بھی بہت کچھہ تبدیلی کی گئی - عربی کی تعلیم پر خاص توجہ کی گئی اور لاطینی زبان کے سبق شروع کئے گئے تاکہ انگریزی الفاظ کے مادوں کے سمجھنے میں آسانی ہو - صرف یہ دو تبدیلیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں —

سنہ ۱۸۶۵ ع کا تعلیمی دربار

۲۵ مارچ سنہ ۱۸۶۵ ع کو لفٹننٹ گورنر پنجاب نے شام کے پانچ بجے ملکہ کے باغ میں ایک تعلیمی دربار کیا - اس میں دلی کالج کے اساتذہ و طلبہ اور دلی کے تمام ہائی اسکولوں کے مدرس اور متعلمین اور مضافات دہلی کے مدارس کے استاد اور طالب علم جمع ہوئے تھے - ہزآنر ' لارڈ بشپ کلکتہ ' کمشنر دہلی ' جنرل ایرنگٹن اور حکام صیغۂ تعلیمات نے ایک گشت لگایا ' مدارس کے طلبہ جو صف بہ صف کھڑے تھے انہیں دیکھا اور ہر مدرسے کے طلبہ و اساتذہ سے مختلف سوالات کئے اور سب کی ہمت افزا الفاظ میں دلجوی کی —

اس کے بعد ہزآنر تخت پر جلوہ افروز ہوے اور کمشنر دہلی نے زبان اردو میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی اور دربار کا مقصد بیان کیا - ان کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات کپتان فلر آر - اے اتھی اور انہوں نے ایڈریس پیش کیا - اس ایڈریس میں علوم مشرقیہ کی تعلیم اور دہلی کالج کے متعلق جو ذکر آیا ہے اُسے یہاں نقل کیا جاتا ہے :—

" انگریزی زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کی یوماً فیوماً
ترقی کی تو یہ کیفیت ہے (جو اوپر بیان ہوئی)
لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ علوم مشرقیہ کے طلبہ کے
وظائف بھی بڑھ رہے ہیں اور ان کو اور بڑھایا
جارہا ہے - ہمارے کالجوں میں عربی ' مشرقی ادبیات
کی بیخ و بنیاد ہے اور فارسی ہندوستانی (زبان)
کے ہاتھہ میں ہاتھہ لئے ہوئے الگ بڑھی چلی
جارہی ہے - ہمارے اینگلو ورنیکلر اور ورنیکلر مدارس
اس کام کو انجام دے رہے ہیں - جب طلبہ آگے
بڑھیں گے اور اعلیٰ جماعتوں میں آجائیں گے تو
ابوالفضل ' حافظ اور ظہوری جیسے فارسی ادیبوں سے
سرگوشیاں کریں گے ' اُن پر تنقید و تبصرہ کریں
گے اور ان کے کلام کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں گے —
دلی کالج کے طلبہ کو اگرچہ اب وظائف کی رقم
گذشتہ زمانے کے مقابلے میں جب وہ حکومت ممالک
شمالی مغربی کے تحت میں تھا ' نسبتاً چھوٹا حصہ
دی جارہی ہے لیکن اس کی بجاے تعلیم کی ایسی
ترغیبات موجود ہیں کہ طلبہ کی تعداد قدیم دلی
کالج کے متعلمین کے مقابلے میں چوگنی ہے - اس
سے میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ حکومت ممالک شمالی
مغربی کی کسی طرح اہانت کروں بلکہ در اصل بات
یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر کا دھکا اٹھانے کے

بعد تہذیب و شایستگی زندگی کے ہر شعبے میں نہایت
سرعت سے قدم بڑھا رہی ہے اور حکومت کا صرف
یہ ادعا ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کے قدم بقدم
چل رہی ہے"۔

سنه ۱۸۶۵ تا ۶۶ کی تعلیمی حالت

پرنسپل کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنه ۱۸۶۵ ع میں ایف۔اے کا نتیجہ اچھا نہ رہا۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ کسی پروفیسر کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ مسٹر ڈورن کی مساعی کے باعث میٹرک کا نتیجہ اچھا رہا۔ پرنسپل نے ماسٹر پیارے لال اور ساگر چند کی بھی بہت تعریف کی ہے —

سنه ۶۶ ع میں بھی یونیورسٹی امتحان کا نتیجہ اچھا نہ رہا۔ سبب وہی تھا کہ کوئی پروفیسر نہ تھا۔ انٹرینس میں ۱۷ میں سے چھ اور ایف۔اے میں چھ میں سے تین کامیاب ہوے —

اس سال کالج کے ایک طالب علم بھیروں پرشاد نے لاله وزیر سنگھ کے وظیفہ ریاضی (۱۲۰ روپے) کے لئے مقابلہ کیا اور سب امیدواروں میں کامیاب رہا —

امتحانات

جولائی سنه ۱۸۶۶ ع میں خانگی امتحانات میں گیارہ طالب علم سال اول کے دهلی اور لاہور سے بیٹھے۔ ان میں صرف چار طلبہ کامیاب ہوے وہ سب کے سب دهلی کے تھے۔ سال دوم کے ۱۴ طلبہ میں سے دلی کا ایک کامیاب رہا سال سوم میں آٹھ شریک امتحان ہوے۔ سالانہ امتحان میں سال اول میں سات طالب علم دلی کالج کے شریک ہوے، تین کامیاب رہے۔ سال سوم میں چار نے امتحان دیا، بھیروں پرشاد اول آیا —

کالج میں طلبہ کی چھیج

وظائف اس درجہ کم اور ان کے قواعد ایسے سخت ہوگئے تھے کہ طلبہ تعلیم جاری نہیں رکھہ سکتے تھے اور اس لئے کالج میں بڑی چھیج ہوگئی پرنسپل صاحب نے اس خطرے کو محسوس کرکے لفٹننٹ گورنر کو رپوٹ کی کہ اگر یہی لیل و نہار ہے تو پنجاب کے تمام کالج بیٹھہ جائیں گے - اس کے برعکس آگرہ اور بریلی میں حکومت صوبہ ہاے متحدہ بڑی فیاضی سے کام لے رہی تھی —

کالج کا اسٹاف

پروفیسر جارڈین Jardine نے دلی کالج میں دو ماہ لکچر دئے اور ۳۱ جولائی کو لاہور کالج کے پرنسپل ہوکر چلے گئے، اس کے بعد ممالک مغربی شمالی میں پروفیسر قانون ہوگئے - یہ بہت بڑے ریاضی داں اور ماہر مابعد الطبیعیات تھے - مسٹر کک بھی یکم مئی سنہ ۱۸۶۶ ع کو استعفا دیکر آگرہ چلے گئے اور وہاں ان کا تقرر پروفیسری پر ہوگیا - ان صاحبوں کے جانے کے بعد مسٹر ولمٹ اور مسٹر ڈورن جو دونوں السنہ و علوم مشرقیہ سے نابلد تھے، کام کرتے رہے - پرنسپل کو اس کی سخت شکایت ہے کہ کالج میں کوئی پروفیسر نہیں ہے اور لفٹننٹ گورنر کو کئی بار لکھا مگر کوئی توجہ نہ ہوی حالانکہ اب کالج میں پوری چار جماعتیں ہوگئی تھیں —

سنہ ۶۷ ع کی تعلیمی حالت

اس سال ایف - اے میں چار طالب علم شریک ہوے - دو دوسرے ڈویژن میں اور دو تیسرے ڈویژن میں کامیاب ہوے لیکن نند کشور طالب علم دوسرے ڈویژن میں پنجاب کے تمام طلبہ میں اول آیا - امتحانات کلکتہ یونیورسٹی میں ہوتے تھے، اس لئے نند کشور کو پنجاب کا اول انعام کو پر سلور میڈل ملا بی - اے میں دو شریک ہوے ایک نا کام رہا دوسرا فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا اور پنجاب کے تمام طلبہ

میں اول آیا - اس طالب علم کا نام بھیروں پرشاد تھا ' اسے آرنلڈ گولڈ مڈل ملا - یہ پہلا سال تھا کہ کالج سے بی - اے کے امتحان میں طلبہ شریک ہوے تھے —

کالج کی حالت پنجاب کے تمام کالجوں میں نتیجے کے اعتبار سے اول رہی —

گبنز سکالر شپ

مسٹر چارلس گبنز بیتھوس میجسٹریٹ و کلکٹر دہلی کی بیوہ نے اپنے خاوند کی یادگار میں گیارہ ہزار روپے دلی کالج کو دیے تاکہ مرحوم کے نام سے ایک وظیفہ قائم کیا جاے - مسٹر بیتھوس دلی میں چارلس گبنز کے نام سے مشہور تھے اس لئے اسکالر شپ کا نام گبنز اسکالر شپ رکھا گیا —

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ لاہور میں اورنٹیل یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں —

سنہ ۶۸ ع

مسٹر وائیٹ ۶ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع تک کالج میں رہے - ۹ مارچ کو مسٹر کک آگئے - مسٹر ولمٹ انسپکٹر مدارس انبالہ ہوکر چلے گئے - مسٹر ایلس نے کک صاحب کے آنے تک پرنسپلی کا کام کیا -

۲۵ مارچ سنہ ۶۸ ع کو میک نیل صاحب کمشنر دہلی کی صدارت میں کالج کے احاطے میں دربار ہوا - لفٹننٹ گورنر بھی رونق افروز تھے - ایسے طلبہ کو انعامات دے گئے جو اس سال امتحانات میں نام کے ساتھ کامیاب ہوے تھے اور ایسے حضرات کو خلعتیں اور تمغے ملے جنھوں نے دلی اور مضافات دہلی میں ترقی تعلیم میں کوشش کی تھی —

سنہ ۶۹ - ۱۸۶۸ ع

اس سال سریرام نے سیکنڈ ڈویژن میں امتحان میں کامیابی حاصل کی - حکم چند تمام کلکتہ یونیورسٹی کے

امتحان ایف ۔ اے میں پانچویں نمبر پر رہا ہو لڑکے اور کامیاب ہوے —

اینگلو سنسکرت اسکول

اس سال دلی میں ہندؤں نے اینگلو سنسکرت اسکول قائم کیا اس میں اردو کے ذریعہ تعلیم ہوتی تھی فارسی بھی اتنی پڑھائی جاتی تھی جتنی اردو کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اس کا دہلی کالج سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ یہ معلوم ہو کہ سنہ ۱۸۶۸ ع تک اردو زبان کس قدر مقبول تھی —

سنہ ۷۰ — ۱۸۶۹ ع

ننند کشور، شیو ناتھ نے بی ۔ اے میں کامیابی حاصل کی ۔ ایف اے میں پانچ طالب علم کامیاب ہوے ۔ مسٹر ایلس اس سال ڈاکٹر لائٹنز کی جگہ پرنسپل ہوکر لاہور چلے گئے —

اسٹنٹ پروفیسر سنسکرت

کالج میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام نہ تھا ہندو طلبہ اس وقت تک عربی لیتے تھے ۔ گزشتہ سال طلبہ نے بڑا غل مچایا تھا اور ایف ۔ اے کے ۲۱ طلبہ نے سنسکرت لی تھی ۔ چنانچہ ہیڈ پنڈت جی کو کالج میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے متعین کیا ۔ اس سال کالج کے ۲۵ طلبہ میں سے ۲۱ نے سنسکرت لی —

سنہ ۷۱ — ۱۸۷۰ ع

اس سال ایم ۔ اے کی جماعت بھی کھل گئی کالج کی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد یہ تھی :—

ایم ۔ اے	۱
بی ۔ اے سال چہارم	۵
سال سوم	۹
سال دوم	۱۷
سال اول	۲۱

حکم چند کلکته یونیورسٹی کے بی ۔ اے میں تمام یونیورسٹی میں دوم آیا - چھے طالب علم ایف - اے میں کامیاب ہوے - ایک درجۂ اول میں اور پانچ دوم میں —

سنه ۷۱ - ۱۸۷۰ میں تعداد طلبه یه تھی :—

ایم - اے	۱
سال چہارم بی - اے	۹
سال سوم	۸
سال دوم	۲۴
سال اول	۱۴

ایم - اے کے امتحان میں حکم چند کلکته یونیورسٹی میں اول آیا - سریرام بھی کامیاب ہوا - مدن گوپال' اچھوی داس بی - اے میں کامیاب ہوے —

غرض اس طرح یه کالج سنه ۱۸۷۷ م تک برابر چلتا رہا - اصل یه ہے که سنه ۱۸۶۴ ع سے جب یه غدر کے بعد سے دوبارہ کھلا تو زمانه دوسرا تھا - انتظام تعلیم میں نیا ورق اُلٹ چکا تھا ' ہر چیز کی تنظیم و ترتیب بالکل نئے سرے سے کی گئی ' دلی کالج کی جو خصوصیتیں اور جن پر اس کالج اور کالج کے اساتذہ اور اس کے خیر اندیشوں کو ناز تھا وہ باقی نه رہیں - اُردو زبان اور اردو تالیف و ترجمه کا چرچا رفته اُٹھ گیا اور زیادہ زور انگریزی پر دیا جانے لگا - کالج اگرچه بظاہر پنجاب یونیورسٹی سے ملحق تھا مگر طلبه اکثر کلکته یونیورسٹی میں امتحان دیتے تھے اس کی وجه یه تھی که پنجاب میں یونیورسٹی تو تھی لیکن وہ مسلمه نه تھی سنه ۱۸۸۱ ع یا سنه ۱۸۸۲ ع میں تسلیم کی گئی - کالج کے قدیم طالب علم جو چند سال پہلے زندہ باقی یا جو دو ایک صاحب باقی

ہیں سب کا بیان تھا کہ کالج سنہ ۱۸۷۷ ع تک اچھا خاصا چل رہا تھا کہ نہ معلوم گورمنٹ کے جی میں کیا آئی کہ اسے اپریل ۱۸۷۷ ع میں توڑ دیا اور اس کا سارا اسٹاف لاہور کالج میں بھیج دیا یعنی اس کالج کو لاہور کالج میں مدغم کردیا۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر جو گورمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اور پنجاب گورمنٹ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے وہ گورمنٹ کالج لاہور کو فروغ دینا چاہتے تھے، لفٹننٹ گورنر کا بھی یہ منشا تھا کہ صوبے کی تمام اچھی چیزیں سمٹ کر مرکز حکومت یعنی لاہور میں آجائیں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی اپنے عزیز کالج سے محروم ہوگئی اور سب اساتذہ اور طلبہ لاہور چلے گئے —

کالج ٹوٹنے کے بعد یہاں صرف اسکول رہ گیا دلی کالج کی جگہ مشن کالج نے لے لی یہ پہلے صرف ہائی اسکول تھا —

روسی ناول

پہلا دور

دوسرا باب

سر گے ئی تیمو فے یوچ اکساکوف

(۱۷۹۱ - ۱۸۵۹)

از

[جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی - اے (آکسن)]

ہم دیکھ چکے ہیں کہ "مردہ روحوں" کی حقیقت نگاری نے گوگول کو گویا ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا جہاں سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملا، اور ایک قیدی کی طرح جو آزادی کے لئے تڑپ رہا ہو وہ اپنے قید خانے کی دیواروں پر سر پٹک پٹک کر رہ گیا ۔ اس کے ہم عصر اکساکوف نے بھی حقیقت کو اتنی ہی تیز اور نکتہ بیں نگاہوں سے دیکھا، مگر اپنے آپ کو جان بوجھ کر کسی فریب میں مبتلا نہیں کیا، اور اس کی حقیقت نگاری خود اس کے اور دوسروں کے لئے تسکین اور تسلی کا ذریعہ اور امید کا ایک پیغام بن گئی جیسا کہ ایک اخبار نے اکساکوف کی تصنیف "ایک خاندانی داستان" پر تنقید کرتے ہوے لکھا تھا، اس وقت روسی انشا پردازوں میں وہی ایک ایسا تھا جس نے روسی زندگی کو محض نکتہ چینی کے لئے تختۂ مشق نہیں بنایا، بلکہ روسی سر زمین اور روسی رہن سہن سے سچے دل سے دلچسپی دکھائی اور محبت برتی - یہی اس کی عظمت

کا راز ہے - اکساکوف کی تصانیف مروجہ مذاق اور معیار کے مطابق ممکن ہے ناولیں نہ کہی جاسکیں، مگر جس زندگی کا ان میں خاکہ کھینچا گیا ہے، جو داستان وہ سناتی ہیں وہ لطف، دل کشی، حقیقت نمائی اور سبق آموزی میں بہترین ناولوں کا مقابلہ کرسکتی ہے - انہیں پڑھ کر روسی اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے بیزار نہیں ہوے، ان کی قوم اور قومی معاشرت سے اور گہرا تعلق ہوگیا، اس وجہ سے نہیں کہ اکسا کوف نے انہیں خود ستائی اور حیوانوں کے سے سکون و اطمینان کا سبق پڑھایا، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے ان کے دلوں میں محبت کے جذبے کو بیدار کیا اور اس جذبہ نے ان کی نظر کو برائی کے ساتھ اچھائی کا دیکھنا بھی سکھایا یورپ پرشک کرتے کرتے ان کے دلوں میں جو بے صبری اور بے اطمینانی کا طوفان برپا ہوا تھا اسے کسی قدر فرو کیا، اور روسی عینیت کے بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل مقصود کا راستہ بتایا -

اکسا کوف شہر اوفا، صوبۂ اورن برگ میں پیدا ہوا، اور اس نے کازان کے اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم پائی - تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ پانچ سال تک پیٹر برگ میں ملازم رہا، چند سال ماسکو پیٹر برگ اور اوفا کا چکر لگاتا رہا اور ۱۸۱۶ میں مستقل طور پر ماسکو میں سکونت گزیں ہوگیا انشا پردازی کا اسے لڑکپن ہی سے شوق تھا، لیکن اس کی نامور تصانیف کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہوچکی تھی - اس دوران میں اس نے متعدد مضامین لکھے اور کئی ڈراموں کے ترجمے کئے مگر ان میں اُن خوبیوں کا نام و نشان تک نہیں جنھوں نے اس کے بڑھاپے کی تصانیف کو اس قدر مشہور اور ہر دلعزیز کردیا - یہ معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے اگر ہم اکساکوف کی طبیعت پر غور کریں اور یاد رکھیں کہ انسان اپنا جوہر اس حالت میں دیکھا سکتا ہے

جب وہ اپنی تخلیقی کوششوں میں اپنی پوری شخصیت کو محو کرسکے
اکسا کوف طبعاً نہائت درجہ نیک دل ' خوش اخلاق اور محبت کرنے
والا تھا ' ادبی شہرت حاصل کرنے سے پہلے اس نے ہزارھا لوگوں کو
اپنی شریفانہ سیرت اور دوستانہ سلوک کا گرویدہ کرلیا تھا - مضامین اور
ترجمے اُس کی شخصیت کی تاثیر سے محروم رھے ' مگر وہ اپنے بچپن کے
حالات اور خاندان کی سر گذشت سنانے بیٹھا تو وہ تمام صفتیں جنھوں
نے ماسکو کے ہر بھلے آدمی کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا اس کی تصانیف میں
ایک ساتھہ ظاہر ھوتیں ' اور ادبی دنیا میں اس کا وھی مرتبہ ھوگیا
جو دوستوں کے حلقے میں تھا یہ مچھلی کے شکاری کا روز نامچہ ۱۸۴۷ ع
میں شائع ھوا ' " صوبۂ اورن برگ کے شکاری کا روز نامچہ " ۱۸۵۲ میں
اس کے تین سال بعد " شکاری کے قصے اور تذکرے " تینوں کتابوں کی بہت
جلد کئی اشاعتیں نکل گئیں ' اور جب ۱۸۵۶ میں اکسا کوف نے " خاندانی
داستان " کے ابواب کی اشاعت شروع کی تو اس کا روس کے ادبی
مشاھیر میں شمار ھونے لگا تھا ' اور تعلیم یافتہ روس اس کے فریفتہ
ھوچکے تھے —

ان تصانیف میں اکسا کوف کا اِرادہ اپنی طبیعت کا جوھر یا اپنی آنشا
پردازی کے کرشمے نہیں دکھانا چاھتا تھا - اسے بڑھاپے میں اپنا بچپن یاد آیا اور
اپنے لڑکپن اور جوانی کی دلچسپیاں : وہ لوگ یاد آئے جن کی محبت میں
وہ پلا تھا اور اس طرح اس کی نظر ایک نسل سے دوسری تک دوڑ گئی
جو کچھہ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ جیتی جاگتی تصویروں کی طرح پھر
اس کے سامنے آگیا ' اور اس کے قلم نے بڑے شوق سے صفحہ کاغذ پر ان
کا سچا نقشہ کھینچ دیا - اکسا کوف کے بیان سے سادگی اور خلوص ٹپکتا

ہے ' اور ان کی رونق اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان مناظر اور انسانوں کی تصویروں میں جو وہ دکھاتا ہے اپنی طرف سے کچھ گھٹاتا بڑھاتا نہیں اور اس اصول پر استقلال سے عمل کرتا ہے کہ سچی بات اور سچی تصویر میں رنگ آمیزی کی حالت نہیں ہوتی ۔ پہلی دو تصانیف میں اس نے اپنے وطن کے مناظر قدرت ' اس کی فضا ' اس کے حیوانات و نباتات کا ذکر کیا ہے ۔ اسے اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی ' ایسی گہری اور سچی محبت کہ وہ اس کی تصانیف کا ایک جزو بن گئی اور پڑھنے والے کو فوراً اپنی تاثیر سے مسحور کر دیتی ہے ۔ اسی طرح " خاندانی داستان " میں جن لوگوں کی سرگزشت سنائی گئی ہے ان سے اکساکوف کو محبت تھی ' وہ ان کی برائی بھلائی سب دیکھتا اور دکھاتا ہے ' مگر وہ ہر حالت میں انہیں اپنا سمجھتا ہے اور جو محبت اپنوں سے کرنا چاہتے اسے ہمیشہ برتتا ہے ۔ پڑھنے والے کو بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہوتا ہے ' اکساکوف کے عزیز اس کے عزیز بن جاتے ہیں ' ان کی بری حرکتیں اور خصلتیں اس کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرتی ہیں ' کیونکہ اکساکوف سے وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے کہ خطاؤں سے در گزر کرنا نفرت کرنے سے بہت بہتر ہے ' اور اگر اس کے دل میں ذرا بھی محبت کا مادہ ہے تو وہ محسوس کرلیتا ہے کہ محبت کا یہی تقاضا ہے ۔ اکساکوف کے عزیز ان لوگوں سے کسی صورت سے مختلف یا بہتر نہیں ہیں جن سے " مردہ روحوں " میں چچکوف بیوپار کرتا ہے ' لیکن اکساکوف کی انسانی ہمدردی اور محبت نے دونوں کتابوں کی روح اور ان کی تاثیر میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا ہے —

" خاندانی داستان " روسی طرز معاشرت کی بہت ہی صحیح اور سچی

تصویر ہے ' اس لئے ذیل میں اس کے چند اقتباس دئے جاتے ہیں : کہانی سنانا اکسا کوف کا مقصد نہیں تھا ' اس داستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے مگر مصنف کی انشا پردازی کے کمال نے روز مرہ زندگی کو ایک دل ربا کہانی کا رنگ روپ دیدیا ہے اور ہمیں وہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے —

" خاندانی داستان " کا قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اکسا کوف کے دادا نے خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہوکر اپنا وطن چھوڑ دیا اور صوبۂ اورن برگ میں ' شہر اوف سے کوئی دھاتی سو میل کے فاصلہ پر زمین خریدی اور گانو آباد کرلیا . یہ جگہ نہایت خوبصورت اور یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی ' کسان اور زمیندار دونوں اپنے وطن کو بہت جلد بھول بھال گئے اور نئی بستی میں زندگی بسر کرنے لگے . پھر بھی گانو کے گانو کو ایک بستی سے لے جاکر اور کئی سو میل کا سفر کرکے کسی دوسری جگہ آباد کرنا ہمت کا کام تھا ' اور ستیپان میخائلووچ ' اکسا کوف کے دادا کو کامیابی زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے دنیا سے نرالی طبیعت پائی تھی اس کے اسامی اس سے ڈرتے بھی تھے ' اور محبت بھی کرتے تھے " وہ قرب و جوار کے تمام لوگوں کے سچے محسن تھے ... ان کے لبالب بھرے ہوے کٹھیاروں کے لئے کھلے تھے ' جس کا جو جی چاہتا لے سکتا تھا ... وہ ایسے سمجھدار تھے ' دوسرے کی خواہشوں اور ضرورتوں کا اتنا لحاظ کرتے تھے ' اپنے قول کے اتنے پکے تھے کہ بہت جلد ان لوگوں کی نظر میں جو وسیع صوبۂ اورن برگ کے ایک کونے پر آباد ہوئی تھی علم و دانشمندی کا مجسمہ بن گئے وہ اپنے ہمسایوں کو مدد پر پہنچانے کے علاوہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتے تھے ... جس نے ایک بار جھوٹ بولا '

ایک بار دھوکا دیا اس کی خیریت اسی میں تھی کہ پھر وہ ان کو اپنا منھہ نہ دکھائے : کیونکہ تب صرف یہی اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ خالی ہاتھہ واپس جائے گا ' بلکہ اگر وہ الٹے پیروں بھاگ کر اپنی جان بچالیتا تو بھی سمجھنا چاھئے تھا خدا نے اس کے حال پر رحم کیا - ستیپان میخائلووچ نے بہت سے خاندانوں کے جھگڑے طے کئے ' ھزا رھا فتنوں کو سر اٹھا تے ھي کچل دیا .....

میں نے * لوگوں کی زبانی ——— ان کی بہت سی باتیں سنی ھیں ' بعض معمولی ' بعض ایسی جنھوں نے دل پر بہت گہرا اثر کیا ' اور جن کو سنا تے وقت لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے ......

" اس نیک دل فیاض اور با مروت شخص پر کبھي کبھی غصے کا بھوت ایسا سوار ھوتا تھا کہ اس کے چھرے پر انسا نیت کی علامتیں باقی نہیں رھتی تھیں ' اور اس وقت وہ نہایت درجہ بے رحم اور نفرت انگیز حرکتوں پر اتر آتا تھا - میں نے اپنے بچپن میں انھیں اس حالت میں دیکھا تھا ... اور میرے دل پر خوف *کا نقش ابھي تک تازہ ھے ' ان کی صورت ھو بھو میرے سامنے آجاتی ھے : وہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی پر خفا ھوئے تھے ' غالباً اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولی تھی اور دھوکا دینے کی کوشش میں پکڑي گئی تھی : دو آدمی دادا کی بغل میں ھاتھہ ڈالے ھوئے انھیں

---

* اکساکوف نے " خاندانی داستان " کی پہلی اشاعتوں کی تمھید میں لکھا تھا کہ یہ اس کے اپنے خاندان کا قصہ نہیں ھے اس خیال سے کہ شائد جن لوگوں کا اس میں ذکر آیا ھے ان کے عزیزوں کو کوئی شکایت ھو مگر ' اس داستان میں واحد متکلم کا صیغہ اکساکوف نے اپنے لئے استعمال کیا ھے —

تھاسے تھے ؛ انھیں دیکھ کر میں مشکل سے کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے دادا ھیں ؛ وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے ' چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی ' ان کی آنکھوں سے ھیبت ناک شعلے نکل رہے تھے ' غصے سے انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا - وہ چلا رہے تھے - " اسے یہاں پکڑ لاؤ ! " اور ان کی آواز سے معلوم ھوتا تھا کوئی ان کا گلا گھونٹ رھا ھے ... میری دادی چاھتی تھیں کہ ان کے پیروں پر گر کر مجرمہ کی طرف سے معافی مانگیں ' لیکن ایک لمحے میں ان کے سر سے رومال * اور ٹوپی غائب ھوگئی اور ستیپان میخائلووچ نے اپنی چھوٹی موٹی بوڑھی اور ضعیف † ارنیا وسیل یفنہ کے بال پکڑ کر انھیں جھنجھوڑ ڈالا - اس درمیان میں صرف مجرمہ ھی نہیں بلکہ اس کی اور سب بہنیں ' بھائی اور بھاوج مع اپنے بچے کے سب گھر سے نکل بھاگے ' اور ایک کنج میں جو مکان کو چاروں طرف سے گھیرے تھا جاکر چھپ رہے ؛ رات کو سب وھیں سوئے ؛ صرف دادا کی نوجوان بھو اپنے بچے کو وھاں سے لیکر چلی آئیں اور اس اندیشے میں کہ کہیں بچے کو سردی نہ لگ جائے نوکروں کی ایک کوٹھری میں رات گذاری - میرے دادا میدان اور خالی مکان میں بہت دیر تک دھاڑتے گرجتے رہے ' آخر کار وہ تنہائی ‡ چیونک اور مازان کو ٹھوکتے ٹھوکتے اور ارنیا وسیل یفنہ کے جھونٹے نوچتے نوچتے تھک گئے

---

* پرانی روسی وضع کے مطابق بال بھی ستر میں شامل تھے اور عورتیں سر کو ھمیشہ ایک رومال سے ڈھکے رھتی تھیں جو ٹھڈی کے نیچے گرہ دے کر قائم رکھا جاتا تھا - اس کے نیچے بعض عورتیں ایک تنگ ٹوپی بھی پہنتی تھیں —

† اکساکوف کی دادی کا نام ھے —

‡ نوکروں کے نام —

اپنے پلنگ پر بے ہوش کر پڑے اور دوسرے دن صبح تک گہری نیند سوتے رہے۔ سو کر اٹھے تو چہرہ صاف اور روشن تھا' بڑی خوشی کے لہجے میں اپنی اریشا (اریڈنا وسیل یفنہ) کو پکارا' اور وہ پاس کے کمرے سے فوراً دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار ایسے نمایاں تھے کہ گویا کل کچھہ ہوا ہی نہیں تھا۔ پچھلے دن کے دیوانے نے سو کر اُٹھتے ہی کہا "چائے لاؤ! بچے کہاں ہیں' اور الکسئی * اور میری بہو † ؟ لاؤ' سھریوژا ‡ ادھر لاؤ!" کو اور بہو پوتے کے سوا گھر بھر میں سب خوش اور مطمئن یکے بعد دیگرے ستیپان میخائلووچ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی بہو بھی نازک مزاج اور ضدی تھی۔ اس کی لاکھہ خوشامد کی گئی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی کہ جس شخص نے پچھلے کل ہی ایک درندے کی خاصیتیں اختیار کرلی تھیں اس سے آج میل کر لے... اس کی طبیعت کچھہ واقعی ناساز معلوم ہوتی تھی' اس لئے اس نے کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں اور اپنے بچے کو بھی نہیں جانے دیا۔ سب پر خوف طاری ہو گیا' سب سمجھے کہ کل کا سا حشر پھر برپا ہوگا۔ لیکن کل کا درندہ سو کر اٹھا تو آدمی تھا... چائے کے بعد ... خسر خود بہو کے پاس گئے... اس کے پلنگ پر بیٹھہ گئے' اسے گلے لگایا' پیار کیا'... پوتے کو بھی خوب پیار کیا اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ "بہو کے بغیر تو زندگی بے مزہ ہو جائے گی" آدھے گھنٹے کے بعد ان کی بہو' ایک پرتکلف شہری وضع

---

* ستیپان میخائلووچ کے بیٹے' اکساکوف کے باپ کا نام در اصل الیسے تیمو فیےئی ہونا چاہئے —

† مصنف کی ماں۔ ‡ خود مصنف —

کا جوڑا پہنے ... اور بچے کا ہاتھ پکڑے ان کے کمرے میں آئی. دادا اس سے مخاطب ہوے تو آنکھوں میں آنسو بھر آے. انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا. "دیکھو بہو نے اپنی بیماری کا خیال نہیں کیا، اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے پہن کر مجھ بوڑھے کا جی خوش کرنے آئی ہے."
نندوں نے ہونٹ چباکر نظریں نیچی کر لیں. انہیں سب کو اپنی بھاوج سے بالکل محبت نہیں تھی. بہو نے احترام اور مسرت سے خسر کی شفقت کا جواب دیا، اور اپنی بد خواہوں کو فخر اور فتح مندی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی..."

یہ ستیپان میخائلووچ کا برا دن تھا. معمولاً ان کے دن اچھے ہوتے تھے. اچھے دن کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

" دادا سوکر اٹھے اور ... مسہری سے سر نکال کر قہقہہ لگایا؛ کیوں کہ مازان اور تنمائی چیونک ایک عجیب مضحک انداز سے زمین پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑے خراٹے لے رہے تھے. دادا نے کہا "دیکھو یہ کتے کے پلے کیسے خراٹے لے رہے ہیں!" اور پھر مسکرائے - ان کی طبیعت بھی ایک معمہ تھی - ایسے سخت الفاظ استعمال کرنے کے بعد انہیں چاہئے تھا کہ سوتوں کی پسلیوں میں اپنا ڈنڈا جو ہمیشہ ان کے پلنگ کے پاس کھڑا رہتا تھا بھونک دیں یا ان کے ایک لات لگائیں یا ان پر کرسی دے ماریں لیکن وہ ہنس کر رہ گئے وہ اچھی طرح سے سوئے تھے، اور ان کے مزاج میں دن بھر خوش رہنے کا سامان تھا ... انہوں نے خاموشی سے اٹھ کر دو چار دفعہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اپنے بادامی رنگ کے سلیپر پیر میں ڈالے اور موٹے سن کے کپڑے کی دیہاتی وضع کی قمیص پہنے (باریک بنا ہوا کپڑا دادی انہیں قمیصوں کے لئے کبھی نہیں دیتی تھیں) جاکر برساتی میں کھڑے ہوگئے - وہاں صبح کی تازگی اور طراوت نے نہایت دل پذیر طریقے سے ان کا استقبال کیا - میں نے ابھی کہا تھا کہ ارنیا وسیل لفیہ ستیپان میخائلووچ کو باریک کپڑا قمیصوں کے لئے نہیں

دیتی تھیں، اور ہر شخص اعتراض کرسکتا ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتیں دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا ... لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے، عورت کی فطرت اس معاملے میں بھی مرد پر فتحیاب ہوئی! میری دادی نے موٹے کپڑے کے پیچھے کئی دفعہ مار کھائی مگر وہ قمیص موٹے کپڑے ہی کی بناتی رہیں اور آخر کار دادا کو اس کی عادت ہوگئی - ایک بار تو انھوں نے نہایت ہی موثر اور اپنے نزدیک انتہائی تدبیر اختیار کی: یعنی تمام موٹے سن کے سوت کے بنے ہوئے کپڑے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر رکھے اور کلھاڑی سے کاٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردئیے - میری دادی روتی پیٹتی رہیں، دادا سے التجا کرتی رہیں کہ " مجھے مارلو مگر اپنی چیز نہ برباد کرو " دادا نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ... مگر یہ تدبیر بھی نا کامیاب رہی پھر انھیں ویسے ہی موٹے کپڑے ملنے لگے اور آخر کار انھوں نے ہار مان لی ... دادا کے "اچھے دن" کی داستان کا سلسلہ توڑنے کی معافی چاہتا ہوں ... خیر اب آگے سنئیے - دادا بغیر کسی کو بلائے خود ہی جاکر اپنا نمدے کا سوئیٹر اسباب کی کوٹھری سے، جہاں وہ ہمیشہ رکھا رہتا تھا، لے آئے اسے برساتی کی پہلی سیڑھی پر بچھایا اور اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گئے کہ سورج کو نکلتے ہوئے دیکھیں - طلوع آفتاب کے وقت ویسے بھی انسان کا دل آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے اس کے علاوہ میرے دادا کو سویرے اٹھ کر اپنے گھر بار کی ہر چیز پر نظر ڈالنے میں لطف آتا تھا، اور ان کے یہاں اس زمانے کے لحاظ سے زندگی کی تمام ضروریات مہیا تھیں ... پھر دادا کا ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوکر چائے پینے کو دل چاہا، اور انھوں نے اپنے خادموں کو جو بے تکے طریقے سے سو رہے تھے جگایا - خادم دیوانوں کی طرح خوف سے اچک کر کھڑے ہوگئے، مگر ستیپان میخائلووچ کی خوش و خرم آواز نے پھر ان کی جان

میں جان ڈال دی: "سازان' منہ دھونے کا پانی لاؤ! تنائی چیونوک' اکسیوتکا *
اور بی بی کو جگاؤ! - اور چائے لاؤ!" ان حکموں کے دھرانے کی ضرورت نہ
تھی بے ڈول سازان چشمے سے پانی لانے کے لئے چمکتی ہوئی پیتل کی چلمچی لے
کر سرپٹ بھاگا؛ پھرتیلے تنائی چیونگ نے بد صورت' نوجوان اکسیوتکا کو
اٹھایا - وہ اپنے سر پر رومال ٹھیک کرتی ہوئی گئی اور بوڑھی موٹی بی بی
ارنیا وسیل نفیہ کو جگا آئی . چند منٹ میں گھر بھراٹھہ کھڑا ہوا اور سب کو
معلوم ہوگیا کہ بڑے میاں خوش خوش اُٹھے ہیں. پندرہ منٹ کے اندر برساتی
میں ایک میز بچھہ گئی' اس پر ایک سفید گھر میں بنے ہوے کپڑے کی
چادر لگا دی گئی' ایک بہت بڑے پیتل کے چائدان نما سماوار میں چاے
اُبلنے لگی' اور میز کے گرد اکسیوتا مختلف کاموں میں مشغول ہوگئی.
بوڑھی بی بی ارنیا وسیل نفیہ اور ستیپان میخا ئلووچ نے ایک دوسرے
کی مزاج پرسی کی. بوڑھی بی بی کے لئے اور دونوں کی طرح آہ
نہ آہیں بھرنا ضروری تھا نہ کانکھنا' انہوں نے بلند آواز اور خوشی
کے لہجے میں دادا کا مزاج پوچھا اور کہا: "کہئے کوسی نیلہ آئی
کیا کیا خواب دیکھے؟" دادا نے بڑی شفقت سے اپنی بیوی کا مزاج پوچھا
اور پیار میں انہیں اریشا کہہ کر پکارا وہ ان کے ہاتھہ کبھی نہیں چومتے
تھے' بلکہ عنایتاً اپنا ہاتھہ چومنے کے لئے دیتے تھے - اریلنا وسیل نفیہ
پھول کی طرح کھل گئیں' چہرے پر جوانی کا رنگ آگیا: کہاں گیا اب ان
کا موٹاپا' ان کا بے ڈھنگا پن! وہ جلدی سے اسٹول لائیں اور برساتی میں
دادا کے پاس بیٹھہ گئیں اس کی انہیں کبھی ہمت نہ ہوتی اگر دادا

---

* خادمہ کا نام -

پیار سے نہ پیش آئے ہوتے دادا نے کہا آؤ اریشا ' گھر میں ہونے سے پہلے چائے پی لیں - رات کو حبس تو تھا مگر میں ایسی گہری نیند سویا کہ خواب تک نہیں دیکھا - ہاں اور تم ؟ یہ سوال ایک غیر معمولی پیار کی نشانی تھا اور ارینا وسیل نفیہ نے جلدی سے جواب دیا کہ " جس رات کو ستیپان میخا ئلووچ اچھی طرح سوتے ہیں مجھے بھی خوب نیند آتی ہے ' مگر تانیوشا * نے رات کچھ بے چینی سے گذاری - تانیو شا سب سے چھوٹی لڑکی تھی ' اور جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے ' بوڑھے باپ کو وہ اور لڑکیوں سے زیادہ عزیز تھی - وہ یہ خبر سن کر کچھ پریشان ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ جب تک لڑکی خود سے نہ اٹھے اسے کوئی نہ جگانے پائے - تتیا نہ ستیپانو فنہ اپنی بہنوں الک ندرا اور ایلی زاوتیا ستیپانو فنہ کے ساتھ جگادی گئی تھی ' اور کپڑے پہن کر تیار بھی ہوچکی تھی ' مگر دادا سے یہ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی - تانیوشا پھرتی سے کپڑے اتار کر پھر پلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکیاں سب بند کرادیں - اُسے نیند تو نہیں آئی ' مگر دو گھنٹے اندھیرے میں لیٹی رہی ' دادا کو اطمینان ہو گیا کہ تانیوشا جی بھر کر سو لی ہے - دادا کا اکلوتا لڑکا جو کوئی نو سال کا تھا ' کبھی سویرے جلدی نہیں جگایا جاتا تھا - بڑی لڑکیاں تھوڑی دیر بعد حاضر ہوئیں . ستیپان میخا ئلووچ نے شفقت سے انھیں ہاتھ چومنے کو دیا ' ایک کو لز انکا † کہہ کر پکارا ' دوسری کو لکسانیہا ‡ . دونوں بڑی ہوشیار تھیں . الک ندرا کی طبیعت میں چالاکی کے ساتھ باپ کی تیزی اور تنک مزاجی تھی ' مگر باپ کی اچھی صفتیں اس

---

* تتیا نہ کا مخفف —

† ایلی زاویتا کا مخفف — ‡ الک ندرا کا مخفف —

میں نہیں تھیں ، دادی بہت ھی سیدھی ساھی عورت تھیں ، اور ان کی لڑکیاں ان پر بالکل حاوی تھیں ، اگر وہ ستیپان میخائلووچ سے چالاکی کرنے کی ھمت کرتیں تو محض لڑکیوں کے سکھانے سے اور اپنی سادگی کی وجہ سے اکثر انھیں اس کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی، ستیپان میخلووچ کو یہ بخوبی معلوم تھا ، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب کبھی موقع ملا انھیں دھوکا دینے پر تیار ھو جاتی ھیں ، جب ان کا مزاج ٹھیک ھوتا تو ... صرف بکھیڑے سے بچنے اور اپنا سکون قلب قائم رکھنے کے لئے وہ ایسی باتیں کرتے کہ لڑکیاں سمجھتیں کہ ان کو بیوقوف بنا رھی ھیں ، لیکن جہاں انھیں غصہ آیا وہ لڑکیوں کو بے تکلف خوب کھری کھری سناتے بلکہ کبھی مار بھی بیٹھتے تھے ، مگر لڑکیاں پوری حوا کی بیٹیاں تھیں ، وہ کبھی باز نہ آئیں ، غصے کی گھڑی گزری اور دادا کی پیشانی کے بل دور ھوے کہ وہ پھر دھوکا دینے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگتیں جن میں وہ اکثر کامیاب بھی رھتی تھیں ، —

چائے پی کر اور بیوی بیٹیوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے دادا کھیتوں کے معائنے کے لئے چلدئے ... باوجود گرمی کے وہ دوپہر تک گاڑی پر چڑھے گھوما کئے جیسے ھی دادا کی گاڑی پہاڑی پر سے اترتی نظر آئی کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سارا خاندان ان کے استقبال کے لئے کھڑا ھوگیا ... کھانے پر سب بہت خوش تھے ... سب بلند آواز میں باتیں کرتے ، مذاق کرتے ، ھنستے رھے ... کھانے کے بعد دادا فوراً سونے کے لئے لیٹ گئے ... اور بہت جلد ان کے خراٹوں کے شور و غل کو سن کر سب سمجھہ گئے کہ صاحب خانہ سورماؤں کی نیند سو رھے ھیں سب اپنی اپنی جگہ پر آرام کرنے چلے گئے سازان اور تمانی چیونک بھی ... دادا کی خوابگاہ

کے دروازے کے سامنے دراز ہوگئے ... نیند اور کرسی سے ان کا گلا سوکھ گیا تھا ان کا جی چاہتا تھا اپنے آقا کی طرح بیر میں خوب برف ڈال کر پئیں اور حلق تر کرلیں ۔ دیکھئے ان ڈھیٹھ چھوکروں نے کیسی ترکیب سوچی ' دادا کی خواب گاہ کا دروازہ کچھ کھلا تھا ' وہ کمرے میں جاکر ان کی ٹوپی اور چوغا لے آئے جو دروازے کے پاس ہی کرسی پر رکھا تھا ۔ تناتی چیونک آقا کے کپڑے پہن کر برساتی میں بیٹھ گیا ... سازان جگ لے کر تہ خانے بھاگا ہوا گیا اور خادمہ کو جگا کر صاحب خانہ کے لئے ٹھنڈی بیر طلب کی ' خادمہ نے جب شک ظاہر کیا کہ صاحب خانہ واقعی اٹھے بھی ہیں تو سازان نے اسے تناتی چیونک کی طرف اشارہ کردیا ' جو چوغا اور ٹوپی پہنے برساتی میں بیٹھا تھا ' بیر انڈیل دی گئی ' اس میں برف ڈال دی گئی ' اور سازان مال غنیمت لے کر چلتا ہوا ' دونوں لڑکوں نے ایک ہی جگ سے پی کر پھر چوغا اور ٹوپی پرانی جگہ پر رکھ دیا ... دادا اٹھے تو صبح سے بھی زیادہ خوش و خرم تھے اور اٹھتے ہی ٹھنڈی بیر مانگی ... نوکروں کے دھوکے کا راز فاش ہوگیا ' سازان اور تناتی چیونک خوف سے لرزتے ہوئے آقا کے قدموں پر گر پڑے ' اور آپ کیا سمجھتے ہیں دادا نے کیا کیا ؟ ... انھوں نے قہقہہ لگایا ' اپنی بیوی اریشا اور وہ لڑکیوں کو بلا بھیجا اور خوب زور سے ہنس ہنس کر اپنے نوکروں کی چالاکی کا قصہ سنایا ...

دادا سہ پہر کو پانچ بجے اٹھے تھے اور ٹھنڈی بیر کے بعد باوجود

---

* لفظی معنی میں " کنجی والی " وہ خادمہ جس کے پاس گودام وغیرہ کی کنجیاں رہتی تھیں ۔

سخت گرمی کے انہیں چائے پینے کی خواہش ہوئی، اس خیال سے کہ گرمیوں میں گرم چیز پینے سے طبیعت کا بھاری پن، کم ہوجاتا ہے البتہ درمیان میں وہ جاکر بوگورسلان دریا کے ٹھنڈے پانی میں نہا آئے، جو گھر کی کھڑکیوں کے نیچے سے بہتا تھا - واپسی پر انہیں سارا خاندان اس سویرے والی چائے کی میز کے پاس ان کا انتظار کر رہا تھا - چائے کی میز سائے میں رکھی تھی، اس چائدان نما سماوار میں چائے ابل رہی تھی اور وہی خادمہ اکسیوتکا موجود تھی - دادا نے اپنا مرغوب پسینہ لانے والا گرم پانی جی بھر کر پی لیا ... اور تب سیر کے لئے پن چکی پر جانے کی تجویز پیش کی - ظاہر ہے سب بڑی خوشی سے راضی ہوگئے ..."

" شام ہوئی تو ستیپان میخائلووچ نے کہا: " اریشا، اب گھر واپس ہونے کا وقت آگیا: گھر پر غالباً مکھیا میرا انتظار کر رہا ہوگا " ... ستیپان میخائلووچ کا اندازہ غلط نہیں تھا: برساتی میں کانوں کا مکھیا ان کا راستہ دیکھ رہا تھا، اور صرف اکیلا نہیں بلکہ کئی کسانوں اور عورتوں کے ساتھ مکھیا دادا کو پہلے دیکھ چکا تھا، اس نے پہچان لیا کہ ان کی طبیعت خوش ہے اور کسانوں میں سے کسی کو یہ خبر سنادی: بعضے جنہیں کوئی غیر معمولی درخواست کرنی تھی - اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپہنچے، اور سب کی خواہشیں اور حاجتیں پوری کردی گئیں ... صرف یہ نہیں بلکہ سب کو ایک چاندی کے پیالے بھر ... گھر کی بنی ہوئی زوردار شراب بھی ملی ... رات اور دن کے کھانے میں بہت کم فرق تھا، اور غالباً اس وقت سب نے اور زیادہ پیٹ بھر کر کھایا، اس وجہ سے کہ گرمی کم تھی - رات کا کھانا کھا کر ستیپان میخائلووچ نے خاندان کو آرام کرنے کے لئے بھیج دیا اور خود حسب معمول فقط قمیض پہنے

برساتی میں جاکر رات کی خنکی کا لطف اٹھانے کے لئے بیٹھہ گئے " -

" خاندانی داستان " میں ستیپان میخائلووچ کے وطن سے ھجرت کرکے نئی بستی میں آباد ھونے اور ان کے اچھے اور برے دنوں کی سر گذشت سنانے کے بعد ان کی چچیری بہن اور ان کے اپنے لڑکے الکسئی ستیپانووچ کی شادیوں کا تذکرہ کیا گیا ھے - ستیپان میخائلووچ کو اپنی چچیری بہن پراسکوویا اوانوفنہ بہت عزیز تھی ' اور چونکہ اس کے والدین کا انتقال ھوچکا تھا اور اس کی نانی کا ستیپان میخائلووچ کو زیادہ اعتبار نہ تھا اس لئے وہ پراسکوویا اوانوفنہ کو زیادہ تر اپنے ھی ساتھہ رکھتے تھے - ستیپان میخائلووچ سے سب بہت ڈرتے تھے ' لیکن اس کے باوجود خاندان کی عورتوں نے مل کر ان کی مرضی کے خلاف پراسکوویا اوانوفنہ کی پندرہ برس کی عمر میں میخائل ماکسی‌مووچ‌کوروے‌موف نامی ایک فوجی افسر سے شادی کرادی - پراسکوویا اوانوفنہ کو ورثے میں کئی گاؤں ملنے والے تھے - اور اس سے شادی کر لینا قرب و جوار کے تمام نوجوانوں میں بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی - ظاھر ھے اس سے شادی کرنے کے بہت سے امیدوار تھے ' صرف اس کی نوعمری کی وجہ سے سب نے اس کی کوشش ملتوی کر رکھی تھی - اتفاق سے کوروے‌موف ' جس کی پراسکوویا کے ننھیال کے قریب کچھہ زمین بھی تھی ملازمت سے چند مہینوں کی رخصت لے کر اپنے گانو آیا - پراسکوویا کے ورثے کی خبر سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا ' اور اس نے اس کی عمر کا لحاظ کئے بغیر اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی . وہ آدمی بہت ھوشیار اور تجربہ‌کار تھا ' دو چار ملاقاتوں کے بعد ھی پر اسکوویا کی نانی کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ وہ اس سے پراسکوویا کا نکاح کرنے پر آمادہ ھوگئیں اور کوروليوف

کو ستیپان میخائلووچ اور ان کے خاندان سے رضا مندی لینے کے لئے ان کے گاؤں بھیجا. ستیپان میخائلووچ کی بیوی اور لڑکیوں کورولیوف بہت پسند آیا. لیکن ستیپان میخائلووچ کو صورت دیکھتے ہی اس سے نفرت ہوگئی' اور اس کا انھوں نے بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیا. ان کی بیوی اور لڑکیوں نے سمجھ لیا کہ وہ اسے اپنا بہنوئی بنانے پر کبھی راضی نہ ہوں گے' لیکن ان کی ضد میں' اور کچھ اس لئے کہ کورولیوف انھیں واقعی بہت معقول آدمی معلوم ہوتا تھا انھوں نے پراسکوویا کی نانی سے مل کر سازش کی' اور چند مہینے بعد جب ستیپان میخائلووچ کسی ضرورت سے ماسکو چلے گئے تو انھوں نے پراسکوویا کا کورولیوف سے نکاح کرا دیا. پراسکوویا بہت سیدھی سادی نیک دل لڑکی تھی اور پہلے پہل کورولیوف کا ان کے ساتھ سلوک بھی اتنا اچھا تھا کہ انھیں اس سے گہری محبت ہوگئی. مگر کچھ سال بعد کورولیوف کا چال چلن بالکل بگڑ گیا: اس لئے پراسکوویا کے لئے اس کے ایک گاؤں میں بہت عالی شان مکان بنا دیا جہاں وہ بیچاری اکیلی پڑی رہتی تھی' اور خود دوسرے گانو میں عیاشی شراب خواری میں مصروف رہتا تھا: رعایا اس کے ظلم سے نالاں تھی' جان پہچان کے لوگ اس کی ساری بد کاریوں سے واقف تھے' مگر پراسکوویا کو اس کی طرف سے کچھ ایسا حسن ظن ہوگیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتی تھی. آخر کار اس کی نوبت آئی کہ اسے بھی شک ہوگیا اور اپنے شوہر کو اطلاع دئے بغیر وہ اس گانو میں پہنچ گئی جہاں وہ رہتا تھا. وہاں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں' وہ چاہتی تھی کہ کورولیوف کو منتظم کے عہدے سے معزول کر دے. لیکن کورولیوف نے اسے ایک تہ خانے میں بند کر دیا' اور ستیپان میخائلووچ اس حادثے کی خبر سن کر وقت پر پہنچ نہ گئے ہوتے تو غالباً وہ وہیں بھوکوں مر جاتی. ستیپان میخائلووچ اسے

چھڑا لاے ' اور چند دن کے بعد ھی خبر ملی کہ کورولیوت مرگیا :

الکسئی * ستیپا نووچ کی شادی کا قصہ اس سے بہت زیادہ دلچسپ اور ستیپان میخائلووچ کی شخصیت کا ایک اور پہلو دکھاتا ھے جو درحقیقت حیرت انگیز ھے ۔ الکسئی ستیپا نووچ کچھہ سال فوج میں ملازم رھنے کے بعد شہر اوف میں وکالت کرنے لگے ۔ یہاں وہ سوفیانکو لائفنہ ' نائب گورنر صوبۂ اورن برگ کی بیٹی پر عاشق ھوگئے۔ ان کا عشق نہایت شاعرانہ قسم کا تھا ' یہ ایک دل کی بیماری تھی ' جس نے انہیں دبلا اور کم زور اور زندگی سے بے پروا کر دیا ۔ سوفیانکو لائفنہ بہت ھی مہذب تعلیم یافتہ اور لائق تھی ' روس کے اکثر ادبی مشاھیر سے اس کی واقفیت تھی اور سب اُس کا ادب کرتے تھے' خود شہر اوف میں کوئی خاتون حسن اور ذھانت اور سلیقے میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں ۔ اس کا اور الکسئی ستیپا نووچ کا ' جو ایک معمولی زمیندار کا لڑکا تھا کوئی جوڑ نہ تھا ' اور اس کے علاوہ الکسئی ستپانووچ ایسا جھیپو ' بز دل اور کم زور طبیعت کا تھا کہ شادی کیا پیغام دینے کی نوبت آنا بھی مشکل تھا ۔ لیکن الکسئی ستیپا نووچ دل کے ھاتھوں ایسا مجبور ھوا کہ شادی کے سوا اسے جان بچانے کی کوئی اور صورت ھی نظر نہیں آتی' وہ پیام دینے پر تل گیا اُس نے ایک خاتون کے ذریعے سے جس سے ان کی کچھہ عزیز داری تھی سوفیان کو لائفنہ کی راے معلوم کی اور اس سے اُس کی امیدیں بہت بڑہ گئیں ۔ سوفیان کولائفنہ مردم شناس تھی گو الکسئی ستپا نووچ شرمیلا آدمی تھا اور اس میں یہ مادہ نہیں تھا کہ کسی مجمع پر رعب جما سکے مگر وہ دل کا بڑا اچھا اور بہت مخلص تھا ۔ اور سوفیان کو لائفنہ نے اس کے یہ

---

* اکساکوف کے والد ' جن کا شروع میں ذکر آیا تھا ۔ ستیپان میخائلووچ کی بہو انہیں کی بیوی اور اکساکوف کی ماں تھیں —

اوصاف پہچان لئے اور اس کی قدر کرنے لگی - دشواریاں بہت تھیں ' لیکن سوفیان کولائفنه کی راے معلوم کرنے کے بعد الکسئی میخا ئلووچ کو کچھہ کچھہ امید بندھی اور وہ اس مسئلے پر اپنے خاندان کی راے لینے کو گھر آئے گھر پر ان کی بہنوں نے سب حال دریافت کرلیا تھا - انھیں سوفیان کو لائفنه سے للھی بغض ہوگیا تھا ' زیادہ تر اس وجه سے که وہ حسین شائسته اور ہوشیار تھی اور ارادے کی ایسی مضبوط که اس کے سامنے کسی کی دال گلنا ممکن نہیں تھا - بہنیں اپنے بھائی پر قبضه رکھنا چاہتی تھیں ' اور ستیپان میخا ئلووچ کے خیال میں بھی ایک معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے زمیندار اور ایک شائسته شہری خاتون کا نباہ اس قدر دشوار تھا که انہوں نے بھی اپنے بیٹے کو یه خیال چھوڑ دینے کا مشورہ دیا - سب کی مخالفت کا بیچارے الکسئی ستیپانووچ پر ایسا اثر پڑا که وہ بہت سخت بیمار پڑ گیا اور موت کے منه سے بال بال بچا آخر کار جب وہ اچھا ہوکر شہر لوٹ واپس ہوا تو اس کے خاندان کا خیال تھا که وہ سوفیان کولائفنه کو بالکل بھول گیا ہے مگر وہاں پہنچنے کے کچھہ دنوں بعد ہی اس نے گھر والوں کو یه دھمکی لکھه بھیجی که اگر سوفیان کولائفنه سے شادی نه ہوئی تو میں خود کشی کرلوں گا وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا - اس کا بے اولاد مرنا گویا خاندان کا خاتمه تھا - اس لئے ستیپان میخا ئلووچ نے مجبوراً سوفیان کو لائفنه کے نام پیغام بھیج دیا اور دونوں کی کچھه عرصه بعد شادی ہوگئی —

سوفیان کولائفنه اور ستیپان میخا ئلووچ " خاندانی داستان " کے بہترین کیرکٹر ہیں ' اور وہ حصه جہاں ان دونوں طبیعتوں کا خود بخود ملنا ' ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا دکھایا گیا ہے

انشا پردازی اور کیرکٹر کی مصوری کا کرشمه هے - ستیپان میخائلووچ نے اپنی وضع نهیں چھوڑی' سوفیان‌کولائفنه نے اپنی شائستگی سے هاتھه نهیں دھویا' ان کی ساس اور نندیں شروع سے آخر تک ان سے نفرت کرتی رهیں' اور الکسئی ستیپانووچ نے دنیا داری نهیں سیکھی' لیکن سوفیان‌کولائفنه کے سلیقے اور ستیپان‌میخائلووچ کی محبت سب برداشت کر لے گئی' خاندان میں امن قائم رها اور ایک پوتے کی پیدائش نے بوڑھے دادا کی پرانی آرزو پوری کرکے سوفیان کو لائفنه سے ان کی محبت اور گھری کر دی —

" خاندانی داستان " کا قصه ستیپان میخائلووچ کے پوتے سر گئی کی پیدائش پر ختم هوجاتا هے' اور مصنف اپنے خاندان سے رخصت هوتا هے :
"الوداع میرے روشن اور تاریک پیکرو' میرے اچھے اور برے لوگو! ... تم بڑے سورما نهیں تھے' نه ایسی شخصیت کے مالک جس کی شهرت کا نقاره بجتا هو! خاموشی اور گم نامی میں تم نے اپنی زندگی بسر کی' اور ایک زمانه گذرا که تم دنیا سے سفر کرچکے هو - لیکن تم انسان تھے - تمهاری جسمانی اور روحانی زندگی شاعری سے لبریز هے' جو همارے لئے اتنی هی دلچسپ اور سبق آموز هے جتنی هماری ذات اور هماری زندگی آئنده نسلوں کے لئے دلچسپ اور سبق آموز هوگی- اور انسانوں کی طرح تم بھی اس دنیا کے عظیم الشان میدان عمل میں اپنا کام کر گئے ... اس ڈراما میں تم نے بھی صدق دل سے اپنا پارٹ دکھایا' اور اور تمهاری یاد گار بھی زنده رکھے جانے کی مستحق هے ... تمهاری اولاد همدردی سے تمهارا ذکر کرتی هے تمهیں اپنا عزیز اپنا بزرگ سمجھتی هے تمهارا زمانه' طرز معاشرت اور لباس خواه کچھه بھی رها هو خدا کرے تمهاری یاد گار کی کبھی متعصبانه رائے اور گستاخانه الفاظ سے توهین نه کی جائے " —

خطبات گارسان دتاسی

پندرھواں خطبہ

۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ ع

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ پیرس (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی)

حضرات !

وہ زمانہ اب گیا گذرا جب کہ کہا جاتا تھا کہ جدید ہند کی قومی زبان در حقیقت ٹوٹی پھوٹی بولی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی - ممکن ہے اس خیال کے حامیوں میں آپ کو چند لوگ ایسے ملیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی زبان میں یک جنسیت نہیں پائی جاتی - اسی وجہ سے وہ اس زبان کو ہیچ پوچ سمجھتے ہیں - لیکن اس خیال کی حمایت کے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود یورپ کی زبانیں اور خاص کر انگریزی زبان متفرق عناصر کے امتزاج سے بنی ہے - بہر نہج لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے - دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے - اس مسئلہ کی نسبت کپتان ایچ مور (H. moore) نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ہے - موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدہ پر فائز ہیں - آپ کے

الفاظ یہ ھیں - " بلا شبہ کچھہ عرصہ بعد ھندوستانی مشرق کی ایک نہایت اھم زبان کی حیثیت اختیار کر لے گی - اسی زبان کے توسط سے لاکھوں اھل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ھیں - ریل کی وجہ سے اور بھی جو اندرون ملک میں ھزار میل کی مسافت پر پھیل گئی ھے ھندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ھے - چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ھیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ھیں - ھندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ھے اس لئے کہ اس کی ساخت میں ھندی ' فارسی اور عربی کے عنصر شامل ھیں - اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ھے کہ ھندو اور مسلمانوں دونوں کے مقاصد کو پورا کرے - میرے خیال میں ھندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ھیں اسی قدر ھندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ھیں - ان قدرتی وسائل کی ترقی کی بدولت یورپ کے ھر ملک کے لوگ ھندوستان کھینچے چلے آ رھے ھیں - کشمیر میں مجھے فرانسیسی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ھوا - یہ لوگ فرانسیسی کارخانوں کے ایجنٹ ھیں - ھندوستان کا شاید ھی کوئی بڑا شہر ایسا ھوگا جہاں فرانسیسی موجود نہ ھوں - پچھلے دس برس میں کلکتہ بمبئی میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ھے - * بندرگاھوں میں جہاں ساری دنیا کے تجارتی جہاز نظر آتے ھیں وھاں فرانسیسی جھنڈا بھی

---

* بہت عرصہ سے کلکتہ میں فرانسیسی کونسل (Consul) رھتا ھے - اب بمبئی میں بھی رھنے لگا - بمبئی میں موسیو اے تھینو کو ابھی حال میں حکومت نے نامزد کر کے بھیجا ھے - موصوف کو اُردو زبان سے شوق ھے - کلکتہ کے کونسل موسیو لو سیار ھیں - انھیں بھی اردو کی ترقی کا بڑا خیال رھتا ھے - دونوں صاحبوں نے از راہ نوازش وعدہ کیا ھے کہ وہ میری تحقیق میں حتی المقدور مدد فرمائیں گے —

کہیں نہ کہیں ضرور لہلہاتا نظر آتا ہے —

بابو راجندر لال متر نے اپنے مضمون " هندی زبان کی ابتدا اور اردو کے ساتھہ اس کا تعلق " * میں یہ بتلایا ہے کہ هندوستانی کی ابتدائی صورت هندی ہے جو عام طور پر هندو لوگ بولتے هیں مسلمانوں کی اُردو هندی هی سے نکلی ہے - میں نے ابھی حال میں؛ بابو راجندر لال متر کی تصویر دیکھی جس سے ان کی خوش اخلاقی اور ذهانت کا پتہ چلتا ہے - موصوف کا دعوی یہ ہے کہ اس وقت هندوستان میں جس قدر زبانیں رائج هیں ان سبھوں میں هندی سب سے زیادہ اہم ہے - هندی زبان جن لوگوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے وہ هندو معاشرت کے مہذب ترین طبقہ سے تعلق رکھتے هیں - هندی مشرقی بہار سے لیکر کوہ سلیمان کے دامن تک اور بندهیاچل سے لیکر ترائین تک هر کہیں بولی اور سمجھی جاتی ہے - گورکھوں کے ذریعہ سے اس زبان نے کمایوں اور نیپال تک رسائی پیدا کرلی ہے - هندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے پیشاور کے کوهستان سے لیکر آسام تک اور کشمیر سے لیکر راس کماری تک اس زبان نے اپنا سکہ بٹھادیا ہے - [هزار سال کے عرصہ میں اس زبان نے جلیل القدر ادب دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے ادب کا مقابلہ هندوستان کی اور کوئی زبان کیا بلحاظ اپنی وسعت اور کیا بلحاظ اپنی قدامت نہیں کرسکتی - بابوصاحب نے بھی وهی بات کہی ہے جومیں بار بار اپ صاحبوں کے سامنے کہہ چکا هوں کہ هندی اور اُردو میں سوائے اسکے کوئی فرق نہیں کہ اول الذکر کے سارے اسماء هندی هوتے هیں اور ثانی الذکر کے اسماء میں عربی فارسی کا عنصر شامل هوتا ہے افعال دونوں کے خالص

—Journal of the Asiatic Society of Bengal, No. 5,1864. *

ہندی ہیں اور دونوں کی صرف ونحو میں بھی کوئی بنیادی فرق نہیں ہے —

موصوف نے اسکے علاوہ یہ بات ثابت کی ہے کہ ہندی کے نوے فیصدی لفظ آریائی تقسیم السنہ سے متعلق ہیں - ان الفاظ کی صوتی اور تصریفی کیفیت سنسکرت سے مشابہ ہے - اس باب میں مکس ملر کی بھی یہی رائے ہے - وہ کہتے ہیں " ہندوستانی اس سنسکرت زبان سے نہیں نکلی ہے جس کی مثالیں ہمیں ویدوں میں یا برہمنی ادبیات میں ملتی ہیں - وہ اس زبان کی ایک سر سبز شاخ ہے جس سے سنسکرت کا بھی تعلق ہے * ہندوستانی میں اس قدیم ہندی زبان کا اثر بھی ملتا ہے جو سنسکرت سے پہلے بولی جاتی تھی - ہندی زبان فرانسیسی کی طرح نہیں ہے جو بالکل لاطینی رنگ میں رنگ گئی ہے - قدیم کلتکی (Celtic) زبان لاطینی کی یلغار کے آگے پسپا ہوگئی - ہندی کی اپنی خاص خصوصیات ہیں اور باوجود اسکے کہ سنسکرت کے الفاظ اور مشتقات اس میں مستعمل ہیں لیکن پھر بھی اسکے خدوخال صاف نمایاں نظر آتے ہیں - سنسکرت نے ہندوستان کی قدیم زبان کے ساتھہ وہی سلوک کیا تھا جو بعد میں عربی فارسی نے ہندی کے ساتھہ کیا —

فاضل بابو صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندی کے پاس اپنے حروف تہجی نہیں ہیں وہ غلطی پر ہیں - اس لئے کہ دیوناگری یا ناگری حروف ہندی کے اپنے ہیں بالکل اسی طرح جیسے یہ حروف سنسکرت کے اپنے ہیں ہندوستانی زبان دو رسوم خط میں لکھی جاتی ہے - ناگری اور فارسی - لیکن یہ دونوں لکھنے کے طریقہ ایک ہی بولی کے لئے نہیں استعمال ہوتے -

---

* The Science of Language, t.I, P.63

ناگری رسم خط ھندووں کی ھندوستانی کے لئے اور فارسی رسم خط مسلمانوں کی ھندوستانی کے لئے استعمال ھوتے ھیں - مجھے بابو صاحب کی اس راے سے اختلاف ھے کہ اُردو کو بھی ھندی کی طرح ناگری رسم خط میں لکھنا چاھئے - اس لئے کہ عربی فارسی الفاظ کو ناگری خط میں پڑھنا اس سے کہیں زیادہ دشوار ھے کہ سنسکرت کے الفاظ کو فارسی رسم خط میں پڑھنا - چنانچہ یہی وجہ ھے کہ باوجود اس امر کے کہ دیو ناگری رسم خط مقدس سمجھا جاتا ھے اکثر ھندو فارسی حروف تہجی کو استعمال کرتے ھیں - اور وہ خالص ھندی عبارت کو فارسی رسم خط میں بلا تکلف لکھتے ھیں * میں بابو صاحب کا اس باب میں ھم خیال ھوں کہ ھندوستانی زبان کو لاطینی رسم خط میں لکھنے کا رواج دینا مفید نہیں ھوگا اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھہ اور جو دوسری تحریری علامتیں رائج کرنا پڑیں گی ان کو سیکھنا موجودہ حروف تہجی کو سیکھنے سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ھوگا —

نسولیز (Nassau Lees) نے جو سامی السنہ کے بڑے ماھر ھیں اور جن کی اعلی درجہ کی تصانیف مستشرقین میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ھیں کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں یہ خیال ظاھر کیا ھے کہ ھندوستانی زبان کو رومن حروف میں لکھنا چاھئے - وہ وجہ یہ پیش کرتے ھیں کہ ھندوستانی زبان کا اپنا کوئی مخصوص رسم خط نہیں - فارسی رسم خط ھندی نژاد نہیں ھے اور دیوناگری رسم خط میں جو ھندوؤں میں بالعموم مروج ھے ' یہ صلاحیت نہیں ھے کہ فارسی زبان کے عناصر کا بخوبی اظہار کر سکے - بابو صاحب نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ھے

---

* میرے پاس بہاری لال کبیرا اور دوسرے ھندی شعرا کے کلام کے قلمی نسخے فارسی رسم خط میں لکھے ھوئے موجود ھیں —

وہ میں ابھی اوپر لکھہ چکا ہوں - میری بھی وہی راے ہے جو ان کی ہے لیکن اس کے ساتھہ یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ شمال اور وسط ہند میں سنسکرت زبان دیوناگری خط ہی میں لکھی جاتی رہی ہے - اور یہ کہ سنسکرت سے قبل جو زبان شمالی ہند میں رائج تھی اس کا رسم خط کوئی اور تھا - اس قسم کا اعتراض فارسی، مالیائی، ترکی اور دوسری زبانوں پر بھی عاید ہوسکتا ہے جنھوں نے حروف تہجی دوسری زبانوں سے مستعار لئے ہیں - دوسرے اعتراض کے جواب میں یہ عرض کیا جاے گا کہ دیوناگری رسم خط کے ذریعہ فارسی حروف کو نہیں ادا کیا جاسکتا - یہ ٹھیک ہے لیکن دیوناگری رسم خط صرف ہندوؤں میں مروج ہے جو عربی فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں - ہندوستانی زبان چاہے وہ شمالی ہند کی اردو ہو یا دکن کی دکنی ہو فارسی رسم خط ہی میں لکھی جاتی ہے اس رسم خط سے سب مخارج اچھی طرح ظاہر کئے جا سکتے ہیں سواے ان مخارج کے جو زبان کو تالو سے ملاتے وقت نکلتے ہیں * دندانی حروف کو ان سے تمیز کرنے کے لئے خاص خاص علامتیں استعمال کی جاتی ہیں † چنانچہ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فارسی رسم خط کے ذریعہ ہندی کے سارے الفاظ لکھے جا سکتے ہیں - یہی وجہ تو ہے کہ ہندو لوگ بھی بآسانی اس رسم خط کو استعمال کرتے ہیں میری راے میں اردو کو ہندی پر فضیلت حاصل ہے - برطانوی ہند کی سرکاری زبان انگریزی اور اس کے ساتھہ اردو دونوں کہی جاسکتی ہیں - یہ سچ ہے کہ بعض ہندوؤں کی یہ راے تھی کہ صوبجات شمال مغربی کی عدالتوں میں بجاے اردو کے ہندی کو رائج کرنا چاہئے اس واسطے کہ بعض علاقوں میں ہندی بمقابلہ اردو زیادہ

---

* Cerebrals. † Dentals.

بولی جاتی ہے اور آگرہ کے متعدد مدارس میں ہندی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا ہے نہ کہ اردو کو۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈبلو انڈرسن (W. Anderson) نے جو اس علاقہ کے ناظر مدارس ہیں ' اس بات کو اپنی رپوٹ میں ظاہر کیا ہے ۔ ہاں ' اردو ان طبقوں کی زبان ہے جن پر اسلامی تہذیب کا اثر ہوا ہے ۔ ڈاکٹر انڈرسن نے اپنی رپوٹ میں اس امر پر اظہار تاسف کیا ہے کہ صوبہ جات شمال مغربی میں عربی ' فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا شوق دن بدن کم ہوتا جاتا ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ سارے ہندوستان میں یہی حال ہے ۔ میں اس تاسف میں موصوف کا شریک ہوں ۔ مجھے پوری امید ہے کہ موصوف وکٹوریہ کالج میں جو ہندوستان کی بہترین درسگاہوں میں ہے ' مدن زبانوں کی تعلیم کو رائج کریں گے ۔ اس کالج کے ساتھ چار ابتدائی مدارس بھی ملحق ہیں —

میں اب اپنے چہیتے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی ہندوستانی (اردو) کی ہندوستان میں اہمیت ۔ گزشتہ جنوری کی ۷ تاریخ کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں لاہور اور امرتسر کے مجسٹریٹوں کو خطابات دئیے گئیے جو وائسرائے کی طرف سے انہیں ملے تھے جن لوگوں نے تعلیم نسواں میں سرگرمی کا ثبوت دیا تھا انہیں خلعت دئیے گئیے ۔ اس موقع پر کئی راجے بھی موجود تھے اور مختلف ہندوستانی امراء اور سرکاری عہدہ داروں نے اس میں شرکت کی ۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستانی زبان میں حاضرین جلسہ کو خطاب کیا* —

---

* Allens Indian Mail, Feb. 23 1865.

فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے رو برو ہندوستانی میں طول طویل تقریر کی - یہ جلسہ کیننگ کالج کے لئے کیا گیا تھا * —

مہاراجہ گوالیار نے گنگت راؤ سندھیا کو اپنا جانشین مقرر کرتے وقت ۶ اکتوبر کو ہندوستانی ' فارسی اور مرھٹہ زبان میں ان کا امتحان لیا - موصوف اس امتحان میں کامیاب رہے † —

گورمنٹ ہند نے نو جوان سول سروس والوں سے ہمت افزائی کا جو وعدہ کیا تھا اسے نہایت دریا دلی کے ساتھہ پورا کیا - چنانچہ جو سولین اپنے قیام کے ابتدائی زمانہ میں زبانوں کے امتحانات میں کامیاب رہے انھیں انعامات دئے گئے - فوجی افسروں کو مشرقی السنہ سکھانے کی غرض سے ترجمانوں کو مقرر کیا گیا ھے کہ انھیں ابتدائی باتیں بتائیں - ترجمانی کو اس کے بدلے میں علحدہ الاونس دیا جائے گا ‡ —

بر طانوی ہند کے اعلیٰ عہدہ داروں میں کپتان " فلر " (Fuller) کو جو لاہور میں ناظم تعلیمات ہیں خاص کر کے ہندوستانی زبان کے ساتھہ دلچسپی ھے - آپ نے ہندوستانی کی متعدد قدیم نایاب کتب طبع کرائی ہیں اور خود بھی نئی کتابیں اس زبان میں لکھی ہیں اور لکھوائی ہیں - آپ کے زیر اهتمام نہ صرف یہ کہ ایک سالانہ رپورٹ مرتب کی جاتی ھے جس میں پنجاب کے وسیع علاقے کی تعلیمی ترقی کی سالانہ روئداد درج ہوتی ھے بلکہ ساتھہ ہی آپ ایک ہندوستانی ماہوار رسالہ بھی

---

* اخبار عالم - ۵ رمضان ۱۲۸۱ هجری (۶ فروری سنہ ۱۸۶۵ ع) —

† Times of India, 28 Oct. 1865.

‡ Indian Mail, 6 Nov. 1865.

شائع کراتے هیں —

لندن میں ایک مجلس هے جس کا نصب‌العین یہ هے کہ هندوستان کے متعلق اخلاقی معاشرتی اور مادی ترقی کے حالات جمع کرے اور ضروری معلومات بہم پہنچائے - گزشتہ ۲ مئی کو مسٹر کنیرڈ (Kinnaird) کے دولت خانہ پر اس مجلس کے ارکان جمع هوئے - اس موقع پر بعض هندوستانیوں کو بھی جلسہ میں شریک کیا گیا - کلکتہ کے جان لانگ (Rev. John Long) بھی جلسہ میں موجود تھے جو هندوستان میں مدت سے مسیحی مشن کا کام انجام دے رهے هیں - یورپ کے مختلف حصوں میں تین سال قیام کرنے کے بعد اب وہ پھر هندوستان جانے والے هیں - مدراس کے مسٹر ٹامسن نے وسط هند میں جو عام خیالات کی ترقی هوئی هے اس کی نسبت تذکرہ کیا - ڈاکٹر ڈاڈس (Dr. Dods) نے کہا کہ هندوستان میں مسیحی مذهب کی خوب ترقی هورهی هے - اس پر ایک هندو نے جو اس جلسہ میں موجود تھا ، ان کی تردید کی - یہ هندو اپنے قدیم دهرم پر قائم تھا —

ڈاکٹر جے بی گلکرسٹ جو مشہور مستشرق گزرے هیں اور جنھوں نے هندوستانی ادب کی بڑی خدمت کی تھی ان کا انتقال پیرس میں سنہ ۱۸۴۱ ع میں هوا تھا - ان کی بیوہ نے بعد میں جنرل پپ (Pepe) کے ساتھہ شادی کرلی تھی - ابھی حال میں ان خاتون کا بھی انتقال هوگیا - موصوفہ نے اپنے دیس کے مرکزی شہر ایڈنبرا کی یونیورسٹی کے نام ساڑے سات هزار فرانک سالانہ کی آمدنی چھوڑی هے اور اس رقم کے متعلق یہ وصیت کی هے کہ اس سے تین وظیفے قایم کئے جائیں اور یہ وظیفے تین هندوستانی طلبہ کو اعلی تعلیم کے لئے ملنے چاهئیں - یہ تینوں طلبہ بنگال ، مدراس یا بمبئی کے صوبے کے باشندے هوں - ان تین صوبوں میں جتنے مشہور کالج

ہیں ان کے طلبہ میں سے تین بہترین کو مقابلہ کے ذریعہ منتخب کرنا چاہئیے اور ان کو یہ وظیفے ملنے چاہئیں —

ہندوستانی لوگ بھی اس بات میں پیچھے نہیں ہیں - مرشد آباد کے نواب ناظم نے مغربی تعلیم کو بنگالی مسلمانوں میں مقبول بنانے کی غرض سے چھہ سال کی مدت کے لئے چار وظائف دئے ہیں - یہ چاروں وظیفے اس طرح تقسیم ہوں گے - ایک نظامت کالج کے طالب علم کو، ایک مدرسہ کے طالب علم کو، اور دو کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج کے طلبہ کو - موصوف کے تینوں صاحب زادے حسن‌علی مرزا، حسین علی مرزا، اور محمد علی مرزا تعلیم کی غرض سے انگلستان آئے ہوئے تھے اور اس ملک میں انہوں نے ایک سال قیام کیا - ان صاحب زادوں کے ہمراہ سید وزیر علی اور کرنل سی ہربرٹ تھے - صاحب زادوں میں دو اول‌الذکر انگریزی زبان میں بلا تکلف گفتگو کر سکتے ہیں —

ہندوستانی زبان کی ترقی کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ برابر ہر سال اس زبان کے نئے اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے - پچھلے سال نئے اخبارات غیر معمولی طور پر زیادہ نکلے ہیں - چنانچہ صوبجات شمال مغربی کے بعض شہروں میں جہاں سے ایک اخبار بھی نہ نکلتا تھا اب کئی کئی نکلتے ہیں - یہی حال پنجاب، اودھ اور بمبئی کا ہے - افغانستان اور سندھ سے بھی اردو اخبارات نکلنا شروع ہوگئے ہیں - میں ذیل میں تفصیل بیان کرتا ہوں : —

(۱) " سروپ ہراک " - آگرہ سے نکلتا ہے - یہ اخبار اردو کے " مفیدالخلائق " کا ہندی ترجمہ ہے - اس کے مدیر کا نام شیونرائن ہے - " مفید الخلائق " کئی سال سے جاری ہے —

(۲) " دل کُشا " - اردو میں فتح گڑھ سے شائع ہوتا ہے —

(۳) " شعلۂ طور " - اردو میں کانپور سے شائع ہوتا ہے —

(۴) " احسان الاخبار " - اردو میں بریلی سے نکلتا ہے - ہفتہ وار ہے - مدیر کا نام احسان محمد ہے —

(۵) " آئنۂ ہند " - اردو میں بریلی سے شائع ہوتا ہے - مدیر کا نام ہرداس سنگھ ہے —

(۶) " تتوبودھنی پتر کا " - ہندی میں بریلی سے شائع ہوتا ہے - مدیر کا نام گلاب شنکر ہے —

(۷) " رفاہ خلائق " - اردو میں شاہجہاں پور سے نکلتا ہے - اس کے مدیر کور بہادر ہیں —

(۸) " نور نظر " - اردو میں بلند شہر سے نکلتا ہے - ہفتہ وار ہے - اس کے مدیر شیو پرشاد ہیں —

(۹) " مظہر العجائب " - اردو میں رڑکی سے شائع ہوتا ہے - ہفتہ وار ہے - مدیر کا نام نجف علی ہے —

(۱۰) " لارنس گزٹ " - میرٹھ سے اردو میں نکلتا ہے - ہفتہ وار ہے - اس کے مدیر اسمعیل خاں ہیں —

(۱۱) " میرٹھ گزٹ " - ضمیمۂ اخبار عالم - یہ اخبار سنہ ۱۸۶۴ ع کے آخر سے نکلنا شروع ہوا ہے - یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - چھوٹی تقطیع پر ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - یہ اخبار ہفتہ وار ہے - " دارالاسلام " کے مطبع سے طبع ہوتا ہے - میرے پیش نظر اس اخبار کے چار نمبر ہیں جو میرے نوجوان کیمبرج کے دوست 'ایچ پامر' نے مجھے بھیجے ہیں - میں نے ان نمبروں کو شروع سے آخر تک پڑھا لیکن کوئی

ایسی دلچسپ چیز نہیں نظر آتی جو قابل ذکر ہو - "اخبار عالم" میں دلچسپ مضامین برابر نکلا کرتے ہیں - چنانچہ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۱ ہجری (۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع) کی اشاعت میں متعدد نئی ہندوستانی کتابوں کا اعلان ہے اور (سالار) سید عبدالغنی خاں کی ایک غزل ہے - موصوف ساچین (گجرات) کے نواب زادہ ہیں اور "شوریدہ" تخلص کرتے ہیں * —

اس اخبار کی ۵ رمضان (۶ فروری) کی اشاعت میں نواب محمد زین العابدین خان کی پہلی غزل شائع ہوئی ہے - موصوف نواب رامپور کے داماد ہیں - 'عابد' تخلص کرتے ہیں - مدیر نے اسی غزل کی بہت بڑھا چڑھا کر تعریف کی ہے لیکن مجھے اس میں کوئی نئی بات ایسی نہیں نظر آتی جو قابل ذکر ہو —

(۱۲) پچھلے سال کے عرصہ میں آگرہ سے ایک قانونی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے - اس کی اشاعت انگریزی (Agra Law Journal) اور اُردو دونوں میں ہوتی ہے† —

(۱۳) لاہور سے "پنجابی" نام کا ایک اخبار نکلنا شروع ہوا ہے —

صوبجات شمال مغربی کا ذکر میں اس وقت تک ختم نہیں کر سکتا جب تک کہ ڈاکٹر آرسی ماتھر کی تصانیف کے متعلق ذکر نہ کر دوں - موصوف مرزا پور سے "خیر خواہ ہند" ناگری اور فارسی رسوم خط میں برابر شائع کر رہے ہیں - اس اخبار کے بعض اہم اجزا کا انگریزی ترجمہ

---

* یہاں ان کے تین اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

† Indian Daily Mail, 5 Dec. 1864.

بھی کبھی کبھی شائع کر دیتے ہیں۔ مرزا سید عبد اللہ نے مجھے اس اخبار کا
حال میں ایک نمبر بھیجا ہے اس میں بعض اجزاء مجھے نہایت دلچسپ
معلوم ہوئے —

(۱۴) اودھ کی قدیم سلطنت کی راجدھانی لکھنؤ سے ' ان اخبارات کے
علاوہ جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ' اودھ گزٹ نکلنا
شروع ہوا ہے۔ پہلے اس کا نام "اودھ گزٹ سہا چار" تھا —

"اودھ اخبار" بدستور جاری ہے۔ اس اخبار کی متعدد اشاعتیں اس
وقت میرے پیش نظر ہیں۔ مسٹر ای ایچ ماسر کی نوازش ہے کہ وہ مجھے
یہ پرچے بھیج دیا کرتے ہیں۔ موصوف خود بھی کبھی کبھی اس اخبار
میں مضامین لکھتے ہیں۔ اس میں "انجمن آگرہ" کے متعلق حالات درج
ہوتے ہیں۔ اس انجمن کا نصب العین یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو
اہل ہند میں رواج دے۔ منشی نول کشور بھی اس انجمن کے رکن ہیں
جو لکھنؤ کے مشہور مطبع کے مالک ہیں جہاں سے "اودھ اخبار" شائع ہوتا ہے۔
ایک اشاعت میں سندیلہ کے مدرسہ کا احوال ہے - اس درس گاہ میں مغربی
علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس کی مالی حالت بھی بہت اچھی ہے
راجہ فتح چند نے اس درس گاہ کو قایم کیا تھا - راجہ صاحب کو ہندوستانی
ادب سے خاص لگاؤ تھا - آس پاس کے گاؤں کے آپ تعلقہ دار بھی ہیں - آپ
کا صدر مقام سندیلہ ہے - اس اخبار میں بعض اوقات عمدہ قسم کے اشعار
پڑھنے میں آتے ہیں جن سے موجودہ عہد کے شعراء کا علم ہوتا ہے - چنانچہ
ایک شاعر ہیں رانا جو اکثر اس اخبار میں اپنا کلام بھیجتے ہیں رانا نے اپنی
موت کے متعلق ۲۱ فروری کے نمبر میں اشعار لکھے ہیں - ایک شاعر جوہر
ہیں جو اپنا کلام اس میں شائع کرتے ہیں - یہ جرأت کے شاگرد ہیں -

اور دوسرے شاعر جن کا کلام شائع ہوتا ہے یہ ہیں : صفی ' موجد اور فضا - ۲۴ جنوری کے نمبر میں ان میں سے اکثر شاعروں کا کلام شائع ہوا تھا اس لئے کہ یہ سال کی پہلی اشاعت تھی —

(۱۵) بمبئی کے جن اخباروں کا میں ذکر کر چکا ہوں ان کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے - اس کا نام " روضۃالاخبار " ہے - یہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہے —

(۱۶) مفرح‌القلوب - یہ اخبار افغانستان میں مقام شکار پور سے شائع ہوتا ہے - اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور ملکی زبان پشتو ہے لیکن ہندوستانی یہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہے - چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے ایک اردو اخبار نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی—

(۱۷) کرانچی سے جو سندھ کا بندرگاہ ہے ' فارسی زبان میں ایک اخبار نکلتا ہے جس میں ہندوستانی کے مضامین بھی فارسی کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں - اس اخبار کا نام " مطلع خورشید " ہے - یہ اخبار بہت دنوں سے شائع ہورہا ہے لیکن مجھے اس کا ابھی حال میں علم ہوا ہے - اس اخبار کے مدیر مرزا محمد شفیع ہیں جو ایک مطبع کے مالک ہیں —

مدراس سے اردو کا اخبار " صبح صادق " برابر شائع ہورہا ہے - یہ ہفتہ وار ہے اور ہر سہ شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے - یہ بڑی تقطیع پر ہوتا ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - اس کے مدیر عبدالرحمن شفاف ہیں - اس کی متعدد اشاعتیں میری نظر سے گذری ہیں - ان میں سے ایک میں ہندوؤں کی غیر اخلاقی اور وحشیانہ رسوم پر تنقید ہے - ان رسموں میں سے ایک " چرک پوجا " ہے - جس طرح ستی کی رسم کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے - اسی طرح اس کو بھی خلاف قانون قرار دینا

چاھئیے - اس مضمون میں بعض ھندو فقیروں اور سالا بار کی برھنہ عورتوں کے حالات درج ھیں - اس رسم کو شاستروں کی تعلیم کے خلاف بتایا گیا ھے - ھندو عورتوں کو اگر بالکل نو عمری میں بیاہ نہ دیا جائے تو عمر بھر وہ بن بیاھی رھتی ھیں اور دیوتاؤں کے نذر کردیا جاتا ھے - یہ سب عورتیں فحش میں مبتلا ھوتی ھیں - اس اخبار میں سیفی کا ایک مضمون نظر سے گذرا - یہ اچھا خاصا لکھہ لیتے ھیں - یہ مضمون امام حسن اور امام حسین کی شہادت کے متعلق تھا - اس کے علاوہ غالب کی ایک غزل اِس میں درج تھی جس کی ردیف " پاؤں " ھے - مدیر نے مسٹر پامر کے ان مضامین پر تبصرہ لکھا ھے جو موصوف نے " اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " کے لئے لکھے تھے - تبصرہ میں مسٹر پامر کے طرز انشا کی تعریف کی گئی ھے اور اس خواھش کا اظہار کیا ھے کہ کیا اچھا ھو اگر گورنمنٹ ایسے یورپیلوں کو مدراس کے سررشتۂ تعلیم میں اعلی خدمات پر مقرر کرے تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جاسکے - ایسے اشخاص کا اثر مدراس پر بہت مفید ھوگا اس لئے کہ وہ ھندوستانی عربی اور فارسی سے بھی واقفیت رکھتے ھیں —

حضرات ! ان اخباروں کا ذکر کرنے کے بعد مجھے امید ھے کہ آپ مجھے اجازت دیں گے کہ انگریزی کے ایک رسالہ " پنجاب ایجوکیشنل میگزین " کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں - یہ رسالہ انگریزی زبان میں نکلتا ھے - لیکن اس کا مقصد یہ ھے کہ ھندوستانی زبان کے فروغ اور ترقی کے لئے نشر و اشاعت کا کام کرے - گزشتہ جنوری سے یہ رسالہ ماھوار نکلتا ھے - اس کے پانچ نمبر یہاں پہنچ چکے ھیں - اس میں تعلیمی خبروں اور مشوروں کے علاوہ پر مغز مضامین ھوتے ھیں اور مہینہ بھر کی ادبی مشاغل کی

کیفیت درج ہوتی ہے اس کے علاوہ پنجاب کی علمی انجمنوں کی روئداد دین اور تعلیمی نصابوں کی رپوٹیں ہوتی ہیں —

پہلی اشاعت میں بعض مضامین ایسے ہیں جو ہماری دلچسپی کے ہیں - مثلاً عربی حروف تہجی پر ڈاکٹر لٹنیر (Dr. Leitner) کا مضمون ہے - اس کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیش کے اردو امتحان کے سوالات اور جوابات درج ہیں - بیشتر سوالات آرائش محفل اور اخوان الصفا میں سے ہیں - خاتمہ پر ادبی اور علمی انجمنوں کی روئدادیں ہیں اور تعلیم سے متعلق بعض ادھر اُدھر سے اقتباسات ہیں —

اخبارات کے علاوہ اس سال جو کتب شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے * - ان کتب میں بعض یقیناً ایسی ہیں جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ کی علمی دنیا میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی - ان کتابوں میں سے بیشتر آگرہ میں طبع ہوئی ہیں - ان کی فہرست ڈاکٹر ڈبلواندرسن (W. Anderson) نے مجھے ازراہ عنایت بھیجی ہے - بعض کپتان فلر کے حکم سے طبع ہوئیں - موصوف جیسا کہ میں پہلے بتلا چکا ہوں پنجاب میں ناظم تعلیمات ہیں - میں ان میں سے بعض کی نسبت آپ کے سامنے ذکر کرتا ہوں - میں دیدہ و دانستہ مذہبی کتابوں کا اس وقت ذکر نہیں کرونگا اس لئے کہ ان کی فہرست

---

* کتابوں کی تعداد میں ہرسال اس قدر اضافہ ہو رہا ہے کہ حکومت نے ، جیسا کہ دو سال کا عرصہ ہوا اس کے متعلق اعلان بھی کیا تھا اور مسٹر وہیلر (Wheeler) نے اپنی رپوٹ پیش کی تھی ، یہ ارادہ کرلیا ہے کہ نئی مطبوعات کی اطلاع حاصل کرنے کا پورا انتظام کرے —

بہت طویل ہے * —

Rev. H. W. Shackell اور M. W. Anderson نے مجھے '' مجموعۃ القواعد ''
کے نسخے بھیجے ہیں - اس کے مصنف منشی راجا رام ہیں جن کی تصویر
سر ورق پر ہے - موصوف ہندوستانی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں
اور اہل مشرق جیسے بیٹھا کرتے ہیں اسی طرح یہ بیٹھے ہوئے ہیں اور
حقہ ان کے سامنے رکھا ہے - یہ کتاب ہندوستانی مدارس کے لئے لکھی گئی
ہے اور اس میں مفید معلومات مصنف نے جمع کردی ہیں - اس میں
اکبر آباد (آگرہ) اور صوبجات شمال مغربی کے بعض دوسرے شہروں کا
ذکر ہے - امیر چند کے سفر نامہ سے بعض اقتباسات کشمیر اور لاہور کے
متعلق بھی درج کردئے ہیں ہندوستان کے مہاراجوں و نوابوں کے ناموں کی
فہرست ہے اور اب تک ہندوستان میں جتنے گورنر جنرل رہ چکے ہیں ان
کے متعلق معلومات ہیں - اس کے علاوہ پہاڑوں ' سمندروں ' ہواؤں '
بارش اور انگلستان سے ہندوستان کی جو تجارت ہوتی ہے اس کا حال ہے -
بغض ' حسد ' غرور ' جہالت اور وقت کی قدر و قیمت کے متعلق اخلاقی
پند و نصائح ہیں - اگرچہ کتاب کے مصنف خود ہندو ہیں لیکن خانگی
زندگی کے متعلق انہوں نے جو مشورے دیے ہیں ان سے مسلمانوں کی

---

* مرزا پور کے اخبار " خیر خواہ ہند " میں ان ہندوستانی کتابوں کا
ذکر ہے جو مسیحی مبلغوں کی جانب سے طبع ہوئی ہیں - ان میں ایک
ہندوستانی دعاؤں کا مجموعہ ہے - اس میں موسیقی کی علامات وغیرہ بھی
درج ہیں - یہ دعائیں بعض تو ہندوستانی ہی میں لکھی گئی ہیں اور بعض
انگریزی یا جرمن سے ترجمہ کی گئی ہیں - اٹاوہ کے Rev. S. H. Ullman نے
یہ ترجمے کئے ہے —

خانگی زندگی کی جھلک نظرآتی ہے - ایک فارسی کتاب " کیمیائے سعادت " شائع ہوئی ہے اس کے مصنف امام غزالی ہیں - ایک تاریخ Dabischalim ہے " کلیلہ و دمنہ " کا خلاصہ ہے —

اس کتاب میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو غالباً کہیں اور نہیں ملیں گی مثلاً ان سب شہروں کے نام ہیں جنھیں مسلمان مقدس سمجھتے ہیں - ساتھ ہی ان کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں - اس ضمن میں اجمیر، ملتان، دہلی، آگرہ، الہ آباد، پانی پت، تھانیسر، کشمیر لکھنؤ وغیرہ کے حالات لکھے ہیں - مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ہردوار اور بنارس کے نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں اس لئے کہ ان مقامات میں اورنگ زیب نے مساجد بنوائی تھیں - اس کے ساتھ ایک فہرست ان مقامات کی ہے جو برھمنی ہند کے نزدیک مقدس خیال کئے جاتے ہیں - اس کے بعد پان کی کاشت اور آموں کے باغ لگانے کے متعلق معلومات ہیں - سب سے زیادہ دلچسپ وہ حصہ ہے جہاں بادشاہ دہلی کے اس اعلان کی نقل ہے جو سنہ ۱۸۵۷ع کی شورش کے موقع پر اس نے ہندوستان کے راجوں اور اور رئیسوں کے نام بھیجا تھا * —

دیوان ' گویا ' بھی طبع ہوگیا - ' گویا ' لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے - ان کا دیوان پہلی مرتبہ کانپور میں سنہ ۱۸۶۴ع میں طبع ہوا - یہ ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے —

فارسی کے مشہور شاعر حافظ کے دیوان کا اردو ترجمہ آگرہ سے طبع ہوا ہے اور " بھگوت گیتا " کا اردو ترجمہ اٹاوہ سے شائع ہوا ہے —

---

* یہ اعلان صفحہ ۱۱۸ اور اس کے بعد کے صفحات پر درج ہے - پورے چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے —

الہ آباد کے اخبار "امین الاخبار" کے مدیر نے جن کا نام عزیزالدین خان ہے (Pilgrims Progress) کے طرز پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "جواہر اصل" رکھا ہے اس کی عبارت میں نثر اور نظم دونوں ملی ہوئی ہیں —

لکھنؤ سے رانا کی مثنوی "ضبط عشق" طبع ہو گئی - * یہ تین تین مصرعوں کے واسوخت کے طرز پر ہے - اس میں مشرقی عورتوں کے مکرفریب کا حال اخلاقی مقصد کو پیش نظر رکھہ کر بیان کیا ہے —

"بغاوت مالوہ" کی "اخبار عالم" نے اپنی ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۸۱ ھ (۲۶ جنوری سنہ ۱۸۹۵ ع) کی اشاعت میں بہت تعریف کی ہے - یہ نظام الدین کی تصنیف ہے - اس کتاب کے طرز تحریر اور بیان میں تفصیل کو مد نظر رکھا گیا ہے - صوبہ مالوہ میں ۱۸۵۷ ع میں جو شورش ہوئی تھی اس کے متعلق بہت سارے واقعات اس کتاب میں مل جاتے ہیں - اس میں تصاویر ہیں اور ان مقامات کے نقشے ہیں جہاں شورش کو فرو کرنے کے سلسلہ میں لڑائیاں ہوئیں تھیں —

قصائد طیبی میں طیبی کے قصائد ہیں - ان قصائد میں مزاح کا پہلو نظر آتا ہے - قصائد کے ساتھہ ان کی تشریح کے لئے حواشی بھی ہیں -

"جہاں نما" میں کائنات کے عجائب و غرائب کا بیان ہے - جیسے پہاڑ، سمندر، جنگل، انسان اور حیوانات وغیرہ - طرز تحریر صاف ہے - اسی نام کی ایک کتاب ترکی میں ہے جس میں علم جغرافیہ پر بحث کی گئی ہے —

"بہارستان ناز" - یہ تقی الدین کی نظم کا عنوان ہے —

---

* ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں ہیں —

" نیرنگ نظر "۔ لڑکیوں کے مدارس کے لئے محمد اسمعیل نے لکھی ہے —
" درد غمناک "۔ یہ ایک عشقیہ افسانہ ہے —

گنگا پرشاد نے ہندوستان کی ریت رسوم کے متعلق " رو داد " لکھی ہے۔ موصوف اور دوسری متعدد کتابوں کے مصنف ہیں —

" تمیزاللغات "۔ اس میں عربی کے الفاظ کے اردو معنی ہیں۔ الفاظ کے معنوی فرق کو بھی اس میں واضع کیا ہے یہ اُسی قسم کی کتاب ہے جیسے فرانسیسی میں (Guard et Bauzee) کی کتاب ہے جس کی نقل میں اب انگریزی بھی لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف کا نام مولوی نیاز حسین ہے*۔

اسی قسم کی ایک کتاب کریم‌الدین نے لکھي ہے جس کا نام " تکریم ظہوری " رکھا ہے۔ یہ " تشریح ظہوری " کے بعد لکھی گئی ہے جس کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ ان دونوں میں " سوم نثر ظہوری " کی تشریح کی گئی ہے اور اصل میں جو مترادف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معنی کی بھی توضیح کی گئی ہے —

میں اردو کی کتابوں کے ذکر کو بغیر مولوی جلال‌الدین رومی کي " مثنوی معنوی " کي نسبت کچھہ کہے ختم نہیں کروں‌گا۔ محمد کریم‌الدین نے مجھے اس کا نظم میں اردو ترجمہ بھیجا ہے۔ مثنوی کي پہلی کتاب کا ترجمہ موصوف نے کاتبوں سے نقل کراکے مجھے بھیجا ہے۔ یہ عجب اتفاق کی بات ہے کہ جس کاغذ پر کاتبوں نے نقل کی ہے وہ فرانس کا بنا ہوا کاغذ ہے۔ ترجمہ مولوی اللہ بخش نشاط اور مولوی ابوالحسن نے کیا ہے۔ ترجمہ کا نام " مجموعہ فیض العلوم " رکھا ہے۔ بمبئی میں سنہ ۱۲۴۳ ہجری (۱۸۲۷ ع) میں جو فارسی ایڈیشن طبع ہوا تھا اس کو ترجمہ میں پیش

---

* مطبوعہ سنہ ۱۸۹۵ ع۔ لاہور۔ یہ کتاب کپتان فلر کے حکم سے طبع ہوئی ہے۔

نظر رکھا گیا ہے —

محمد کریم الدین نے مجھے باغ ارم کا بھی ایک نسخہ بھیجا ہے - یہ بھی مثنوی معنوی کے بعض منتخب حصوں کا اردو ترجمہ ہے - مترجم کا نام شاہ مستان ہے جو مدراس کے رہنے والے ہیں - اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ میں طبع ہوا تھا - حافظ کمال نے دوسرے ایڈیشن پر نظر ثانی کی ہے - مثنوی فارسی زبان میں تصوف کی اعلیٰ ترین کتاب ہے - صوفیا کے نزدیک یہ کتاب قرآن کی بہترین تفسیر ہے - چنانچہ اس کو قرآن پہلوئی کہا جاتا ہے - ۴۰ ہزار بیت میں قصوں کہانیوں کے پیرایے میں اس میں صوفیا کے عقائد و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے - وہ لوگ جو پراسرار شاعری کو پسند کرتے ہیں ان کے لئے مثنوی میں ایک خاص لطف ہے - بقول یوریپیڈ (Euripide) " ناقابل فہم باتوں میں ایک طرح کا تقدس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے " یا بقول پوپ " اس قسم کا تخیل عدم کمال پر دلالت کرتا ہے " -

بالعموم ان سب کتب کے آخر میں چند اشعار ہوتے ہیں جن کو " تاریخ " کہتے ہیں - ان اشعار کے حروف تہجی سے ایک خاص حساب کے مطابق کتاب کی تصنیف کی تاریخ نکلتی ہے - قدیم عبرانیوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا - چنانچہ توراۃ میں بعض حروف بڑے ہیں اور بعض چھوٹے - ان بڑے حروف سے بعض تاریخیں نکلتی ہیں لیکن ان کی ابھی تک پورے طور پر تصدیق نہیں ہوئی ہے - ڈبلو ایچ بلیک (W. H, Black) نے انہیں حروف سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے ۱۴۵۱ ق م میں انتقال کیا * بقول (Malachie) ۳۹۳ ق م

* " Ancient Biblical Chronograms, Or a Discovery of the Chronological use of the majuscular Letters occuring in the text of the Hebrew Scripturs. " London 1864.

میں اور بقول دانیال ۹۲۵ ق م میں حضرت موسیٰ کا انتقال ہوا اور Esther کا واقعہ ۳۴۷ ق م میں ہوا —

حضرات! اب آپ اگر اجازت دیں تو میں ہندی کی چند مطبوعات کی نسبت ذکر کروں جو مجھے بھیجی گئی ہیں یا جن کے متعلق میں نے معلومات جمع کی ہیں —

" اتھاس تمرناسک " (Itihas timir nacak) کے مصنف کا نام شیو پرشاد ہے - یہ " تاریخ ہند " ہے - جس حصہ میں سنہ ۱۸۹۵ سمبت درج ہے وہ درحقیقت سنہ ۱۵۶۶ ع سے لے کر سنہ ۱۸۵۷ ع تک کے حالات پر حاوی ہے - یہ کتاب بنارس میں طبع ہوئی ہے - شیو پرشاد نے اس کتاب میں بھی اپنی اور دوسری کتابوں کی طرح اس امر کی کوشش کی ہے کہ نہایت مختصر انداز میں زیادہ سے زیادہ معلومات کو یک جا کیا جائے - اس کتاب کا تیسرا حصہ جب شائع ہوا اس وقت کہیں یہ مکمل ہو پائے گی —

پچھلے سال میں نے کہا تھا کہ " پربودھاچندرودیا " کا اردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے - آج میں آپ کے سامنے اس کا اعلان کرتا ہوں کہ اس ناٹک کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوگا - ترجمہ نند اس (Nandas) نے کیا ہے —

" اندرسبھا " - ہندی کا افسانہ ہے - بلدیو پرشاد نے فارسی سے اس کا ترجمہ کیا ہے - ہندی میں اس کا اصل موجود نہیں ہے —

" کرشن کا بارہ ماسا " - کرشن بھگتی کی دعائیں ہیں جن میں سال بھر کے حالات بیان کئے گئے ہیں " رس راج " - ہندی نظموں کا مجموعہ ہے ، ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے —

" بھرتری چرتر " - یہ کہانیوں کا انتخاب ہے - ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے - آگرہ میں طبع ہوا —

" راگ مالا " - یه عوامی گیتوں کا مجموعه هے - امراؤ سنگهه نے انهیں ایک جگهه جمع کیا هے - میرٹهه میں سنه ۱۸۶۴ ع میں طبع هوا —

" و نایا پتر کا " - یه تلسی داس کی نظم هے - پهلے بهی چهپ چکی هے - اس مرتبه شیوپرکاش نے اس کی تشریح میں حواشی بهی لکهے هیں ' ۳۸۰ صفحات هیں - بنارس میں طبع هوئی هے —

" پنچ رتن " - یه بهی تلسی داس کی پانچ مشهور نظموں کا مجموعه هے - پنڈت درگا پرشاد نے شائع کیا ' ۲۷۴ صفحات هیں - بنارس میں طبع هوا —

" سور ساگر رتن " - یه سور داس کی نظموں کا مجموعه هے - سورداس کو هندوستان کا هومر سمجهنا چاهئے —

" شکنتلا " - یه سنسکرت سے هندی میں ترجمه هے - بنارس میں سنه ۱۸۶۴ ع میں طبع هوا —

" بیدهرپن " اس کے مولف کا نام بتهاجی هے - میرٹهه میں سنه ۱۸۶۴ ع میں طبع هوا —

" امرت ساگر " - یه کتاب فن طب پر هے ۳۰۴ صفحات پر مشتمل هے - آگره میں طبع هوئی —

" بن مادهو " اور " پدمالا " - یه دونوں علم العروض کی کتابیں هیں آگره میں سنه ۱۸۶۴ ع میں طبع کی گئیں —

بابو متهراپرشاد کی انگریزی هندوستانی کی لغت (هندی کے ساتهه اردو بهی هے) بنارس میں زیر طبع هے - یه لغت بهت ضخیم هوگی - موصوف اس لغت کو ان لوگوں کی سهولت کے لئے تیار کررهے هیں جنهیں دن رات انگریزی زبان سے سابقه رهتا هے — *

* Trübner, Am. and Oriental Literary Record, Oct. 1865.

اس سال انگریزی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ۸۰ هندی کتابوں کا ذکر ملتا ہے جو زیادہ تر برج بھاشا میں ہیں - اس کتاب کی تالیف میں ان سبھوں نے استفادہ کیا ہے - میری مراد ہے "History of the sect of maharajas or wallabhacharya in western India" سے جو علمی نقطۂ نظر سے یقیناً اعلی پایے کی کتاب ہے - هندوؤں کی مذهبی تاریخ اور فلسفے پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - همیں اس کا تو پہلے سے علم تھا کہ هندی میں کتابوں کی بڑی تعداد هر سال شائع هوتی ہے - اس کتاب کو دیکھنے سے معلوم هوا کہ هندی کی بیسیوں کتابیں ایسی هیں جن کے متعلق همیں مطلق کوئی علم نہیں - هندوستان کے کتب‌خانوں نے اس باب میں اب تک کچھ نہیں کیا —

مسٹر Erskine کے کتب خانے میں بھی هندی قلمی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے جو کچھ عرصہ هوا برٹش میوزیم نے حاصل کرلیا ہے - موصوف وهی هیں جنھوں نے " تزک بابری " کا ترجمہ کیا ہے - مشہور مستشرق مسٹر Charles Rieu اس ذخیرہ کی ترتیب میں آج کل مشغول هیں - کو اجی جہانگیر جن کو انگریز لوگ " نقدہ " (Ready money) کے نام سے پکارتے هیں انھوں نے بھی بمبئی کی رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کی شاخ کو ۲۹۲ کتب بطور عطیہ دی هیں - اس ذخیرے میں بھی یقین ہے کہ هندی کی کتابیں هونگی (*) —

موصوف نے سکوں اور تمغوں کا ایک مجموعہ بھی دیا ہے - اس میں وہ سب روپے شامل هیں جو مختلف زمانوں میں مغربی هند میں رائج رہے هیں - اس کے علاوہ پونا میں کالج قائم کرنے کے لئے ۵۰ هزار روپے کی رقم بطور عطیہ دی ہے - اس کالج کا سنگ بنیاد گذشتہ سال ۹ اگست کو رکھا گیا —

اب میں ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے متعلق کچھ کہونگا اور یہ بتلاونگا کہ خود ہندوستانیوں نے مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کی غرض سے جو انجمنیں بنائی ہیں وہ کیونکر چل رہی ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن اور مسیحی مذہب کی نشرو اشاعت کا کیا حال ہے —

ہندوستانی انشاپرداز افسوس نے " آرائش محفل " میں یہ لکھا ہے (*) —

" ہندوستانیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے - وہ اس تعلیم کے فوائد سے باخبر نہیں " - وغیرہ - (†) —

ہندوستانیوں کے متعلق جو یہ تصویر کھینچی گئی ہے اس میں ممکن ہے کہ کچھ مبالغہ ہو - اس لئے کہ اہل مشرق کی تصویریں مبالغہ سے کبھی خالی نہیں ہوا کرتی ہیں - لیکن اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے - حکومت جس سرگرمی کے ساتھ مغربی علوم و فنون کو ہندوستان میں رواج دے رہی ہے اس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہو رہا ہے - چنانچہ اس تعلیم کی بدولت ہندؤں کی رسوم میں اصلاح ہو رہی ہے اور ان کے مذہبی رواج بھی بدلتے جاتے ہیں - ایسے رواج جو معاشرت کے لئے نقصان رساں تھے انہیں لوگ ترک کررہے ہیں - یہ تبدیلی پورے طور پر خارجی اثر سے نہیں پیدا ہوسکتی بلکہ اندرونی طور پر اس کا پیدا ہونا ضروری ہے جیسا کہ مسٹر جے - بی لارٹن کا خیال ہے ‡ کلکتہ کی " برھمو سماج " مدراس کی " وید سماج " اور اسی طرح کی دوسری انجمنیں اس مقصد

---

* صفحہ ۴۶ - کلکتہ ایڈیشن —　　　† عبارت کا فرانسیسی ترجمہ —

‡ مدراس میں موصوف نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا تھا - انڈین ڈیلی میل ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۵ ع —

کو پیش نظر رکھ کر قائم ہوئی ہیں کہ وحدت کی تعلیم دیں ' ہندؤں کو مذہب کو توہمات کی الائش سے پاک کریں ' نیچ ذات والوں کے ساتھ جو مذہبی فرق برتا جاتا ہے اسے دور کریں ' عقد بیوگان ' ایک بیوی سے عقد کرنے اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی نشر و اشاعت کریں - چنانچہ اسی تحریک سے متاثر ہو کر ایک بنگالی نے ایک نوجوان بیوہ کے ساتھ عقد کیا - یہ بیوہ کش نگر کے مدرسہ کی ایک متعلمہ تھی - مقامی ہندو شرفا نے اس شادی کے موقع پر شرکت کی اور برھموسماج کے اصولوں کے مطابق سب رسمیں پوری کی گئیں - ہندوستانی اور یوروپین مذہبی جماعتیں آپس میں اپنی مطبوعات کا تبادلہ بھی کرتی ہیں - چنانچہ برھموسماج اور Calcutta Tract Society نے اس پر عمل کرنا شروع کردیا ہے —

پنجاب میں سررشتۂ تعلیم سنہ ۱۸۵۶ ع میں قائم ہوا جب کہ سرجان لارنس جو آج کل ہندوستان کے وائسرائے ہیں ' چیف کمشنر تھے - شورش عظیم کے باعث اس سرشتہ کی ترقی رک گئی لیکن اب امن و امان قائم ہونے کے بعد تعلیم کو فروغ شروع ہوگیا ہے - بایں ہمہ سنہ ۱۸۶۰ ع تک صرف ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ کی گئی (ورنیکلر مدارس) - اس کے بعد اعلی تعلیم کا خیال پیدا ہوا - سنہ ۱۸۶۰ ع سے برابر ایسے اضلاعی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے جہاں انگریزی اور ہندوستانی دونوں پہلو بہ پہلو سکھائی جاتی ہیں - اس وقت پنجاب میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو ہزار سات سو تیس ہے جن میں ۸۶ ہزار ' دو سو بانوے طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں - بڑے سرکاری مدارس تین ہیں - لاہور ' امرتسر ' اور دہلی میں - ان مدارس سے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان کے لئے طلبہ ہر سال

جاتے هیں جن میں سے اکثر کامیاب رهتے هیں - ان مدارس کے علاوہ لاهور کا مشن اسکول بھی قابل ذکر هے —

لاهور کے میڈیکل اسکول میں ایک کلاس انگریزوں کے لئے هے اور دوسرا هندوستانیوں کے لئے - ثانی‌الذکر میں داخل هونے کے لئے لازمی هے کہ هندوستانی زبان کا ایک امتحان میں کامیابی حاصل کی جائے - اس امتحان میں فارسی رسم خط میں املا لکھنا هوتی هے —

مین ان مدارس کی تعلیم کے متعلق تفصیلات بیان کرسکتا هوں اور یہ بھی بتلا سکتا هوں کہ ان میں اساتذہ اور طلبہ کی تعداد کیا هے لیکن ایسا کرنا غیر ضروري هے اس واسطے کہ کپتان فلر (Fuller) کے ایک خطبہ میں یہ سب باتیں تفصیل سے موجود هیں - انھوں نے پنجاب کے ناظم سرشتۂ تعلیمات کي حیثیت سے جو حال هی میں رپوٹ پیش کی هے اس سے اس صوبہ کے هندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کا ایک خاکہ نظر کے سامنے آجاتا هے - اس رپوٹ سے هندوستانی کی ترقی کا حال بهوت معلوم هوتا هے * - حکومت نے اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا هے کہ هندوستانی زبان کی کتب لکھائی جائیں - اس سے معلوم هوتا هے کہ حکومت هندوستانی زبان کی ترقی کے لئے کوشاں هے † —

۷ جنوری کو لاهور میں جو دربار هوا اس میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر

---

* دهلی کے نارمل اسکول میں سب طلبہ کے لئے هندوستانی لازمی قرار دی گئی هے - مولوی خدا بخش هندوستانی کی تعلیم دیتے هیں - کالی مسجد میں لڑکیوں کا جو مدرسہ هے اس میں انجیل اردو میں پڑهائی جاتی هے —

† Indian Mail 26 Dec. 1854.

سر آر مونٹگمری نے ہندوستانی میں تقریر کی' دوران تقریر میں آپ نے اس ترقی کا ذکر کیا - جو صوبہ پنجاب نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں کی ہے آپ نے بتلایا کہ اس وقت پنجاب میں لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۶۶۲ ہے اور ان میں ۱۳ ہزار سے زائد لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں - اس موقع پر کپتان ' فلر ' نے بھی ہندوستانی میں تقریر کی اور صوبہ کی تعلیمی ترقی کے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا - بعض ہندوستانیوں نے بھی تقاریر کیں اور تعلیم کو اپنے ہم ملکوں میں عام کرنے کے وعدے کئے —

ان ہندوستانی مستورات کو جو پردہ کے اندر زندگی بسر کرتی ہیں تعلیم سے بہرہ یاب کرنا بہت دشوار کام ہے - صرف عورتیں ہی یہ کام انجام دے سکتی ہیں - چنانچہ سال گزشتہ میں نے اس کے متعلق ذکر کیا تھا کہ بعض خواتین نے یہ کام شروع کردیا ہے* - Rev. J. Long نے انگریز خواتین سے اپیل کی ہے کہ وہ از راہ خدمت خلق یہ کام شروع کر دیں - ان میں جذبۂ حمیت پیدا کرنے کے لئے موصوف نے طبقۂ امرا کی روسی خواتین کی مثال پیش کی ہے کہ وہ اپنی رعایا کو خود تعلیم دینے میں اپنی ذلت نہیں سمجھتی ہیں —

۲۵ فروری کو لاہور میں ہندو اور مسلمان طلبہ کو انعام تقسیم کرنے کی غرض سے ایک جلسہ ہوا - یہ انعامات ان طلبہ کے لئے مخصوص تھے جو سرکاری مدارس میں تعلیم پاتے ہیں - حلقۂ لاہور کے ناظر مدارس مسٹر ' الکزنڈر ' سرکاری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ' لیٹنر ' اور مسٹر ' کوپر ' نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی - ان تینوں نے ہندوستانی میں جلسہ کے روبرو

---

* دیکھو خطبہ ۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ ع —

تقاریر کیں * —

بنارس میں مشن مدارس کے تقسیم انعامات کے جلسہ میں جہاں اور دوسرے طلبہ کو انعامات ملے وہاں ایک انعام ایک کم عمر بچہ کو دیا گیا جن سے وائسرائے کی آمد کے موقع پر هندوستانی میں اشعار لکھے تھے † —

پہلی فروری کو آگرہ میں زرعی نمائش کے افتتاحی جلسہ میں وکٹوریہ کالج کے سکریٹری نے هندوستانی میں تقریر کی تاکہ اس موقع پر جتنے هندوستانی موجود تھے وہ سمجھہ سکیں ‡ —

مسٹر ای هاورڈ (E. Howard) نے صوبہ بمبئی کی نظامت تعلیمات سے علحدہ هوتے وقت اس صوبے کی تعلیمی ترقی کے متعلق ایک رپوٹ شائع کی هے - اس رپوٹ کو دیکھنے سے معلوم هوتا هے اس وقت بمبئی کے صوبہ میں مدرسوں اور کالجوں کی تعداد ۹۵۴ هے - ان میں ۶۶ هزار طلبہ تعلیم پاتے هیں - اس تعداد میں حکومت کے سرکاری مدارس شامل نہیں هیں - جن میں طلبہ کی تعداد کم و بیش اسی قدر هوگی - سرکاری تعلیم گاهوں کی بدولت انگریزی زبان کی تعلیم لازمی طور پر بڑہ رهی هے - اس کے ساتھہ ساتھہ هندوستانی ادب نیز ان دوسری زبانوں کو فروغ حاصل هورها هے جو مختلف صوبوں میں استعمال کی جاتی هیں - ان مختلف زبانوں میں انگریزی کلاسک کتابوں کے ترجموں سے ترقی هورهی هے § —

---

* Punjab Educational Magazine 26th., Feb. 1865.

† Friend of India, 1st,, Dec. 1864.

‡ Indian Mail, 15 March 1865.

§ Indian Mail, 28 Oct. 1865.

بمبئی یونیورسٹی کی خوش حالی بدستور قائم ہے - پچھلے دسمبر کے مہینے میں ۲۲۱ اُمید واروں نے میٹریکولیشن کے امتحان میں شرکت کی - ان میں سے اکثر ہندو تھے - جملہ تعداد میں سے ۱۰۹ کامیاب ہوے —

ڈاکٹر برڈوڈ (Dr. Birdwood) کی وجہ سے جیسا کہ میں پچھلے سال کہہ چکا ہوں بمبئی میں عنقریب وکٹوریہ میوزیم قایم ہوجاے گا - اس میں شمالی ہند اور دکن کے نوادر رکھے جائیں گے- مدارس میں تو پہلے سے ایک عجائب گھر موجود ہے - لندن کے انڈیا ہاؤس میں وہ اشیاء بھیجی جائیں گی جن کے ہندوستانی عجائب خانوں میں دو نمونے ہوں گے —

لاہور کے " سرکاری اخبار " کی بدولت اودھ کی تعلیمی ترقی کے حالات مجھے معلوم ہوے - اودھ کو بارہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے - اضلاع تحصیلوں میں تقسیم ہیں اور تحصیل دیہوں میں' ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اودھ کے ہر ضلع میں بھی ایک ہائی اسکول ہے - ان مدارس میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ دو ہندوستانی پڑھانے والے ضرور ہوتے ہیں - ایک اُردو پڑھانے کے لئے اور دوسرا ہندي پڑھانے کے لئے- یہاں فارسی' سنسکرت ' انگریزی ' علوم صحیحہ ' تاریخ اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم دی جاتی ہے- تعلیم ہندوستانی زبان میں دی جاتی ہے- ہاں اونچی جماعتوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے —

ڈاکٹر ایٹنر پرنسپل گورمنٹ کالج نے جو " انجمن اشاعت مطالب مفیدہ " لاہور میں قائم کی ہے اس کے سرپرست کپتان فلر (Fuller) ہیں- اس انجمن میں بلا امتیاز مذهب و ملت ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں- چنانچہ کوہ نور کے مدیر ہر سکھہ راے اس انجمن کے سکریٹری ہیں - ان کے علاوہ اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانی اس انجمن کے رکن ہیں - ہندو لوگ اس انجمن کو " سکش سبھا " کے نام سے پکارتے ہیں - ہر روز اس انجمن کی اهمیت

اس کے کام کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے - اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ملحق ہے جس سے پبلک مستفید ہوسکتی ہے - اس انجمن کے سربراہوں کا خیال ہے کہ ادبی اور معاشری مسائل پر کتابیں شائع کرائیں - اس انجمن کی پنجاب کے اور دوسرے شہروں میں بھی شاخیں موجود ہیں - پہلی اکتوبر سے اس انجمن کے زیر اهتمام اردو میں تقاریر کرائی جاتی ہیں - ان تقاریر کے موضوع بالعموم عام دلچسپی کے ہوتے ہیں - ڈاکٹر لیٹنر کا خیال ہے کہ لاہور میں ایک یونیورسٹی قایم کریں گے جس کا دستورالعمل بہت وسیع اور آزاد اصول پر مبنی ہوگا - اس یونیورسٹی کا نصب العین یہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگوں میں علوم و فنون کو رواج دیا جائے ہندوستانی ادبیات کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور کوشش یہ کی جائے کہ ایک جدید ادب اس زبان میں وجود میں آے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے موصوف نے ایک سرمایہ جمع کر لیا ہے - اس سرمایہ سے ان طلبہ کو انعامات دئے جائیں گے جو اردو ' ہندی ' فارسی' سنسکرت یا عربی میں نمایاں کامیابی حاصل کریں گے - موصوف نے اپنی اس اسکیم کے متعلق جولائحہ عمل اردو میں تیار کیا ہے وہ اس وقت میرے پیش نظر ہے - لاہور کے بعض روساء موصوف کی همت افزائی کر رہے ہیں - چنانچہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر مک لیوڈ (Mc Leod) نے جو خود مستشرق ہیں اور علوم مسشرقیہ کے قدردانوں میں ہیں ' سرشتہ تعلیم کے اعلی حکام کو مجوزہ علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی کے متعلق ایک مراسلہ بھیجا ہے * —

انجمن لاہور کے اجلاس کا ذکر " سرکاری اخبار " " کوہ نور " اور دوسرے ہندوستانی اخباروں میں ملتا ہے ۲۱ جنوری کو اس انجمن کا افتتاحی جلسہ

---

* Times of India , 28 Oct. 1865.

ہوا تھا جس میں ڈاکٹر لیٹنر اور پنڈت من پھول نے اظہار خیال کرتے وقت کہا کہ یہ علمی مجلس عوام کی خدمت کی غرض سے قایم کی گئی ہے۔ اس کا مقصد تھا م یہ ہے کہ عوام کی حالت کو سدھارے۔ یہ انجمن ان لوگوں کو بھی جو اپنے تئیں تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں روشن خیالی اپنا فرض سمجھتی ہے —

اس انجمن کے قواعد و ضوابط جو اردو میں شائع ہوے ہیں ان پر اخبارات میں تنقیدیں ہوئی ہیں۔ وہ تنقیدیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں —

اس انجمن کی ایک اشاعت بابو نوین چندر کا مضمون ہے جو انھوں نے اس موضوع پر لکھا ہے کہ پنجاب میں ہندی کی ترقی کی کوشش کرنی چاہئے۔ بابو صاحب نے یہ بتلایا ہے کہ ہم لوگ جس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر قوم تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوشاں ہے۔ ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ متحدہ سعی و جہد سے اپنے تمدن اور اپنی ادبیات کو فروغ دیں۔ ہمیں مغربی علوم و فلسفہ کی کتابوں اور سنسکرت کی قدیم کتابوں کو ہندی میں ترجمہ کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کو بھی اردو کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ ہندی کے حقوق کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اردو اور ہندی جڑواں بہنیں ہیں۔ ہمیں ان دونوں کی ترقی کے لئے بیک وقت کوشش کرنا چاہئے —

اسی قسم کی ایک انجمن روہیلکھنڈ کے علاقہ کے لئے بریلی میں قایم ہوئی ہے میرٹھہ کے اخبار " اخبار عالم ' میں اس انجمن کے متعلق حالات نکلتے ہیں۔ اس انجمن کا اصلی مقصد جدید علوم کو ہندوستانیوں میں رواج دینا ہے۔ چنانچہ یہ انجمن عام دلچسپی کی کتابیں شائع کر رہی

ہے اس انجمن کی حتی‌المقدور یہ کوشش ہے کہ خود ہندوستانی لوگ ان کتابوں کو لکھیں ۔ انجمن انھیں اس کا معاوضہ دیتی ہے اور ان کی اشاعت کا پورا انتظام کرتی ہے ۔ انجمن کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں خطابت اور بلاغت کو ترقی دی جاے اور اس زبان کی جو خصوصیت ہے یعنی مطالب کو صفائی کے ساتھہ ادا کرنے سے اور اجاگر کیا جاے ۔ اس سے یہ ہوگا کہ زبان میں نزاکت اور لطف دگنا ہوجاے گا ۔ اور اس زبان میں گفتگو کرنا شائستگی کی علامت تصور کیا جاے گا ۔ اس کے علاوہ انجمن مغربی علوم و فنون کی کتابوں کا ہندوستانی (اردو - ہندی) میں ترجمہ کراے گی اور انجمن جن ترجموں کو قبول کرے گی ۔ اُس کا معاوضہ ادا کرے گی صوبجات شمالی مغربی یا ہندوستان کے کسی اور گوشہ کا باشندہ علمی کتب کا ترجمہ اس انجمن میں پیش کرسکتا ہے ۔ انجمن اس ترجمہ کو دیکھے گی کہ آیا واقعی وہ اس کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں ۔ اگر ترجمہ قابل قبول ہے تو اس کی طباعت کا انتظام کیا جائیے گا ۔ انجمن کی تنظیم حسب ذیل ہے :- ایک کمیٹی ہے جو اپنا صدر ، نائب صدر معتمد اور خزانہ دار منتخب کرتی ہے ۔ انجمن کے معمولی ارکان کی تعداد غیر محدود ہے ۔ اس کا چندہ چوبیس روپے سالانہ ہے ۔ کمیٹی کے ارکان زیادہ تر ہندو اور مسلمان امراء ہیں ۔ ان کے علاوہ بریلی اور روہیلکھنڈ کے دوسرے حصوں کے اہل علم و فضل بھی اس میں شریک ہیں ۔ مہینہ میں ایک مرتبہ کمیٹی کا جلسہ ہوتا ہے —

انجمن کا ارادہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ جاری کیا جاے ۔ انجمن کا معتمد اس رسالہ کا نگران ہوگا ۔ ہر سال انجمن اپنا ایک عام جلسہ منعقد کرے گی جس میں انجمن کی سال بھر کی سرگرمیوں کا حال ایک رپوٹ کے ذریعہ جو اردو میں لکھی جاے گی ، پیش کیا جاے گا —

چند ماہ کا عرصہ ہوا کہ بدایوں کے بعض راجہ اور امراء کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ ہندوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو مہمل رسوم برتی جاتی ہیں اور جو بے کار جشن منائے جاتے ہیں انھیں کس طرح ترک کرنا چاہئیے - فتح گڑہ کے باہو ایشوری داس نے ان مسائل کے متعلق ایک مضمون پڑھا - موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں - ان کا نام ہندووں کا سا ہے لیکن انھوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا ہے —

حضرات! پچھلے سال میں نے کلکتہ کی ادبی انجمن کا ذکر کیا تھا * جس کے بانی اردو زبان کے مشہور مصنف اور انشا پرداز سید احمد ہیں † جنھوں نے انجیل کی شرح لکھی ہے - موصوف کی حیثیت مسلمانوں میں وہی ہے جو آج سے چالیس سال قبل رام موہن رائے کی ہندووں میں تھی - موصوف کے جوش اور خلوص کی بدولت انجمن ترقی کر رہی ہے - اس کام میں مولوی عبداللطیف اور بعض انگریز ان کی مدد کر رہے ہیں - ہماری پوری توقع ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس انجمن سے بہت فائدہ پہنچے گا جن کی تعداد اس وقت ۲ کروڑ سے زیادہ ہے - اس انجمن کی بدولت ان مسلمانوں کے لئے جو تاج برطانیہ کے سایہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں یہ ممکن ہو گا کہ اس عظیم‌الشان تعلیمی تحریک میں شرکت کرسکیں جو اس وقت بنگال میں اپنے اثرات دکھا رہی ہے - اس انجمن کا مقصد یہی یہ ہے کہ قومی

---

* قسطنطنیہ میں بھی اس قسم کی ایک ادبی انجمن قایم کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے کئے جائیں سلطان اس انجمن کو سالانہ ۲ لاکھ ۵۰ ہزار فرانک دیتے ہیں —

† سر سید احمد خان مرحوم —

ادبیات کو فروغ دیا جائے - انجمن نے ۹ ہزار روپے کے انعامات ان کے لئے مقرر کئے ہیں جو اردو میں مندرجہ ذیل موضوعوں پر مضامین لکھیں گے حیات اورنگ زیب ؛ ہندی مسلمان ' انجن اور اس کے کل پرزے : مطبع کی تاریخ اور تمدن پر اس کے اثرات - ۱۶ اگست کو اس انجمن کا ایک جلسہ علیگڑہ میں ہوا - اس جلسہ میں یہ طے پایا کہ انجمن کی اپنی ایک عمارت ہونی چاہئے کتب خانہ کے لئے کتابیں فراہم کرنی چاہئیں اور سائنس کے آلات منگانے چاہئیں * اس انجمن کی سرپرستی بنگال کے لفٹننٹ گورنر نے قبول فرما لی ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی اس انجمن کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے —

اس انجمن کے ایک پچھلے جلسہ میں مولوی عبیداللہ نے سلطنت روما کی ابتدا اور اس کے استحکام پر ایک مضمون پڑھا - مولوی عبدالرؤف نے لندن اور اس کے نوام پر ایک مضمون پڑھا - اس موضوع پر متعدد ہندوستانی سیاحوں نے اظہار خیال کیا ہے - شمشیر نے "شگرف نامۂ ولایت" اور کریم خاں نے "سیاحت نامہ" میں لندن کے حالات بیان کئے ہیں - یورپین لوگوں میں جنھوں نے اس انجمن کے مقاصد کے ساتھہ ہمدردی کا اظہار کیا ہے سر چارلس ٹریولین خاص طور پر قابل ذکر ہیں - جب موصوف کلکتہ سے ولایت واپس جارہے تھے تو اس انجمن کے ارکان کی طرف سے ایک الوداعی ایڈ ریس پیش کیا گیا جس میں اس خیال کو ظاہر کیا گیا کہ ان کے ولایت جانے سے اس انجمن کا ایک عملی معاون کم ہوگیا —

کیا اچھا ہو اگر ہندوستان جنت نشان سے بت پرستی کی لعنت دور

---

* Indian Mail, 8 jan .1865.

ہوجاے - کلکتہ کے مہا پادری Reginald Heber نے پچاس سال کا عرصہ ہوا جب یہ اشعار لکھے تھے :-

خدا نے اپنے لطف و کرم کو بیکار فیاضی کے ساتھہ اس
جگہ صرف کیا جہاں کی حالت یہ ہے کہ بت‌پرست لوگ
چوب و سنگ کے آگے اپنا سر نیاز خم کرتے ہیں "

ہمیں پوری امید ہے کہ مسیحی مبلغین سے ہندوستان میں بلکہ سارے عالم میں زبور کے اس سرود عارفانہ کی تصدیق ہوگی —

" خدا مشرکوں کو زیر کرے گا - وہ اپنے مقدس تخت
پر جلوہ افروز ہے " *

اگر ہندوستانی مسیحیت کی پر اسرار کشتی پر سوار ہوجائیں تو وہ نجات کے گھاٹ اتر سکتے ہیں - اس کشتی میں انہیں عافیت نصیب ہوسکتی ہے اگر وہ مسیحی دین قبول کر لیں تو یوں سمجھو جیسے انہوں نے صداقت کے کھمبے کو پکڑ لیا جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہلتا —

ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کو زیادہ کامیابی اب تک نہیں حاصل ہوئی - لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے مسیحی مذہب کی تعلیم کو قبول کر لیا ہے - ناگپور کے ناظر مدارس نے جن کا نام مولوی صفدر علی ناگپوری ہے ؛ ابھی حال میں مسیحی دین قبول کیا ہے - موصوف نے مسیحی کتابوں کو پڑھکر خود بخود مذہب تبدیل کر لیا - ان کے اثر سے ایک اور مسلمان عیسائی ہوگیا جو ان کے ماتحت اسکول میں مدرس تھا - ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کام کر رہے ہیں ان میں انگلیکن (Anglicans) اور دوسرے غیر کیتھولک شامل

---

*Ps. × h vII, 9 verse.

ہیں * ہمارے خیال میں کیتھولک مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی اس لئیے کہ اس وقت ہندوستان میں کم و بیش دس لاکھہ کیتھولک موجود ہیں † —

مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش میلوں کے موقع پر ظاہر کرتے ہیں - ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگالیتے ہیں - تقریریں اور وعظ کرتے ہیں رسالے تقسیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ - چنانچہ پچھلے دنوں ۲۸ جلوری الہآباد میں میلے کے موقع پر کوئی ۷۰ ہزار نفوس جمع ہوئے تھے - اس میلے میں ان مبلغوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا —

۲۱ دسمبر کو بمبئی کے مہاپادری نے ۹ کم عمر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی رسم ادا کی - ان میں دو مسلمان ہیں ' ایک پارسی ہے ' ایک تاملی ہے ' چار مرہٹے ہیں ' اور ایک اودھ کا ہندو ہے - ان کے علاوہ دس لڑکیاں بھی مسیحی دین کے حلقہ میں داخل ہوئیں ان میں سے دو مسلمان ہیں ' اور باقی سب ہندو ہیں - ان میں ایک لڑکی برہمن ہے - مہاپادری نے اپنی تقریر ہندوستانی میں کی اور بعد میں مرہٹی میں اس واسطے کہ اس علاقہ میں یہی زبان بولی جاتی ہے ‡ —

اس سال ۹ اپریل کو کلکتہ کے مہاپادری نے امرتسر میں ۴۰ ہندوستانیوں کو مشرف بہ مسیحیت کیا - اس موقع پر جو مذہبی رسم ادا کی گئی اس میں موصوف نے بلا تکلف ہندوستانی زبان میں تقریر کی - اس تقریر میں الفاظ اور محاوروں کا استعمال اس قدر صحیح تھا کہ جو ہندوستانی اس

---

*"Church Missionary Intelligeneer."

† "India, its nations and missions", by Rev. G. Trever.

‡ Indian Mail, 8 Feb. 1865.

وقت موجود تھے وہ سب بہت متاثر ہوئے - موصوف نے اپنی تقریر میں اس موقع کی اہمیت کو سامعین کے روبرو واضح کیا —

اس کے کچھ عرصہ بعد موصوف نے ایک نوجوان کو جو ہندوستانی زبان بخوبی جانتا تھا اور اب تک بچوں اور نو مسیحیوں کو " سوال و جواب " کی مشق کراتا تھا (Catechist) کلکتہ کے شمالی محلوں کے لئے پاسٹر (Pastor) مقرر کردیا ہے - ان محلوں میں زیادہ تر انگریز یورشین اور پرتگیزی آباد ہیں —

اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں جنہوں نے اس سال داعی اجل کو لبیک کہا - سب سے پہلے ڈاکٹر Falconer کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کوئی دس سال کا عرصہ ہوا جب وہ ہندوستان سے تازہ تازہ واپس ہوئے تھے اس وقت میری ان سے ملاقات ہوئی تھی - موصوف ہندوستانی زبان بلا تکلف بولتے تھے - میں بھی ان کے ساتھ ہندوستانی میں گفتگو کرتا تھا - میں پہلی مرتبہ جب ان سے ملا تھا تو اس وقت ان کے ہمراہ (M. P. de Cavardie) بھی تھے جو ہندوستانی بولنا جانتے ہیں - انھوں نے یہ مشق پانڈیچری کے دوران قیام میں کی ہے —

اس سال Hugh Falconer کا لندن میں ۳۱ جنوری کو انتقال ہو گیا - آپ کلکتہ کے سرکاری باغ کے سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے - آپ ویلز میں پیدا ہوئے تھے - ۵۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کرگئے - پبلک میں آپ کا نام زیادہ مشہور نہیں ہوا لیکن لندن کے علمی حلقوں میں آپ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - آپ سنہ ۱۸۳۰ ع میں ہندوستان پہلی مرتبہ گئے اور اپنی عمر کے بہترین بیس سال اسی ملک کی خدمت میں صرف کئے - آپ علم نباتات و حیوانات کے ماہر تھے اور خاص کرکے Paleonthology میں

کہاں پیدا کیا تھا ۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا اور معلومات نہایت وسیع تھیں ۔ آپ کے انتقال پر لندن کے علمی حلقوں میں سے معلومات کا بیش بہا خزانہ ھمیشہ کے لئے ان کے درمیان سے اُٹھ گیا —

آپ ھی نے سب سے پہلے چاء اور کنکینا (Quinquina) کی کاشت شروع کرائی ۔ ھندوستان کے fossils کے متعلق بھی تحقیق کی تھی ۔ اس تحقیق کے نتائج برٹش میوزیم میں موجود ھیں جو خود آپ نے اپنی زندگی میں ترتیب دئے تھے ۔ اس خاص موضوع کے متعلق اور کہیں اتنی مفید معلومات نہیں مل سکتی ھیں * —

ان کے قدیم دوست کپتان Antony Troyer بھی ان کے انتقال کے کچھ دن بعد اس جہاں سے سدھار گئے ۔ لیکن وہ اپنی عمر طبیعی کو پہنچ چکے تھے ۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۳ برس کی تھی ۔ آپ سنسکرت اور فارسی کے عالم تھے اور ھندوستانی بھی تھوڑی بہت سیکھ لی تھی ۔ گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ کے ایڈکی کامپ رہ چکے تھے ۔ آپ عرصہ سے پیرس میں رھتے تھے چنانچہ یہیں آپ کا ۲ جون کو انتقال ھوا ۔ آپ کے انتقال پر شاعر کے یہ اشعار پڑھے جاسکتے ھیں —

" یہ دنیا اس کے لئے کس قدر شاندار ھے جو یہاں سے اپنے دل کو بنی نوع کی ھم دردی سے معمور کر کے جائے ۔ چنانچہ وہ آسمان کو روشن اور مہتم بالشان نظروں سے دیکھتا ھے اور مڑ مڑ کر اپنے ان دنوں کو دیکھتا ھے جو اس نے نیکی میں اور فرائض کی بجا آوری میں صرف کئے " † —

* Times , 2 Feb. 1865.

† Longfellow.

آپ کی میرے حال پر بڑی عنایت تھی۔ چنانچہ ہندوستانی کے متعدد قلمی نسخوں کی نقلیں آپ کی مدد سے میں نے کرائی تھیں۔ آپ کے "دبستان مذاہب" کے انگریزی ترجمے کی تکمیل کی جسے Shea نے شروع کیا تھا۔ "راج ترنگنی" کا بھی انگریزی ترجمہ آپ نے ختم کیا۔ اس کتاب کو کشمیر کی تاریخ سمجھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین پیرس کے Journal Asiatique میں نکلتے رہے ہیں —

Edward Place Stevenson کا بمبئی میں ۶۵ سال کی عمر میں ۲۱ جون کو انتقال ہوا۔ آپ Deccan Herald کے مدیر رہ چکے تھے۔ اس کے بعد Elphinston Institution کی مرکزی تعلیم گاہ کے صدر مدرس ہوگئے تھے۔ آخر میں احمد آباد کالج کی پرنسپلی انھیں تفویض کی گئی۔ آپ کی موت پر علم اور احباب دونوں نے ماتم کیا —

۳۰ اگست ایک اور مشہور مستشرق ہم میں سے اُٹھ گیا۔ میری مراد Alexander kinloch Forbes سے ہے جنھیں Justice Forbes بھی کہتے تھے آپ کا پونا میں انتقال ہوا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی کی شاخ کے آپ نائب صدر رہ چکے تھے اور بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ہندوستانی سے آپ کا تعلق ضمنی رہا لیکن گجراتی کی ترقی میں آپ نے بہت کوشش کی چنانچہ گجراتی زبان کو فروغ دینے کی غرض سے آپ نے اپنی صدارت میں ایک انجمن قایم کی اور تاریخ اور ادب العوام جیسے گیت وغیرہ جمع کئے۔ آپ کی کتاب "رس مالا" گجرات کے لئے وہی نوعیت رکھتی ہے جو کرنل ٹوڈ کی کتاب راجپوتانے کے لئے ہے۔ آپ کے انتقال پر ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی صدر Rev. Dr. Wilson نے ۱۴ ستمبر کے اجلاس میں آپ کے علمی کارنامے ایک ایک کر کے گنائے اور بتلایا کہ آپ کی زندگی نہایت بھرپور رہی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ

Forbes کا نام هندوستان میں لوگوں کو بہت عزیز ہے Sir Charles Forbes اور Duncan Forbes کے ناموں کے علاوہ James Forbes کاذکر کیاجو "Oriental Memiors" کے مصنف هیں اور Compte de Montalembat کے رشتہ میں دادا هوتے هیں—

۱۷ نومبر لندن کے قریب David Lister Richardson کا ۹۴ سال کی عمرمیں انتقال هوگیا ۔ آپ کلکتہ کے Hindou Metropolitan College کے پرنسپل رہ چکے تھے ۔ سنہ ۱۸۵۷ ع میں آپ هندوستان سے ولایت چلے آے تھے اور Court Circular کی ادارت قبول کرلی تھی ۔ بعد میں Allen's Indian Mail کے مدیر هوگئے تھے جس کی معلومات سے میں اپنے لکچروں کے لئے همیشه استفادہ کیا کرتا هوں ۔ آپ نے لارڈ 'میکا لے' کے ساتھہ هندوستانیوں میں مغربی علوم و فنون کو رواج دینے کے لئے بہت جد و جہد کی تھی ۔ اس کے علاوہ آپ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی چوٹی کے لوگوں میں سمجھے جاتے تھے —

میں ان مرنے والوں کا ذکر ایک مشہور هندو کے انتقال کے حالات بیان کرکے ختم کرتا هوں ۔ میری مراد جگن ناتھہ 'شنکر سیٹھہ' سے هے جن کا ابھی حال هی میں انتقال هوا هے ۔ ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے 'بمبئی' کے شہریوں نے یہ تجویز کی هے کہ ان کا ایک مجسمہ شہر میں نصب کیا جاے ۔ آپ الفنسٹن کالج کے بانیوں میں سے تھے اور مغربی علم میں تعلیمی تحریک کے روح رواں تھے ۔ اس کے علاوہ آپ "انجمن زرعی" کے بھی صدر رہ چکے تھے۔ مرنے سے کچھہ قبل آپ نے خواهش ظاهر کی کہ بھگوت گیتا پڑھی جاے' اپنے مکان سے پیدل برهنہ پا باهر آے برهمن گائیں لئے کھڑے تھے ۔ انھوں نے "گجیندر مکشا" پڑھنا شروع کی جو "بھگوت پران" کا ایک حصہ هے ۔ اس کے بعد 'وشنو' کے ایک هزار ناموں کا ورد کیا

گیا۔ اس کے بعد وہ جا کر لیٹے اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ مرنے سے کچھ پہلے ان کے جسم پر گنگا جل چھڑک دیا گیا تھا۔ جب جنازہ سرگھٹ کو جانے لگا تو ان کا بیٹا ننگے سر اور ننگے پیر اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں آگ تھی جس کو وہ اپنے باپ کی نعش جلانے کے لئے لئے جا رہا تھا۔ ساتھ میں سناروں کی جاتی کے کوئی پانچ سو لوگ تھے۔ راستہ میں غریب غرباء کو پانچ سو روپے تقسیم کئے گئے۔ نعش جلانے کے لئے صندل کی لکڑی، تلسی اور بلوا استعمال کئے گئے جب نعش جل چکی تو دودھ سے آگ بجھائی گئی اور ہر شخص نے اپنے گھر واپس آ کر اشنان کیا —

یہ سچ ہے کہ اس قسم کی رسومات کی بدولت یورپ اور ہندوستان میں بہت فرق ہے - لیکن دخانی جہازوں نے اور تار برقی نے ان دونوں ملکوں کے فاصلے بہت کم کردئے ہیں - اہل یورپ تجارت اور سیر سیاحت کی غرض سے ہندوستان جاتے ہیں اور اہل ہند بھی یورپ آنے لگے ہیں - اس سال ہندوستان کی سیاحت کے لئے Duke of Barleant اور شہزادہ فریڈرک آف ہالسیٹن گئے تھے - ثانی الذکر سنسکرت اور ہندوستانی زبان جانتے ہیں اور ' پیرس ' اور ' لندن ' میں باقاعدہ ان السنہ کی تحصیل کرچکے ہیں - ہندوستان سے آنے والوں میں نواب اقبال الدولہ بہادر شہزادہ اودھ کا نام قابل ذکر ہے - * میں ایڈورڈ ایچ پامر کے ساتھ آپ سے

---

* آپ شمس الدولہ کے پوتے اور غازی الدین حیدر کے بھائی ہیں جنہوں نے فارسی لغت " ہفت قلزم " لکھی تھی - آپ بھی ایک کتاب کے مصنف ہیں جس کا نام " اقبال فرنگ " ہے —

ملنے گیا تھا اور ہندوستانی میں آپ سے بہت دیر تک گفتگو رہی - میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ ایڈورڈ ' ایچ ' پامر ہندوستانی زبان میں اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور ہندوستانیوں کی قومی زبان میں انھوں نے مہارت بہم پہنچائی ہے .. " قومی زبان " میں نے اس لئے کہا کہ اہل ہند ایک قوم ہیں جیسا کہ کلکتہ نے Urdu Guide نے اپنی حال کی اشاعت میں لکھا ہے - انگریزی حکومت ہندوستانی میں جو تعلیم دے رہی ہے اس سے ہندوستان کے مختلف عناصر میں اتحاد پیدا ہوگا - ادھر مغربی تہذیب و تمدن کی بدولت مذہبی تعصب کم ہو رہا ہے غرض کہ انگلستان حتی المقدور ہر ممکن کوشش کررہا ہے اہل ہند ترقی کی راہ پر گامزن ہوں - بقول بائرن انگلستان چاہتا ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لے اور انھیں اپنے ساتھ وابستہ کرے —

> " دشمن کے دل کو موہ لینا اس پر فتح حاصل کرنے سے زیادہ اچھا ہے - فتح سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن فوری نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن اگر دشمن کے دل کو رام کر لیا تو اس کے دل سے ہمیشہ کے لئے بدی نکل جاتی ہے " —

—*—

ابسن اور اُس کی تصانیف

(۲)

از

[جناب عبدالشکور صاحب ایم - اے - بی - ٹی (علیگ)

لکچرر شاسکری کالج - ڈربن - جنوبی افریقہ]

سنہ ۱۸۶۸ ع کے قریب ' ابسن کی وضع قطع میں ایک انقلاب پیدا ہوا - یہ کایا پلٹ ایسی حیرت انگیز تھی کہ اس کے دوست بھی کچھ نہ سمجھ سکے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے ' اب تک ' ابسن کی داڑھی بہت لمبی ' گھنی اور بے ڈھنگی تھی - اُس کا لباس ہمیشہ بے ترتیب اور بے تکا ہوتا تھا ' ٹائی کی گرہ ' اور کالر کی درستی کا وہ کبھی احسان مند نہ ہوا ' کوٹ اور پتلون پر اکثر میل جما ہوتا تھا ' مگر اب یہ حالت تھی کہ وہ مخمل کا فراک کوٹ ' سفید صدری ' کلف دار گریبان کی قمیص پہنتا تھا اور سفید بوٹائی لگاتا تھا ' اور داڑھی کی کتر بیونت میں بھی خاصا اہتمام کرتا تھا - سنہ ۱۸۶۹ ع میں اس کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا جو ناروے ' سویڈن اور ڈنمارک کی زبانوں کی اصلاح کے لئے بنائی گئی تھی ' سویڈن کے پائے تخت کے لوگوں نے ابسن کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھا ' اُن کا خیال تھا کے بریلنڈ کا مصنف کوئی بوڑھا ' کھوسٹ ' گوشہ نشین '

عزلت گزیں ہوگا ، مگر ابسن جوانوں کی شان سے طرح دار لباس پہنے نمودار ہوا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی - اس وقت وہ بہت مہذب ، خوش سلیقہ ، خوش پوش نظر آتا تھا ، اس کی باتوں میں ظرافت کی چاشنی تھی اس کے لب و لہجے میں دلکشی تھی اور اس کے انداز میں رعنائی کا عنصر غالب تھا - اسی زمانہ میں ایک دن شاہ چارلس نے ابسن کو تھیٹر میں اپنے پاس شاہی نشست گاہ میں بلاکر بٹھایا اور دوسرے روز شاہی محل میں مدعو کرکے گستاف واسا (Gustava Wasa) کے تمغہ سے سر فراز کیا - انہیں دنوں اُسے ایک اور عزت حاصل ہوئی ، وہ ناروے کے نمایندے کی حیثیت سے نہر سوئیز کے افتتاح کی رسم میں بھیجا گیا - مصر میں اُسے ابوالہول کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر اس نے پیئر گنٹ میں کیا ہے - دریاے نیل کا سفر کرکے اور مصر کے عجائبات دیکھ کر وہ واپسی میں پیرس پہنچا ، اور کچھ عرصہ اس تاریخی شہر کے آرٹ کے نمونے دیکھنے میں مصروف رہا - اس مہم میں اُسے خدیو مصر کی جانب سے تمغۂ مجیدیہ عطا ہوا - ابسن کی بڑی آرزو یہہ تھی کہ ڈنمارک کی حکومت کی جانب سے اُسے کوئی اعزاز حاصل ہو ، یہ آرزو پوری ہوئی اور وہ سلسلۂ ڈینبروگ کا نائٹ بنایا گیا —

اس سر فرازی پر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اب میری تصانیف کی قدر میرے ملک میں پہلے سے زیادہ ہوگی —

اُس زمانے میں شمالی یوروپ کا ایک بڑا ادیب اور نقاد بریندز (Brandes) میونک (Munich) ہوتا ہوا ڈریسڈن پہنچا ، اُس نے ابسن کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے :—

" ابسن کی صورت میں وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں - جو اُس کے کلام میں نمایاں ہیں ' اس کے چہرے کی دائمی سنجیدگی اُس رقت قلب اور محبت کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتی ہے جس سے اُس کا دل لبریز ہے ' ابسن مضبوط اور توانا ہے ' اُس کا لباس نفاست اور خوش مذاقی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے ' اس کی رفتار دھیمی ' اس کا انداز بیاری بھر کم ہے اور اس کی ' حرکات و سکنات میں وقار و تمکین کی شان نظر آتی ہے ' اس کا سر بڑا ' اور سڈول ہے ' اُس کے بال لانبے اور گھنے ہیں اور اب سفید ہو چلے ہیں ' اُس کی پیشانی جو چہرہ کو گھیرے ہوے ہے بلند اور کشادہ ہے ' اور پاکیزہ خیالات کا خزانہ معلوم ہوتی ہے - جب وہ خاموش ہوتا ہے تو اس کا منھہ کچھہ اس طرح بند ہو جاتا ہے جیسے کسی نے ہونٹوں کو سی دیا ہو - مجلس میں ابسن بسا اوقات ساکت و صامت بیٹھا رہتا ہے ' اور کبھی کبھی اس پر ایسی محویت طاری ہوتی ہے کہ گویا وہ اپنی روح کے مندر کا پجاری ہے " -

ابسن کے ڈراموں میں انسان کی خودی (Self) پر بہت زور دیا گیا ہے ' برینڈ اور پیئرگنٹ میں فاضل مصنف نے خودی کے دو جدا گانہ پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے - برینڈ کی شخصیت ایک طاقتور چٹان کے مانند ہے - دنیا کی ساری چیزیں جو برینڈ کو عزیز ہوسکتی ہیں اس چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں - ابسن برینڈ کی خوفناک تعلیم و تلقین سے اپنے اہل وطن کے لئے تازیانۂ عبرت کا کام لیتا ہے - اس کے بر خلاف پیئر کا اصول تو یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کے قانون پر

کاربند ہو مگر عملا وہ اپنے نفس کی ہر خواہش کو رندانہ اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے پورا کرتا ہے ' گویا پیئر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ابسن نے اپنے ملک والوں کو ان کی کمزوریوں کی تصویر دکھائی ' ان دونوں ڈراموں کو غور سے پڑھئیے تو آپ کو اس ہیجان اور بے اطمینانی کا پتہ چل جائے گا جو ابسن کے دل و دماغ پر اس وقت طاری تھی ' وہ خود یہ نہ جانتا تھا کہ نظام عالم میں قوت ارادی اور شخصیت کو کیا جگہ دینا چاہئیے ' ایک شخصیت اپنے کڑے اصولوں سے انسان کو تباہ کرکے چھوڑتی ہے ' دوسری سر سبز ہوتی ہے لیکن حیات کی ہر منزل پر ایک نیا سوانگ بھرتی ہے ' اور موت کے سامنے آکر بمنزلہ صفر رہ جاتی ہے - برنارڈ شا کا خیال ہے کہ اگر سنہ ۱۸۶۷ میں ابسن مر جاتا تو گویا وہ خود اپنا مدعا سمجھے بغیر دنیا سے رخصت ہوتا ' اس موقعہ پر شا نے ایک نہایت دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے جسے ہم ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں —

شا کہتے ہیں کہ شاعر جو کچھ صفحۂ قرطاس پر لکھتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود اُسے پوری طرح سمجھ بھی لے ' اور دوسروں کو سمجھا بھی سکے ' اس کے معنے یہ ہوئے کہ شاعرانہ الہام کی بلاغت بعض وقت شاعر کے فہم و ادراک سے بالا تر ہوتی ہے ' اور اس لئے اس کے کلام کی تحلیل کر کے اس سے اُس کا مفہوم دریافت کرنا ایک نہایت غیر شاعرانہ حرکت ہے ' ورڈسورتھ کے الفاظ " ہم چیر پھاڑ کے شوق میں (شعر) کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں " اور فارسی کا مشہور فقرہ " شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد " اسی غیر شاعرانہ تحلیل کی جانب اشارہ کرتے ہیں ' چنانچہ برینڈ اور پیئر گنٹ کی تصنیف کے بعد ابسن اس غور و فکر میں ڈوبا ہوا

نظر آتا ہے کہ آخر یہ میں کیا لکھہ گیا ' چنانچہ " شہنشاہ جولین " صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتا ہے ' اور ابسن وثنیت * و عیسائیت کا ایک مرکب طیار کر کے دنیا کے امراض کا مداوا پیش کرتا ہے ' ابسن کے دل میں کفر و عیسائیت کی جنگ مدت سے چھڑی ہوئی تھی ' مگر اس کی تسکین نہ اس سے ہو سکتی تھی نہ اُس سے ' وہ وثنیت سے بھی اُسی قدر خائف اور ہراساں ہے جس قدر عیسائیت سے بد دل اور نالاں ہے ' اس لئے ' ابسن جولین کی آڑ میں ایک تیسری سلطنت کی تعمیر میں مصروف ہوتا ہے ؛ جہاں انسان کے افعال کا معیار نہ رسم و رواج ہوگا ' اور نہ عقاید و روایات ' بلکہ خود اُس کا اندرونی احساس شرافت - جہاں خدا کی تلاش میں نہ وادی سینا میں جانا ہوگا ' اور نہ کوہ اُلمپس پر ' بلکہ خدا خود حواس ' قوت ارادی ' اور روح کے قریب آجائے گا - ابسن کی نظر میں دو چیزیں ہیں ' ایک تو عیسائیت کا جذبہ قربانی و ایثار ' اور دوسرے یونان کی آزادی روح ' وہ ان دونوں کو متحد کرنا چاہتا ہے ' اور ان کے امتزاج سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کا آرزو مند ہے —

" شہنشاہ اور گالیلی † " کا ڈراما دو حصوں پر مشتمل ہے ' پہلے حصہ کا نام " قیصر کا ارتداد " ‡ ہے ' اور اس کے پانچ ایکٹ ۱۵۵ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ' دوسرے کا نام ہے شہنشاہ جولین ' اور اس کے پانچ ایکٹ ۳۰۳ صفحہ تک چلے گئے ہیں ' ڈراما میں مذہب ' فلسفہ ' اور مابعدالطبیعات تینوں کا رنگ موجود ہے ' لیکن یہ چیزیں سطحی ہیں ' کہیں گہرائی

* Heatheniesm. † Emperor and Galilean.

‡ Caeser's Apostacy.

نہیں پائی جاتی ' ڈراما کی داستان میں یہ روانی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُبل رہا ہے ' مختلف منظروں میں اشخاص اور واقعات اُمڈے چلے آتے ہیں ' لیکن ڈراما دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ استیج کے لئے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ پڑھنے کے لئے ۔ یہ واضح رہے کہ یہ ابسن کا شاہکار نہیں ہے ' بلکہ محض تعلیم و تبلیغ کا ایک ذریعہ ہے ۔ اس لئے اس میں آرٹ کی اعلیٰ خوبیوں کو تلاش کرنا بے سود ہے یوں تو "گڑیا کا گھر" بھی ایک خاص درس کا حامل ہے ' لیکن اس ڈراما میں مذہب اور فلسفے کے مسائل پر بہت زور دیا گیا ہے —

پہلے حصے کا پہلا ایکٹ قسطنطنیہ میں شروع ہوتا ہے ' ایسٹر کی رات ہے ' شاہی محل کے قریب شاہی گرجا نظر آرہا ہے ' سرو کے درختوں کی قطاروں میں سے ایشیا کے ساحل اور باسفورس نظر آتے ہیں ' گرجے میں حمد کے گیت کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ اس کے بعد Phocion یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ شہنشاہ نے اس امر سے ناخوشی ظاہر کی ہے کہ عیسائی کفار سے اس طرح ربط ضبط رکھتے ہیں ۔ گویا ان دو جماعتوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہے ۔ یہ ڈراما کے موضوع کی جانب اشارہ ہے ۔ اس کے بعد استیج پر جولین نمودار ہوتا ہے ' جو اس وقت اُنیس سال کا نوجوان تھا اُس کے ساتھ شہزادی ہیلینا (Helena) بھی نظر آتی ہے ۔ ایک کمزور اور معمولی دلچسپ کیریکٹر کی طرح ڈراما کے بعض غیر اہم حصوں میں اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہوجاتی ہے ۔ اس ڈراما کا ہیرو دراصل جولین ہے جس کی شخصیت فی الحال تو ایک ناشگفتہ کلی

کی طرح ہے ' لیکن دوسرے حصہ میں اس کی ساری دماغی ' جسمانی اور روحانی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں ' اور وہ میدان جنگ ' سریر سلطنت ' مذہبی مناظروں ' اور عامی مباحثوں میں اپنا جوہر دکھاتا ہے - جولین قسطنطنیہ کی زندگی سے بد دل ہے ' وہ شہنشاہ سے التجا کرتا ہے کہ وہ مصر کی جانب روانہ کر دیا جائے ' وہ کہتا ہے کہ یہاں میری روح سخت اذیت میں ہے ' بڑے بڑے فاسد خیالات مجھے گھیرے رہتے ہیں ' نو دن سے میں بالوں کی قمیص * پہنے ہوئے ہوں لیکن اُس سے بھی مجھے تسکین نصیب نہیں ہوتی ' اس کے بعد جولین کا ایک دیرینہ دوست اگاتھن (Agathon) اسٹیج پر آتا ہے ' اور دونوں ایک دلچسپ مکالمہ میں منہمک ہو جاتے ہیں ' اسی دوران میں اُس کا دوست کہتا ہے —

" جولین ! کیا یہ خبر صحیح ہے کہ شہنشاہ تمھیں تخت و تاج کا وارث بنانے والے ہیں "

جولین :- " ایسی خطر ناک باتوں کو زبان پر نہ لاؤ ' مجھے نہیں معلوم کیسی بے سروپا خبریں گشت لگاتی ہیں ... "

آگے چل کر اسی سلسلہ میں جو لین کہتا ہے :-

" اے میرے محافظ ! کاش میں اس کفرستان سے بھاگ نکلوں ' یہاں رہنا ایسا ہے جیسا کہ ایک شیر کی ماند میں رہنا "

اسی دوران میں جولین کی ملاقات ایک فلسفی سے ہوتی ہے ' جو اُسے پیروگلیلای † کا لقب عطا کرتا ہے ' لیکن جولین کہتا ہے کہ اگر ظاہری لباس کے امتیاز سے میں گلیلاین نظر آتا ہوں لیکن اصل میں حق کا متلاشی فلسفی

---

* ریاضت کا ایک طریقہ ہے — † حضرت عیسیٰ سے مراد ہے

هوں ' معامله طول پکڑتا هے ' اور فلسفی جولین کے سامنے یه اعتراض پیش کرتا هے —

" ایک پوری شاندار دنیا ایسی هے جو تم لوگوں کی نگاهوں سے مخفی هے ' اُس دنیا میں هماری زندگی دائمی عید کے مانند خوش آئند هوتی هے ' همارے بالوں میں گلاب کے پھول آویزاں هوتے هیں ' همارے هاتھوں میں لبالب پیالے نظر آتے هیں ' اور هم مقدس مجسموں کے درمیان گیت گاتے هوتے هیں ' اُس دنیا میں اتحاد خلیج ایک روح کو دوسری روح سے جدا کرتے هیں ' اور فضا میں دور تک پھیلاتے چلے جاتے هیں —

(پہلا ایکٹ)

اس گفتگو کے بعد فلسفی باهر چلا جاتا هے ' اور جولین پھر اپنے دوست اکاتھن سے باتیں کرنے میں مصروف هو جاتا هے ' جولین اس پر مصر هے که میں اب ان لوگوں میں نہیں رہ سکتا ' میں یه محسوس کرتا هوں که عیسیٰ مسیح نے مجھے ترک کر دیا هے ' میں یہاں بدی کی طرف مائل هوتا جاتا هوں ' اکاتون اُس سے اُس بشارت کا ذکر کرتا هے جو اُسے ان دنوں هوئی تھی۔

" یکایک میں نے دیوار کے قریب ایک تیز روشنی دیکھی جس کے جلوے میں مجھے ایک شخص لبادہ پہنے هوئے نظر آیا اس کے سر کے چاروں طرف ایک روشن حلقه تھا ' اس نے مجھ سے کہا ! اکاتون اُٹھو ' اس شخص کو تلاش کرو جو اس سلطنت کا وارث هوگا ' اس سے کہو که شیر کی مانند میں جاکر شیروں

سے جنگ کرے "

اس کے بعد ہی شہزادہ گیلس (Gallus) اسٹیج پر آتا ہے اور جولین کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ شہنشاہ تم کو تخت کا وارث اور ولیعہد بنانا چاہتا ہے ' لیکن جولین کہتا ہے ' کہ

" مجھے ایک اس سے بڑے شہنشاہ نے منتخب کرلیا ہے "

اس موقع پر جولین اپنے پرانے اُستاد ہے کے بولی آس سے ملتا ہے جو ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے :—

" عیسیٰ مسیح تم سے خفا ہیں ' تمھاری حریت کی
روح نے اُنھیں خفا کر دیا ' تمھارے خیالات میں محبت
کا شائبہ تک نہیں ' تم دنیاوی غرور میں سر شار ہو "

اس مکالمہ کے بعد ہی جولین کو شہنشاہ کی جانب سے پرگے مس جانے کی اجازت مرحمت ہوتی ہے ' حالانکہ وہ حقیقتاً ایتھنس جانے کا خواہش مند ہے —

دوسرے ایکٹ کے شروع ہی میں باسی لی آس اور جولین میں ایک دلچسپ مکالمہ شروع ہوتا ہے ' اور اول الذکر اس خط کا تذکرہ کرتا ہے جو اُس کے پاس اس کی فاضل اور حسین بہن ماکرینا (Makrina) نے بھیجا تھا ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں —

" جب تم شہنشاہ کے عزیز کا جو تمھارا دوست ہے حال لکھتے ہو
تو میری روح مسرت سے لبریز ہو جاتی ہے ' جس بے باکی
اور دلیری کے ساتھ وہ ایتھنس میں داخل ہوا اس کا تذکرہ
یقیناً عہد قدیم کی تواریخ کا ایک ورق ہے ' مجھے ایسا معلوم
ہوتا ہے گویا حضرت داؤد نے پھر سطح گیتی پر قدم رکھا ہے

کہ کفار کے حامیوں کی سر زنش کرسکیں ' اس جنگ میں اور
اس کے بعد خدا اُس کا نگہبان رہے " —

ان الفاظ کو سنتے ہی جولین جوش سے بے قابو ہوجاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ خدا جانے ساری دنیا اس سے کس بات کی آرزو مند ہے ' اور کیا اہم کام کرانا چاہتی ہے ' اس پر باسی‌لی اس اُسے یقین دلاتا ہے کہ دنیا کے سارے عیسائی آپ کی راہ دیکھہ رہے ہیں ' یہ سنتے ہی جولین بدحواس ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ یا الہہ ' ایک طرف آسمان کی سی بلندی ہے ' دوسری جانب ایک عمیق غار ہے ' مشرق اور مغرب سے کیوں صدائیں آرہی ہیں کہ میں عالم عیسائیت کو سنبھالوں ' آخر وہ عالم عیسائیت ہے کہاں ؟ شہنشاہ کے یہاں یا قیصر کے یہاں ؟ عالی خاندان ذی اقتدار اُمرا کے یہاں یا کمزور اور عیاش درباریوں کے یہاں ؟ یا ان علما اور فضلا کے یہاں جنھوں نے قدیم یونان کے سرچشموں سے اخذ حسن کیا اور علوم حاصل کئے ؟ باسی لی‌اس اس کا ایک مبہم سا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی تلاش بزرگان دین کی کتابوں میں کرنا چاہئے ' مگر اس جواب سے جولین کی تشفی نہیں ہوتی ' اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ میں کتابوں پر اکتفا نہیں کرسکتا ' مجھے زندگی کی تلاش ہے ' میں روح سے بلا واسطہ تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں ' اُس کے خیال میں کتابوں کی مدد زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتی بلکہ تکمیل انسانی کے لئے غیبی امداد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جولین کا خیال ہے کہ حقیقی زندگی الہامی لٹریچر ' اور کفار کے فلسفہ کے درمیاں ڈانواڈول پھرنے سے اس کا سر چکرا گیا ہے ' وہ ایک شدید تاریکی میں گرفتار ہے جہاں ہاتھہ کو ہاتھہ نہیں سوجھتا ۔ وہ گھبرا کر بار بار

کہتا ہے کہ وقت آن پہنچا ، اب وحی نازل ہونا چاہئیے ، بارش عرفان کی اشد ضرورت ہے ، حسن قدیم کا حسن زائل ہوچکا ، اور حکمت جدیدہ کی صداقت اب خواب و خیال ہوگئی ، اس لئے الہام کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں - چنانچہ اگر عیسیٰ مسیح مجھ سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے صاف صاف ہدایت کریں - اسی تذبذب اور بے چینی کے عالم میں باسی‌لی‌اس کے سختی سے منع کرنے کے باوجود جولین اِفی سس کی طرف رجوع کرتا ہے ، جو اول‌الذکر کے خیال میں ایک عیار شعبدہ باز ہے - اس کے بعد جولین اور گریگری کے درمیان گفتگو شروع ہوجاتی ہے - جولین اُسے یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اس کا سینہ نور حقیقت سے معمور ہوچکا ہے - اس موقع پر جولین کی زبان سے ان حقائق کا انکشاف ہوتا ہے " پر ہر نسل میں ایک ایسی روح پیدا ہوتی ہے جس میں انسان کامل کا جلوہ نظر آتا ہے ، وہ جلوہ حامل شریعت حضرت موسیٰ کی ذات میں چمکا تھا ، مقدونیہ کے سکندر اعظم کی شکل میں اس نے فاتح کی شان دکھائی ، اور اسی طرح عیسیٰ مسیح میں اس کی تکمیل نظر آئی " اس کے بعد جولین ایک پیغمبر کی حیثیت سے پیشین گوئی کرتا ہے —

" میں کہتا ہوں کہ یہ مادہ پرست نسل بہت جلد مٹ جائے گی جو آنے والا ہے اس کا جلوہ جسم کی بجائے روح میں چمکے گا ، آدم میں روح اور جسم کا توازن موجود تھا لیکن اس کے بعد یہ توازن قائم نہ رہ سکا ، کیا موسیٰ کی زبان بند نہ رہتی تھی ؟ کیا سکندر کو جوش دلانے کے لئے مصنوعی ادویہ اور شراب کی ....

ہم اس جنگل میں اپنے آپ کو پوشیدہ کریں گے جو دریائے فرات کے کنارے پر واقع ہے ، اور وہاں سے ایک نئی قوم برآمد ہوگی جو حسن اور توازن میں مکمل ہوگی ، وہاں روح کی سلطنت قائم ہوگی " —

جولین اور Maximus کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ اس لئے اہم اور دلچسپ ہے کہ اس سین میں جولین ارواح سے ہم کلام ہوتا ہے ' چنانچہ جولین ایک روح سے سوال کرتا ہے کہ میری پیدائش کی علت غائی کیا ہے - وہ روح جواب دیتی ہے —

" روح کی خدمت کرنا "

جولین پھر دریافت کرتا ہے :- میرا مشن کیا ہے ؟

روح :- سلطنت قائم کرنا —

جولین :- کونسی سلطنت ؟

روح :- سلطنت !

جولین :- کس طریقہ سے ؟

روح :- آزادی کے طریق سے —

جولین :- وضاحت سے بتاؤ ' آزادی کی کونسی راہ ہے ؟

روح :- وہی جو ضرورت کی راہ ہے -

جولین :- کس قوت سے ؟

روح :- قوت ارادی سے !

جولین :- میں کیا ارادہ کروں ؟

روح :- جو لا بدی اور ناگزیر ہو —

اس کے بعد روح غائب ہوجاتی ہے اور اس معمہ کے حل کے لئے جولین میک سی مس کی جانب متوجہ ہوتا ہے —

میک سی مس ' تین سلطنتیں ہیں '

جولین - تین ؟

میک‌سی‌مس - پہلی سلطنت وہ ہے جو شجر علم پر قائم ہے '
دوسری وہ جس کی بنیاد صلیب پر رکھی گئی -

جولین- اور تیسری ؟

میک سی مس - "تیسری سلطنت * ایک بڑی پر اسرار سلطنت ہے ' اس کی بنیاد شجر علم اور صلیب پر ساتھہ ساتھہ رکھی جاے گی ' کیوں کہ اُسے دونوں سے اسی قدر محبت ہےجتنی نفرت ہے "—

اس موقعہ پر ابسن کے خیالات موجودہ علم النفس کے نتائج سے اختلاف رکھتے ہیں - ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری قوت ارادی آزاد ہے - ہم جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں ' اسی لئے قیامت کے دن ہمارے اعمال و افعال کی جزا و سزا ہو گی ' لیکن ابسن کا خیال ہے کہ فطرت جس سے جو کام چاہتی ہے لے لیتی ہے ' پھر اسے چون و چرا کا موقع نہیں دیا جاتا - قوت ارادی کی یہ پابندی بظاہر خلاف عقل معلوم ہوتی ہے ' کیوں کہ پھر عذاب و ثواب کا مسئلہ بے معنی ہو جاتا ہے ' لیکن اس نظریہ پر ابسن بہت سختی سے قائم ہے —

جولین - " تو نے کیوں دستگیری کی ؟ "

---

* The third is the empire of the great mystery; that empire which shall be founded on the tree of knowledge, and the tree of the cross together. (act, III.)

' ابسن اس امتزاج کا نہایت آرزو مند ہے ' یہی اس کی بڑی آرزو ہے ' اور اسی کو وہ بنی نوع انسان کی نجات کا وسیلہ تصور کرتا ہے ' اس خیال کو ڈرامہ کی جان سمجھنا چاہئے !

آواز - کیوں که یه میری مرضی تھی —

جولین - تیری مرضی کیا تھی —

آواز - وھی جس پر میں مامور ھوں —

جولین - تجھے کس نے مامور کیا —

آواز - مالک نے —

جولین پانچویں ایکٹ میں سالست سے گفتگو کرتے ھوے کہتا ھے' بے شک تمھارے دیوتا دور ھیں' وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتے' وہ کسی پر بار نہیں ڈالتے' وہ ھر شخص کے لئے عمل کی گنجائش چھوڑ دیتے ھیں - کیا کہنا یونانیوں کی اس حقیقی خوشی کا! کیا کہنا ان کے جذبۂ آزادی کا!

اس سے صاف پته چلتا ھے که جولین اس خوشی اور آزادی کا کس درجه آرزو مند ھے' وہ شب و روز انھیں باتوں کو حاصل کرنے کی تدبیریں کر رھا ھے' اور اسی وجه سے وہ کفر و عیسائیت کی خوبیوں کا ایک مرکب طیار کرنا چاھتا ھے' مگر 'میک سی مس' اُسے بار بار ڈراتا ھے' تم اضداد کو جمع نہیں کرسکتے' اور اسی لئے اس تاریکی میں غلطاں و پیچاں ھو' مگر یه یاد رکھنا چاھئے که جولین عیسائیت سے اُسی قدر متنفر ھے جس قدر کفر و الحاد سے' وہ کہتا ھے :—

" اگر میری روح ایک مہلک جذبۂ نفرت سے لبریز ھو کر اس شخص سے انتقام لینے پر مجبور ھوتی ھے جو میرے اعزا کا قاتل ھے تو مذھب کا حکم ھوتا ھے - " اپنے دشمن سے محبت کرو "

اگر میرا دماغ حسن کی تلاش میں خوشنما مناظر اور قدیم یونانی رسوم کا جویاں ھوتا ھے تو عیسائیت برھم ھوجاتی ھے'

اور ملکارتی ہے "صرف اس شے کی جستجو کرو جس کی ضرورت ہو۔ اگر میں دلی آرزو کے ساتھ کسی شے کی جانب متوجہ ہوتا ہوں تو پرہیزگاری کا بادشاہ مجھے یہ کہہ کر ڈراتا ہے "جسم کو ہلاک کر ڈالو تاکہ روح کی پرورش ہوسکے"۔ جس دن سے گلیلی کا حکیم دنیا کا حکمراں ہوا ہے ہر فطری شے خلاف قانون قرار دیدی گئی ہے۔ اُس کے ساتھ رہنا موت ہے۔ محبت اور نفرت دونوں جرم ہیں' کیا اس نے انسانی آب و گل کو بالکل بدل دیا؟ کیا دنیا میں رہنے والا انسان بالکل ویسا ہی نہیں جیسا کہ پہلے تھا؟ ہماری اصلی اور صحیح فطرت اس کے حکم کے خلاف بغاوت کرتی ہے' پھر بھی ہمیں چار و ناچار اپنے ارادے کو مغلوب کرنا پڑتا ہے"۔
(ایکٹ پانچواں)

میکسی مس اور جولین کے درمیان یہ فلسفیانہ اور دلچسپ مکالمہ جاری رہتا ہے' یہاں تک کہ اس سین کے آخر میں ہم جولین کا ایک شہنشاہ کی حیثیت سے خیر مقدم کرنے کے لئے طیار ہوجاتے ہیں' اور سلگت کے یہ الفاظ:—

"تیری ہی سلطنت ہے' تیری ہی طاقت اور شان ہے"۔

دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں—

ڈراما کا پہلا حصہ یہاں ختم ہوتا ہے' اس حصہ میں ہم نے خیر و شر' روشنی و تاریکی' نیکی و بدی' کفر و مذہب کی کشمکش دیکھی' اور دونوں جانب کے حکما کی دلیلیں سنیں' اور جولین کو "ہر کہ آمد و عمارت نو ساخت" کا مصداق پایا۔ ظاہر ہے کہ محض وثنیت دنیا کی

بیماریوں کی ہمیشہ دوا نہیں ہوسکتی اور محض عیسائیت بھی اقوام کے مسائل سلجھانے کے لئے نا کافی ہے - ابسن بخوبی واقف تھا کہ یورپ کی عالمگیر فرماں روائی کے لئے اس مذہب کی بنیاد قائم کرنا سراسر نادانی ہے ' اس لئے وہ تیسری سلطنت کی بنا ڈالتا ہے ---

ڈرامے کے دوسرے حصہ کا نام " شہنشاہ جولین " ہے - پہلے ہی سین میں قسطنطنیہ کے بندرگاہ پر ہم جولین کو شاہی لباس میں شہنشاہ قسطنطین کی لاش کا منتظر پاتے ہیں ' تخت شاہی تو جولین کے ہاتھہ آگیا لیکن اس کے دل پر اب تک خوف اور ہراس طاری ہے اور وہ مے سرتی نس سے بار بار یہ کہتا ہے کہ ایسے جلیل القدر ' نیک دل اور ہر دلعزیز شہنشاہ کے بعد تخت پر بیٹھنے کی میری ہمت نہیں پڑتی - کاش میں گوشۂ تنہائی ہی میں زندگی گذار سکتا ' ایسے موقعہ پر اس کا دوست مے سرتی نس اس کی تسلی کرتا ہے اور اُسے یقین دلاتا ہے کہ آپ سے بہتر شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا جو تخت کے لئے موزوں ہو ' اس کے بعد وہ جولین کو فرماں روا کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے :---

" شب و روز عوام الناس کی بہبودی کی فکر کرنا ' صرف نام کے آقا نہ بننا ' حقیقت میں پبلک کا خدمت گذار ہونا ' میدان میں تمہاری جگہ سب سے آگے ہے ' اپنے لئے کچھہ نہ لینا ' بلکہ سارے تحائف و انعامات دوسروں کو بخش دیا کرنا ' تمہارے انصاف میں نہ ظلم کا شائبہ ہو اور نہ غفلت کو جگہ ملے "-

اس کے بعد جولین اپنی روا داری کی پالیسی کو پوری وضاحت کے ساتھہ بیان کرتا ہے ' اور کہتا ہے کہ کل رعایا کو مذہب اور اعتقادات کے بارے میں کامل آزادی حاصل ہو گی - جن کی روح کو عیسائیت کے پیغام

میں سکون حاصل ہو وہ اس مذہب کے پابند رہیں' لیکن میں خود اس خدا پر تکیہ نہیں کرسکتا جو ہمیشہ میرا دشمن رہا ہے' مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے گال کی سرحد پر جو فتوحات حاصل کی ہیں وہ اُن ہی دیوتاؤں کی مدد سے حاصل ہوئیں جو سکندر اعظم پر مہربان تھے' انہی دیوتاؤں کے سایۂ عاطفت میں میں سارے خطرات میں سے صاف بچ کر نکل آیا۔ اس لئے میں ان خداؤں کے سامنے کیسے نا شکر گذار بن سکتا ہوں' میں ان کو پھر انہیں بلند مقامات پر جگہہ دینا چاہتا ہوں جو آرٹ کے بہترین نمونوں سے بارہا مرصع ہو چکے ہیں' لیکن گلیلیوں کے خدا کے ساتھہ بھی کوئی نا روا سلوک نہ کیا جاے گا اور نہ عیسائیوں کے گرجوں سے تعرض ہوگا۔ لیکن سے مرتّی نس اپنی تنگ نظری کا ثبوت یہ کہہ کر دیتا ہے کہ شہنشاہ جو آگ پرستش کے وقت روشن کرتا ہے اسی سے مشتعل ہو کر نئے نئے علوم و فنون کی مشعلیں بلند ہوں گی' اور علوم کے ایک احیاء نو کی ابتدا کا آغاز کریں گی —

بعد ازاں جولین کو یہ خبر ملتی ہے کہ تیو' اور سرندیپ کے بادشاہوں کے ایلچی اس کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتے ہیں' اُن سے ملاقات کرنے سے قبل بادشاہ شاہی حجام کو طلب کرتا ہے' لیکن اُس کا لباس فاخرہ دیکھہ کر سخت برہم ہوتا ہے' اور طیش میں آکر اس سے دریافت کرتا ہے —

"تونے کونسے دیوتا کا مندر لوٹا ہے ؟ کیا تونے شاہی خزانہ میں
ہاتھہ مارا کہ تجھے یہ شان و شوکت حاصل ہو گئی" ؟ —

بادشاہ کا خیال ہے کہ سرکاری عملہ میں ابتری پھیلی ہوئی ہے' اس لئے وہ حکم نافذ کرتا ہے کہ پوری سختی سے جانچ پڑتال کی جاے اور جو قصور وار ہو وہ ایک قلم علحدہ کردیے جائیں۔ اس کے بعد وہ ایلچی کو

شرف باریابی عطا کرتا ھے' اور اس کے رخصت ہونے پر اُرسواس سے بات چیت کرنے لگتا ھے۔ اس موقعہ پر اُرسولس جولین کی تھکندت کو ایک ھلکی سی تھپس لگاتا ھے' اور اُسے یقین دلاتا ھے کہ یہ ایلچی قسطنطین کی فرمان روائی کے چرچے سن کر روانہ ھوئے تھے نہ کہ جو لین کے۔ پھر بھی جولین کا اقبال ترقی پر ھے' اس کی رعایا کا ایک گروہ اُسے دیوتا جانتا ھے' اور اس کے جلوس پر پروانہ وار فدا ھوتا ھے۔ مگر جلوس کے بعد ھی اس کے خیال میں تبدیلی پیدا ھوتی ھے اور اس کے قدیم اُستاد ھے کے بولیآس کے درمیان ایک عالمانہ گفتگو شروع ھوتی ھے' اُستاد اپنے جلیل‌القدر شاگرد سے کہتا ھے کہ گو میں نے ساری عمر مطالعہ اور غور و فکر میں صرف کی لیکن میں اس کا اقرار کرنے آیا ھوں کہ میں گمراہ تھا' اور اس لئے میں نے اپنے شاگرد کو غلطی میں عمداً مبتلا نہیں کیا' آپ ان دیوتاؤں کا احسان مانئے جن کے آپ چھپتے ھیں' اس کے جواب میں جولین اپنے اُستاد کو یہ مژدہ سنا کر تسلی دیتا ھے کہ میں نے خود پرانی غلطی کا جوا اتار دیا' سورج کے غیر فانی خدا کو جس کے ھم سب اس درجہ ممنون احسان ھیں میں نے پھر وھی قدر و منزلت کی جگہ دی ھے' دولت و اقبال کی دیوی فار چونا کی میں نے خود ان ھاتھوں سے پوجا کی' اور اس وقت میں اسی لئے ذرا خستہ ھوں کہ ابھی تیونی‌سس کا ایک تیوھار منا کر آ رھا ھوں۔ یہ سن کر استاد کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رھتی —

رفتہ رفتہ جولین عیسائیوں سے سخت برھم ھوتا جاتا ھے' یہاں تک کہ ایک موقعہ پر یہ حکم دیتا ھے :—

"اپنے ساتھ سپاھیوں کا ایک دستہ لے جاؤ' جتنے کم بختوں کو اسیر کرسکو گرفتار کر ڈالو' پھر اُنھیں قید خانہ میں ڈال دینا' قیدی بقیہ ساتھیوں کا نام بتا دیں گے' ......"

لیکن اس کے بعد ہی جولین کی مڈ بھیڑ ' بشپ میرس ' سے ہوجاتی ہے -
یہ ایک بے خوف اور نڈر مذہبی پیشوا ہے اور جولین کے افعال پر اس کی سخت
سرزنش کرتا ہے ' اس پر جولین کہتا ہے :—

" تیرا خدا طاقتور نہیں ' میں تجھے دکھا سکتا ہوں کہ بادشاہ اس سے
زیادہ طاقتور ... "

پادری میرس ! گمراہ حیوان ! گرجا کے مردود بیٹے !! اب میں تیرے اوپر
قہر نازل کراؤں گا ! جولین! لعنت ' جولین شہنشاہ !! تجھ پر
لعنت ...... تیری آنکھوں اور ہاتھوں پر لعنت ' تیرے سر
اور تیرے اعمال پر لعنت "—

پانچویں ایکٹ میں آخر کار جولین دبے الفاظ میں اپنی ناکامی کا
اعلان کرتا ہے :—

" میں نے ابھی یہ خواب دیکھا کہ میں نے ساری دنیا کو زیر
نگیں کر لیا ' اور یہ حکم دیا کہ عیسائیوں کا نام تک دنیا
سے نیست و نابود کر دیا جائے ' اس کے بعد روحیں میرے پاس
آئیں اور انھوں نے میرے شانے پر بازو آویزاں کر دئیے - میں
فضا میں تیرنے لگا ' یہاں تک کہ میں ایک دوسرے عالم میں
پہنچ گیا - وہاں سے میں نے اس دنیا پر نظر ڈالی جس کو
میں نے عیسائیوں سے پاک کردیا تھا - مجھے خیال ہوا کہ میں نے
اچھا کیا - لیکن میک سی مس ! دیکھنا ' اس نئی سر زمین پر
ایک جلوس نمودار ہوا ...... اس جلوس کے وسط میں خود عیسیٰ
(مسیح) بہ نفس نفیس موجود تھے ' اور ان کی پشت پر
صلیب تھی " -

وہ اپنے دوست کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ایک اُمید موہوم ہے' یہ دراصل وہ خیال ہے جو اُس کے علم اور احساس کے بغیر اُس کے دل و دماغ پر طاری ہوتا جاتا ہے' اور رفتہ رفتہ اس کے ارادے میں تزلزل پیدا کر رہا ہے' اس کے بعد جولین ایرانیوں کے مدمقابل بر سر پیکار نظر آتا ہے اور ہم کچھ عرصہ بعد اُسے زخمی اور قریب مرگ دیکھتے ہیں۔ اس کے زخمی ہوتے ہی 'جووین' (Jovian) افواج کی سرداری شروع کر دیتا ہے اور عیسیٰ مسیح کا نام لے کر میدان جنگ میں اُتر جاتا ہے' اور ایرانی عساکر فرار ہوتے ہوے نظر آتے ہیں۔ مرنے سے کچھ دیر قبل ہم جولین کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ ابسن نے اپنے اس غیر فانی ہیرو کو ایسی دلکش اور فطری خصوصیات سے متصف کیا ہے کہ ہم خواہ مخواہ داد دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جولین کے دل میں خود اعتمادی اس قدر مکمل اور زبردست تھی کہ اس کی مثال کسی اور کیرکٹر میں بہت کم نظر آے گی۔ مرنے سے کچھ دیر قبل وہ یہی کہتا ہے کہ کاش! میری موت مجھے مہلت دیتی تو میں اپنی وہ کتاب تصنیف کر سکتا جو اب تک ناتمام ہے۔ یہ کتاب اس نے عیسائیت کے رد میں پوری قابلیت سے لکھی تھی۔ اس کے بعد وہ علانیہ کہتا ہے کہ میں نے دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر میں اب پشیمان ہوں؛ میں نے اپنی طاقت کو بہترین طریقہ سے استعمال کیا ہے' اور میں نے قصداً کبھی کسی شخص کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا۔ یہ اس کے کیرکٹر کے استحکام کی ایسی مثالیں ہیں کہ جس کی نظیر قرون وسطیٰ کے لٹریچر میں ذرا کم ملے گی۔ وہ اپنی ناکامی کو اُس آسمانی قوت کا ایک شعبدہ

تصور کرتا ہے جس پر اس کا بس نہیں - آخری لمحات میں میک ری نا اس کی تیمار داری کرتی ہے اور اس کے مرنے پر اس کے لئے دعاے مغفرت میں مشغول ہو جاتی ہے —

ابسن کے نقطۂ نظر سے تیسری سلطنت قائم کرنے کی یہ ایک ایسی سعی ہے جس میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی - ابسن کے زمانہ میں قرون وسطیٰ کی خصوصیات رفتہ رفتہ زائل ہو رہی تھیں' اور دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز تھا - وہ دور جو آج کل اقصاے عالم میں کار فرما ہے۔ ابسن وثنیت سے شاید اس لئے مانوس ہوا کہ اُس نے ناروے کی قدیم زبان کی پرانی پرانی کتابیں' قصے کہانیاں اور روایات بڑے غور و فکر کے ساتھہ پڑھی تھیں - اس کے علاوہ ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے اُسے یونان کا علم الاصنام اور ڈرامے ضرور پڑھنا پڑے ہوں گے' اس لئے وہ یونان کی روح آزادی کا اس درجہ دلدادہ ہے کہ اسے عیسائیت کی خوبیوں سے ملا دینا چاہتا ہے' اس کے برخلاف عیسائیت میں سے اُس نے صرف ایک شے پسند کی ہے' وہ اس مذہب کا جذبہ قربانی ہے —

اس ڈرامے میں ابسن کو آرٹ کے بجاے اپنے خیالات کی تبلیغ کی زیادہ فکر معلوم ہوتی ہے - اس لئے یہ ڈراما آرٹ کے اعتبار سے اس قدر نمایاں نہیں جیسا خیالات؛ اور دلائل کے لحاظ سے مشہور ہے - اول تو خود تیسری سلطنت کا خیال ایک انوکھا اور دلیرانہ خیال ہے۔ اس کے علاوہ جولین' مکرینا' میک‌سی‌مس' اور باسی لی اس کی عالمانہ اور فلسفیانہ بحثیں نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں' اور چونکہ جولین ایک مخصوص زمانہ اور ملک سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اُسے بہادری کے علاوہ علم و فضل' دقت نظر' بلندی خیال' شیریں گفتاری و فصیح بیانی سے متصف کیا گیا ہے'

اس لئیے وہ سپاہی اور ناظم ریاست ہونے کے علاوہ خطیب اور حکیم بھی ہے۔

ڈراما میں ناٹک کا رنگ بہت کم معلوم ہوتا ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ابسن نے اس ڈراما کو اسٹیج کے لئیے تحریر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے خیالات کو اس نے یہ صورت اس لئیے دی ہے کہ مکالمے اور مناظرے کا موقعہ آتا رہے، چنانچہ ڈراما میں قدم قدم پر مذہبی اور فلسفیانہ مباحثے اور مکالمے کثرت سے موجود ہیں —

گذشتہ صفحات میں ہم نے ابسن کی تصنیف "شہنشاہ اور گلیلی" کی خصوصیات پر پوری بحث کرلی ہے۔ اب قبل اس کے کہ ہم اس کی دیگر تصانیف کی جانب متوجہ ہوں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابسن کی لائف کو ختم کردیا جاے، اس کے بعد ہم پوری تفصیل کے ساتھہ اس کے دوسرے ڈراموں پر نظر ڈال سکیں گے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف کی لائف اُس کی تصانیف سے کم دلچسپ اور سبق آموز نہیں ہوتی۔ اس لئیے میں نے ابسن کی زندگی کے واقعات کو ذرا طوالت کے ساتھہ تحریر کیا ہے، اگر تصانیف کو مصنف کی روح اور شخصیت سے علحدہ کردیا جاے تو عموماً وہ تصانیف نیم جان اور بے کیف ہوجاتی ہیں۔ یہ اصول ابسن کی تصانیف سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سائنس، منطق، فلسفہ، مابعدالطبعیات، تاریخ، نجوم و ہندسہ کی تصانیف کا مصنف کی لائف سے بہت کم تعلق ہوتا ہے، لیکن اس کے بر خلاف ادب کی ساری اصناف مصنف کی روح اور شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں ہم اس کے خد و خال دیکھہ سکتے ہیں —

دس سال قبل ابسن ایک نا امید، مایوس، مقروض، شکستہ دل مصنف تھا، لیکن جب اس نے اپنے پچاسویں سالگرہ منائی تو اس کی حالت بہت کچھہ تبدیل ہوچکی تھی۔ ناروے، سویڈن، اور ڈنمارک میں اس کی شہرت

اچھی طرح پھیل چکی تھی، اور اس کے علاوہ انگلستان اور جرمنی کے ادیب بھی اس کا لوہا مانتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نا اُمیدی اور مایوسی دور ہونے لگی، اس کا افلاس دولت مندی، اور فارغ البالی میں تبدیل ہونے لگا، شکستہ دلی کی بجاے اس کے دل میں ہمت، جرأت، اور خود اعتمادی کی لہریں اٹھنے لگیں، رفتہ رفتہ اس کے سوشل ڈراموں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، اور وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈراما نویس مانا جانے لگا - ایک نقاد کا بیان ہے کہ میں شکسپیر کے بعد ہی بے تکلف ابسن کو جگہ دیتا ہوں - یہ راے محض ایک شخص کی راے نہ تھی بلکہ جرمنی، فرانس، انگلستان نے خود ابسن کی حیات ہی میں اسے سب سے بڑا ڈراما نویس تسلیم کر لیا تھا، اور اس کے ڈرامے بحر اوقیانوس کے دونوں جانب نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے- اس زمانہ میں ابسن میونک (Munich) میں مقیم تھا، اور روز شام کو ساڑھے سات اور ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان میں وہ قہوہ خانہ میکس میلین میں آتا، اور یہاں بیٹھ کر یا تو اخبار پڑھتا رہتا، یا اس قہوہ خانے کے مہمانوں کے خد و خال، چال ڈھال، چہرے مہرے کو نہایت غور و خوض کے ساتھ دیکھتا رہتا - یہ حقیقتاً فطرت انسانی کا نہایت عمیق مطالعہ تھا جو اس کے ڈراموں کے کیریکٹر کے لئے مفید ہوتا تھا۔ مگر چاہے آندھی آئے چاہے پانی برسے اس کا قہوہ خانے میں آنا ایک ناگزیر امر تھا - ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۸۸ ع کو ابسن کی ساٹھویں سال گرہ تھی، اُس وقت بھی وہ میونک میں مقیم تھا - اس روز ابسن کا مکان گلدستوں، گجروں اور پھولوں سے پٹا پڑا تھا، تحائف کی کوئی انتہا نہ تھی، مبارک باد کے تار اور خطوط دنیا کے ہر گوشے سے اُمڈے چلے آرہے تھے، گوشہ نشین ابسن تحائف کی بیشمار تعداد کو دیکھتا تو بار بار اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے

" آخر کوئی حد بھی ہے - میرے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں "
اور اس کی بیوی مسرت و شادمانی کا مجسمہ بنی ہوئی خانہ داری کے انتظام
میں مصروف نظر آرہی تھی ' یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک گوشہ نشیں کو آخرکار
دنیا نے اس کے عزلت کدے میں ڈھونڈھ نکالا ہے - چنانچہ بیورن سن کے تار کے
یہی الفاظ تھے : -

" آج دنیا گوشہ نشین کے دروازے پر آئی ہے "

غرض ابسن کی زندگی کے آخری ایام نہایت مسرت ' شادمانی ' فارغ البالی
اور علمی تحقیق میں بسر ہوے - میونک میں اس کا مکان مہمان نوازی کے لئے
ہمیشہ مشہور رہا ' گو اس کے ہاں مہمان بہت کم آتے تھے ' لیکن جو آتے تھے
وہ ابسن کی صحبت اور اس کی بیوی کی سلیقہ شعاری کا ایک گہرا نقش اپنے
دل پر لے جاتے تھے " شام کے وقت مسز ابسن اپنے شوہر کو ناولیں پڑھکر سناتی
تھی ' ابسن اپنی بیوی کی بہت قدر کرتا تھا - اور کہتا تھا کہ اس کا ذہن
بالکل آزاد ہے ' اور اس کی شخصیت مکمل ہے - اس میں شک نہیں کہ وہ
ذہنی بیداری ' علمی ذوق اور غور و فکر کا مادہ رکھتی تھی - اُس کا زیادہ
وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا ' اور وہ ان کے مطالب سے اپنے
شوہر کو مطلع کرتی رہتی تھی ' گو وہ ابسن پر اعتماد کامل رکھتی تھی
لیکن اسکے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ کمال آزادی کے ساتھ بے خوف ہو کر ابسن کی
تصانیف پر تنقید کرتی تھی ' یہاں تک کہ دونوں میں کبھی کبھی اختلاف
رائے بھی ہو جاتا تھا - لیکن اُس نے اپنے خیالات کی آزادی کو کبھی ہاتھ
سے نہ جانے دیا - ابسن ادبی معاملات میں ہمیشہ اس سے مشورہ لیتا تھا ' اور
اس کا اعتراف کرتا تھا کہ وہ اس کے لئے الہام کا بہترین ذریعہ ہے —

" اس کو رنج یہ تھا کہ خطرات نے

میری راہ مسدود کردی تھی -
اس کی خوشی یہ تھی کہ نیک روحیں
میرے بوجھہ کو ہٹا لیتیں-
اس کا گھر وہ غیر محدود کھلا سمندر ھے
جس کی موجیں میرے خوابوں کی
ساکت اور جامد کشتی کو
حرکت میں لاتی ہیں-
اس کا قبیلہ ایک پریوں کا پرا ھے
جو نت نئے رنگ بدلتی ھیں
اور شوخی کا انداز دکھاتی ہوئی
میرے راگوں کے ساتھہ رقص کرتی ھیں-
جب میری آگ بجھہ جاتی ھے
تو اسی کے نور سے روشن ہوتی ھے
لوگ دیکھتے ھیں کہ آگ جل اٹھی
لیکن انھیں خبر نہیں ہوتی کہ اسے کس نے روشن کیا
چونکہ وہ مجھہ سے
کسی صلے کی طالب نہیں
اسی لئے میں نے شکریئے کا یہ گیت
لکھا اور طبع کرایا ھے " *

۱۲ مارچ سنہ ۱۸۹۱ ع کو میونک کے نوعمر مصنفین نے ایک بڑی دعوت میں ابسن کو معزز مہمان بنا کر مدعو کیا - اسی موسم بہار میں برلن اور بڈاپسٹ میں بھی ابسن کو اس عزت سے سرفراز کیا گیا ' چالیس سال قبل اس نے اپنے آپکو ماہر تعمیر (Master Builder) تصور کیا تھا '

* اس نظم کا عنوان ھے ' شکریہ ' اس کا حوالہ آگے بھی دیا گیا ھے —

اور اس کی یہ آرزو تھی کہ ایک ایسی عمارت بناۓ جو سارے شمال میں چمکے — اس خواب کی تعبیر اس کی توقعات سے کہیں بڑہ کر نکلی - اس نے یہ دیکھہ لیا کہ ایک غیر فانی شاعر کی حیثیت سے وہ نہ صرف شمال میں بلکہ ساری متمدن دنیا میں مشہور ہوچکا ھے - اسی دوران میں ابسن اور بیورن‌سن میں مصالحت کی بنا پڑی ' اور وہ دشمنی جو ان دونوں کے درمیان سالہا سال سے چلی آتی تھی اس طریقے سے ختم ہوئی کہ ابسن کے بیٹے نے بیورن سن کی بیٹی سے شادی کرلی - ان تمام واقعات اور مشاغل کے باوجود ابسن کا قلم برابر کام کررھا تھا ' اور اُس کے ڈرامے برابر نکل رھے تھے ' جن کی با ترتیب فہرست یہ ھے :—

(۱) سنہ ۱۸۵۰ ع The Warriors Barrow & Catiline.

(۲) سنہ ۱۸۵۱ ع Andrihimmer. کا ایڈٹ کرکے شائع کرانا

(۳) سنہ ۱۸۵۳ ع St. John's Night.

(۴) سنہ ۱۸۵۵ ع Lady Inger of Oestraat.

(۵) سنہ ۱۸۵۶ ع The Feat at Solhong.

(۶) سنہ ۱۸۵۷ ع The Vikings.

(۷) سنہ ۱۸۶۲ ع Love's Comedy.

(۸) سنہ ۱۸۶۳ ع The Pretenders.

(۹) سنہ ۱۸۶۶ ع Brand.

(۱۰) سنہ ۱۸۶۷ ع Peer Gynt.

(۱۱) سنہ ۱۸۶۹ ع The League of Youth.

(۱۲) سنہ ۱۸۷۳ ع Emperor & Galilean.

(۱۳) سنہ ۱۸۷۷ ع Pill rs of Society.

(۱۴) سنہ ۱۸۷۹ ع	A Doll's House .
(۱۵) سنہ ۱۸۸۱ ع	Ghosts.
(۱۶) سنہ ۱۸۸۲ ع	An Enemy of the People.
(۱۷) سنہ ۱۸۸۴ ع	The Wild Duck.
(۱۸) سنہ ۱۸۸۶ ع	Romersholm.
(۱۹) سنہ ۱۸۸۸ ع	The Lady From the Sea.
(۲۰) سنہ ۱۸۹۰ ع	Hedda Gabler .
(۲۱) سنہ ۱۸۹۲ ع	The Master - Builder .
(۲۲) سنہ ۱۸۹۴ ع	Little Eyolf .
(۲۳) سنہ ۱۸۹۶ ع	John Gabriel Borhman.
(۲۴) سنہ ۱۸۹۹ ع	When We Dead Awaken .

ابسن کی ستروین سالگرہ کے موقعہ پر پروفیسر کرین کی ادارت میں ایک کتاب شائع ہوئی جس میں ناروے اور سویڈن کے سارے ادبی نقادوں نے اس جید ڈراما نویس کی معرکۃ الآرا تصانیف پر تحسین آمیز تبصرے لکھے - پہلا مقالہ ہزمجسٹی شاہ آسکر ثانی کا تھا ' اس کے بعد دیگر ارباب ذوق کے تبصرے تھے ' اس کتاب میں کچھ اعداد و شمار بھی درج تھے ' جن سے پتہ چلتا تھا کہ صرف کوپن ہاگن کے ناشر کے ہاں سے تقریبا پانچ لاکھ نسخے اس کی تصانیف کے فروخت ہوچکے ہیں - انگلستان کی جانب سے مسٹر گاس نے چاندی کا ایک ست پیش کیا اور سارے دن مختلف ملکوں ' قوموں اور مذہبوں کے لوگ آتے رہے اور تحفے پیش کرتے رہے - دوسرے روز شام کو کرسچیانا کی تماشاگاہ میں " دشمن خلق " کا تماشا کیا گیا - ۲۰ مارچ کو حکومت کے نمایندوں اور ارباب علم و فن کی جانب سے ابسن

کو ایک پر تکلف دعوت دی گئی جس میں وزیر مملکت نے معزز مہمان کا جام صحت تجویز کیا - اس کے بعد ابسن شاہ ڈنمارک اور شاہ سویڈن کی جانب سے مدعو ہوا - اس موقعہ پر اس کے دوست کاؤنٹ اِسنوالسکی نے تقریر کرتے ہوے یہ الفاظ کہے تھے :—

> " ہنرک ابسن! تھوڑی دیر کے لئے ہمیں اپنے ہاتھ چومنے دو ' جن کی بدولت ایسے نادر شاعرانہ کارنامے وجود میں آے - وہ کارنامے جو اپنی تلخی کے با وجود اس قدر مفید ہیں- اس صاف اور تیز ہوا کا شکریہ جس کے اندر ہم نے چٹانوں کے درمیان سانس لی —— لیکن ان حسین اور شعر آفرین وادیوں کا بھی شکریہ جو بادلوں کے پھٹنے پر ہماری نگاہوں کے سامنے آ گئیں —— ایسے ہی مقام پر ایگنس اپنے ابدی تبسم سے مسرور کرتی رہتی ہے - —— ایسے ہی مقام پر سلویگ صبر کے ساتھہ منتظر بیٹھی ہوتي ہے
>
> ہنرک ابسن! شکریہ! مرحبا! مرحبا!"

اسی سلسلے میں ناروے کی " انجمن حقوق نسوان" کی جانب سے ۲۶ مئی سنہ ۱۸۹۸ ع کو ایک بڑا جشن منایا گیا - وزیر اعظم کی بیوی نے جلسۂ تہنیت کی صدارت کی - اس تحریک کے دو نمایاں علمبرداروں نے پر زور تقریریں کیں- ابسن نے تقریر کرتے ہوے یہ کہا کہ میں نے محض پروپاگنڈا کی غرض سے کوئی کتاب نہیں لکھی - میں ڈراما نویس ہوں ' سوشل ریفارمر نہیں ہوں ' عورتوں کے حقوق کا سوال ایک ایسا سوال ہے جس کا کل بنی نوع انسان سے تعلق ہے ' اسی لئے جو کچھہ لکھا گیا ہے اس میں میں نے محض نوع انسانی کے خصائل کا تذکرہ کیا ہے —

" میرے پیش نظر یہ کام تھا کہ اپنے ملک کو ترقی دی جاے۔
اور اپنے ہم وطنوں کے سامنے ایک بلند معیار رکھا جاے' اس بات
کے حاصل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ماؤں کا یہ فرض
ہے کہ وہ لگاتار محنت اور جفاکشی سے اپنی اولاد میں تہذیب نفس
اور ضبط نفس کا احساس پیدا کریں۔ جب تک یہ احساس پیدا
نہ ہوگا' باشندوں کی زندگی کسی بلند مرتبے پر نہ پہنچ سکےگی۔
اصلاح معاشرت کے مسائل کا حل عورتوں کے ہاتھہ میں ہے' یہ کام ان
کو ماؤں کی حیثیت سے کرنا چاہئے۔ اسی حیثیت سے یہ کام انجام
پا سکتا ہے' یہ عورتوں کی ایک بڑی اہم ذمہ داری ہے ...... "

اُس حیات نو کے شکریے میں جو عورتوں کو ابسن کی ہنگامہ خیز تصانیف سے حاصل ہوئی یہ جشن منایا گیا تھا۔ ہال میں روشنی مدھم کردی گئی اور ابسن کی تصانیف کے نسوانی کیریکٹر اپنے مخصوص لباس میں ایک ایک کرکے آے اور ابسن کو ایک ایک گلاب کا پھول دے کر چلے گئے۔ سنہ ۱۸۹۹ ع میں ابسن ایک اور طریقے سے سرفراز کیا گیا۔ کرسچیانا میں نیشنل تھیٹر کی عمارت کے دروازے پر اس کا نام کندہ کیا گیا۔ غرض اس کی زندگی میں جو قدر و منزلت اس کی ہوئی وہ شاید ہی کسی شاعر یا ڈراما نویس کو نصیب ہوئی ہو —

سنہ ۱۸۹۹ ع میں ابسن کی صحت جواب دینے لگی' اس کا سب سے نمایاں اثر یہ ہوا کہ اس کا حافظہ روز بروز کم زور ہونے لگا؛ یہاں تک کہ وہ الفاظ کی صورتیں بھی بھولنے لگا۔ وہ اسی میز پر بیٹھہ کر قلم سے کیڑے مکوڑے بناتا رہتا تھا جس پر اُس نے ایسے معرکے کی کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن سیاست سے اس کی دلچسپی بدستور رہی۔ خصوصاً اس لئے کہ

اس کے بیٹے نے اس میدان میں قدم رکھا تھا - یہ تقاضاے عمر اس کی کل قوتوں میں انحطاط ظاہر ہونے لگا ' چلنا پھرنا تک مشکل ہوگیا ' پھر بھی وہ کھڑکی میں بیٹھ کر بنی نوع کا مطالعہ کرتا رہتا - آخرکار دنیا کے اس زبردست فلسفی ' حکیم ' ادیب ' شاعر ' اور ڈراما نویس نے ۲۳ مئی سنہ ۱۹۰۶ ع کو دنیا کو خیرباد کہا - یکم جون کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کی لاش سپرد خاک کی گئی —

ابسن شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مجتہد اور پیغامبر بھی تھا - یہ ایک ایسی واضح ' اور نمایاں حقیقت ہے جس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ' اس کی چھوٹی چھوٹی نظموں اور غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ موجود ہے ' جس میں سے ہم نے چند نظمیں اس مقالے کی پہلی قسط میں درج کی ہیں ' لیکن اس کی شاعری کا وہی حشر ہوا جو شکسپیر کی شاعری کا ہوا تھا - شکسپیر کے ڈراموں نے اس کی غزلوں کی لطافتوں اور خوبیوں کو دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ کر دیا ہے ' شکسپیر کا نام لیتے ہی ہیملٹ ' جولیس سیزر ' فالسٹاف ' ڈیسڈیمونا ' ایا گو ' لیڈی میکبتھ اور پورشیا کی صورتیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں ' اور ہم اس کے ڈراموں میں محو ہوکر رہ جاتے ہیں - ابسن کا نام سنتے ہی ہم اپنی نگاہوں کے سامنے اگنیس- نورا ' لونا ' لیڈی اِنگر ' برینڈ ' پیر گنٹ اور پیٹرا اسٹا کہان کے مجسمے پاتے ہیں ' اور ان کی رعنائیوں کے نظارے میں ڈوب کر یہ بھول جاتے ہیں کہ ابسن غزل گو بھی تھا - گو زمانے نے اُسے اس قدر فرصت نہ دی کہ وہ اس صنف میں کمال دکھا سکتا - اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ ابسن ہمیشہ اس امر کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا کہ وہ فطرت کا ایک پیغامبر ہے ' اس لئے اُسے اپنے فرض سے غافل نہ ہونا چاہئے - اس کے دل کے

پاس پاسبان عقل تھا' اس پاسبان نے اُسے کبھی تنہا نہ چھوڑا اور اتنا موقع نہ دیا کہ وہ غزل گوئی کی جانب متوجہ ہو سکتا۔ یورپ کے ممالک میں محض غزل گوئی بہت کم کی جاتی ہے' یعنی یہ کم ہوتا ہے کہ شاعر مرتے وقت صرف غزلوں کے پانچ دیوان چھوڑ جائے اور اس کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف نہ ہو —

ابسن کی غزلوں کا ذخیرہ گیرٹ نے جمع کر کے حاشیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۲۸ غزلیں ہیں' مختلف ڈراموں میں سے چھ گیت ماخوذ ہیں' اور آخر میں "بریلنڈ" کا ترجمہ ہے۔ جسے اس مجموعے میں ایک نظم کی حیثیت دی گئی ہے۔ ان میں سے تین چار نظموں کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہم بڑی حد تک تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان نظموں کی نصف سے زیادہ حلاوت اور لطافت ترجمہ کرنے میں جاتی رہی ہے' دوسرے ان کی تعداد اس قدر مختصر ہے کہ معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ مکمل نہیں ہے۔ ان نظموں میں چند ایسی ہیں جن میں شاعر نے اسرار حقیقت کو بے نقاب کرنے کی بڑی خوبی سے کوشش کی ہے' وہ کہتا ہے :—

زندگی کیا ہے؟ ایک جنگ ہے!

دل اور دماغ کی جنگ دنیا کی زنجیروں سے

شاعری؟ اس کے معنی یہ ہیں

روحوں کی رستخیز کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا۔

رخصت۔

"آخری' آخری مہمان

پھاٹک تک پہنچا دیا گیا۔

خدا حافظ :۔ اور باقی لوگ

رات کی ہوا میں گھل مل گئے۔

مکان، باغ، سڑک،

سب پر تاریکی کے پردے پڑے ہوے ہیں۔

اسی فضا میں شیریں الفاظ نے

موسیقی کا لطف پیدا کیا تھا۔

وہ گھڑی بھر کی دعوت تھی،

جس پر تاریکی کا ڈرغہ تھا۔

وہ فقط ایک مہمان تھی،

آئی اور چلی گئی۔

اس کے آگے ابسن نے دیہاتی دلکشی کا ایک دلفریب مرقع کھینچا ہے، جس کی سادگی کا حسن ' ورڈ سورتھ ' کی نظم " اکیلا کھیت کاٹنے والا " کی یاد تازہ کرتا ہے :—

" دیکھو گاؤں کی محبوبہ خاموش بیٹھی ہے،

کچھ اندھیرے میں کچھ روشنی میں،

اس کی گہری نظر کے سامنے جو خاموش تصویر ہے

وہ اب تک نام سے بے نیاز ہے۔

وہ خود اُس کا کوئی نام نہیں رکھتی، اور نہ یہ جانتی ہے

کہ اس کی جستجو اُسے کہاں لے جاے گی

جب چو پاؤں کی گھنٹیاں، اور ناقوس بجنے لگتے ہیں

تو یہ تصور اُسے وہاں لے جاتا ہے جہاں شفق پھولی ہوتی ہے،

بلکہ شائد اس سے بھی آگے!"

ورڈ سورتھہ کی نظم سے یہ نظم بہت بڑھی ہوئی ہے ' انگریزی شاعر کے ہاں بھی تخیل کی بلند پروازی ہے لیکن ابسن کی پرواز آسمان تک جا پہنچی اور ورڈ سورتھہ گاؤں کی روایات کے بکھیڑوں میں پھنس کر رہ گیا —

دو نظمیں اور ہیں جن کا مختصر سا ذکر کافی ہوگا - پہلی کا عنوان ہے "وقت پر کام آنے والا بھائی" یہ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع میں لکھی گئی تھی' جب پراشا نے ڈنمارک سے ایک صوبہ چھین لیا تھا - اور ناروے و سویڈن ' ڈنمارک کی امداد کا وعدہ کر کے منحرف ہو گئے تھے - اس پالیسی کا ابسن کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا ' وہ اپنے ہم وطنوں کو للکار کر کہتا ہے : —

وہ ایک خواب تھا ' اٹھو ' بیدار ہو '

وہ کام کرو جو ایک قوم کے شایان شان ہے —

ہر شخص اپنے اپنے مورچہ پر ڈٹ جائے '

جلدی کرو ایک بھائی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے

ابھی وقت ہے کہ تم یہ شریفانہ گیت گاؤ :—

ڈینس' ڈینس' ڈاٹرا - کا خطہ ہاتھہ سے نہ جانے دینا - !"

یہ نظم جو ہم آخر میں درج کرتے ہیں ابسن کی نظموں میں سب سے پاکیزہ ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی —

"کنول کے ساتھہ"

"پیاری! دیکھہ ' تیرا عاشق یہ ہے '

ایک پھول ہے جس کے پنکھہ سفید ہیں '

یہ خاموش سطح پر لیٹا ہوا

موسم بہار میں نیند کے مزے لے رہا تھا —

اس مہمان کے ساتھہ گھر والوں کا سا سلوک کر '
پیاری ' اسے اپنے سینے میں جگہ دے '
وہاں اس کی پنکھڑیاں ایک راز کو چھپائے رکھیں گی
اُس پر شور سیلاب کا راز جو آکر گذر گیا -
لڑکی ! چشمے سے خبردار رہنا -
وہاں سو جانے میں خطرہ ہے !
گو پریاں وہاں سونے کا بہانہ کرکے
کنول کے اوپر سے جھانکتی رہتی ہیں -
لڑکی تیرا سینہ ایک چشمہ ہے '
لیکن وہاں بھی سو جانے میں خطرہ ہے
گو کنول پر سے جھانکتی ہوئی
پریاں وہاں سو جانے کا بہانہ کرتی ہیں -

اس نظم پر ڈوکر نے ایک دلچسپ نوٹ دیا ہے جو اس کی ادبی خوبیوں کو دوبالا کر دیتا ہے —

" میری کی نرمی اور تناسب روحانی میں ایسی دلکشی تھی جو ابسن کو بہت پسند آتی تھی - اُس شریفانہ سلوک کی بدولت جو وہ ہمیشہ خواتین کے ساتھہ کرتا تھا اس نے ڈرسیڈن میں میری کے قیام کو جہاں تک ممکن تھا خوشگوار بنایا - ایک روز اُس نے ایک نظم کے ساتھہ میری کو کنول کے پھولوں کا گلدستہ دیا - اس نظم میں اس نے میری کی شرافت اور حسن سیرت کی مدح سرائی کی تھی " -

ظاہرا ابسن بہت خشک اور بے مروت معلوم ہوتا تھا - لیکن اس کا

دل شرافت ' عالی حوصلگی ' احسان مندی اور محبت سے معمور تھا - دوست کی حیثیت سے ابسن ہمیشہ مخلص اور بے لوث رہا اور شوہر کی حیثیت سے محبت کرنے والا ' ہمدرد اور با وفا - لیکن تعجب ہے کہ اپنے والدین سے وہ کبھی مانوس نہ ہوسکا - یہ اس کی بلند خیالی اور شرافت نفس سے بعید معلوم ہوتا ہے ' لیکن ہمیں اس کی اصلی وجہ کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے - مذہب کی اٹل چٹان اس کے اور اس کے والدین کے درمیان حائل تھی جس نے ان کو کبھی ملنے نہ دیا - ابسن میں وہ جراءت اور ہمت نہ تھی جو مصلحوں میں ہوا کرتی ہے - " گڑیا کا گھر " " بھوت " " بریلنڈ " کی اشاعت نے اُسے ایک زمانے میں مطعون خلائق بنا دیا تھا - ان کے خلاف اخباروں میں مضامین نکلتے تھے ' تقریریں ہوتی تھیں - گرجاؤں کے پادری سخت برہم نظر آتے تھے ' ملک کے مدبر ابسن کو سزا دینے کے لئے طیار تھے ' لیکن اپنے وطن سے دور بیٹھا ہوا ابسن برابر اپنے خیالات کی ترویج میں مشغول رہا ' سیاسی خیالات کی اصلاح کو اُس نے اپنا فرض جانا ' معاشری خرابیوں اور گھریلو زندگی کی ابتری کو دور کرنا اُس نے اپنا مشن تصور کیا - " گڑیا کا گھر " میں نورا یہ محسوس کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے گھر کے ماحول میں وہ اپنی شخصیت کو مکمل نہیں کرسکتی ' اس لئے وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر چل کھڑی ہوتی ہے ' اس سے اصل میں آن میل بے جوڑ شادیوں کی شدید مخالفت مقصود تھی - اس ڈراما کے شائع ہوتے ہی سارے ملک میں آگ سی لگ گئی ' پادریوں نے یہ تصور کیا کہ یہ ڈرما شادی کی مقدس رسم پر ایک ناروا حملہ ہے ' ایکٹروں نے اس ڈراما میں کام کرنے سے انکار کر دیا - آخر کار ابسن نے اس ڈراما کے آخری سین کو از سر نو لکھا اور رائے عامہ

کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے آرٹ کے ایک کامیاب اور دلکش نمونے کو ناقص بنا کر چھوڑا - اس کے خیالات اپنے ملک کے خیالات سے بہت آگے تھے' لیکن اس میں مجتہدوں کی سی دلیری اور ہمت نہ تھی۔ ابسن نے ایک جگہ اس بزدلی کا خود اعتراف کیا ہے - اس کے دوست ایک جنگی مہم میں حصہ لینے کی طیاریاں کر رہے تھے' وہ خود اس جنگ کا سب سے بڑا حامی تھا' لیکن اس میں اتنی جراءت نہ تھی کہ وہ خود تیغ و سپر لے کر میدان جنگ میں اُتر آتا - وہ کہتا ہے کہ میں صرف اسی طرح جنگ کرنے کے قابل ہوں جس طرح کہ کر رہا ہوں' یعنی اپنے ملک سے دور پردیس میں رہ کر - اسی لئے اس کے ایک دوست نے کہا ہے :—

"ابسن آدمی نہیں ہے' محض ایک قلم ہے" -

ہم ابسن کو دور اندیش کہہ سکتے ہیں - وہ عہد طفلی سے یہ سوچتا رہتا تھا کہ اسے اس دنیا میں ایک بڑا مشن پورا کرنا ہے - چنانچہ اس کی طیاری میں وہ ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے' اپنے ملک کی سوشل حالت کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے - سوشل خرابیوں کو ایک نظر میں تاڑ لیتا ہے اور ان پر پیہم ایسے شدید حملے کرتا ہے کہ ملک میں ہلچل مچ جاتی ہے - اور لوگ دیوانہ وار اسے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں - رفتہ رفتہ مہذب سوسائٹی میں اس کا نام لینا جرم قرار دیدیا جاتا ہے' اس کے موافقین اور مخالفین میں لڑائیاں ہونے لگتی ہیں' دعوتوں میں اس کے متعلق گفتگو کرنا ممنوع کر دیا جاتا ہے' اخبارات میں اس کے کارٹون نکلتے ہیں اور اس کی کتابوں کی تحقیر کی جاتی ہے' مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھئے کہ وہ ایک بزدل انسان تھا' ان

مخالفتوں سے محفوظ رہنے کی غرض سے وہ اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے وطن سے دور میونک اور تریسٹن میں بسر کرتا ہے، بہرحال یہ کمزوری ایسی نہیں تھی جو اس کے آرٹ میں کوئی خامی پیدا کرتی —

ابسن کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی، اس معاملے میں وہ بہت خوش نصیب تھا۔ اگر یہ مانا جاے کہ اس کو فطرت نے ایک خاص مشن کے لئے چنا تھا تو غالباً اس انتخاب میں اس کی بیوی بھی شامل تھی، بہ الفاظ دیگر اگر سوسانہ اس کی بیوی نہ ہوتی تو وہ اس مشن کے لئے منتخب نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو کامیابی اس کے لئے ناممکن ہو جاتی۔ "گڑیا کا گھر" کی ہیروئن کے برعکس ابسن کی بیوی ایک مستقل شخصیت کی مالک تھی، اپنے خیالات اور جذبات میں وہ آزاد تھی، ادب اور آرٹ کی نہایت اچھی نقاد تھی، اور اپنے شوہر کی تصانیف اور خیالات پر بے تکلف نکتہ چینی کرتی تھی۔ اس کا دماغ روشن تھا اور اس کے خیالات میں بلندی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثہ ہوتے ہوتے اختلات بھی پیدا ہو جاتا تھا، مگر اس اختلات کا باہمی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ابسن کو پورا پورا احساس تھا کہ اس کی بیوی کا اس پر بڑا احسان ہے، اس لئے اس نے ایک چھوٹی سی پاکیزہ نظم میں اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ہم یہ نظم اوپر درج کر آئے ہیں۔ ابسن کے گھر میں آزادی، محبت اور اخلاص کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اور علوم و فنون کا چرچا رہتا تھا۔ ابسن کی بیوی کو اس کے کمالات پر بہت پہلے سے اعتماد تھا۔ اسی بنا پر اس نے ابسن کے افلاس اور اس کی عارضی بے راہ روی کا کمال خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا، وہ ہر ممکن طریقے سے شوہر پر اپنا خوشگوار اثر ڈالتی رہی اور آخر کار کامیاب ہوئی۔ ابسن

بہت سی کتابیں خود نہیں پڑھتا تھا بلکہ اس کے بجائے اس کی بیوی یہ فرض انجام دیتی تھی اور ان تصانیف کے مطالب سے اپنے شوہر کو آگاہ کرتی رہتی تھی - اس کے علاوہ ابسن اپنی کوئی تصنیف اپنی بیوی کے مشورے کے بغیر طباعت کے لئے نہ بھیجتا تھا - اور اکثر اوقات وہ گھر کی اسی دیوی سے فیض حاصل کرتا تھا - بیوی ' ماں ' اور بہن کی حیثیت سے مسز ابسن کا کریکٹر نہایت اعلیٰ تھا - کسی اور شاعر پر بیوی کا اتنا اچھا اثر شاید ہی پڑا ہو جتنا ابسن پر پڑا - اسی لحاظ سے میں یہ اوپر کہہ آیا ہوں کہ اس جوڑے کے انتخاب میں خود فطرت کا ہاتھ تھا —

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابسن اور اس کی بیوی کی طبیعت ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے - کہا جاتا ہے کہ ابسن کے " ماسٹر بلڈر " (Master Builder) میں جہاں سولنس اور اس کی بیوی کی ان بن دکھائی گئی ہے ' وہاں ابسن نے اپنے ہی گھر کا نقشہ کھینچا ہے - مگر یہ خیال حقیقت سے دور معلوم ہوتا ہے - ابسن کی بیوی میں خیال کی آزادی بدرجۂ اتم موجود تھی ' اور وہ اس آزادی میں کسی طرح کی مداخلت برداشت نہ کر سکتی تھی - مگر اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان دونوں کے تعلقات کسی عنوان سے بھی خراب تھے —

" آخری زمانے میں جب ابسن بستر مرگ پر پڑا تھا اس وقت بھی اُس کی زبان سے بار بار یہ الفاظ نکل جاتے تھے " میری پیاری ' چہیتی ' چاہنے والی بیوی " - ابسن کو عورت کی نطرت پر اعتماد تھا - اس کی محبت اور اس کے اخلاقی مشن کا وہ دل سے قائل تھا ' اور یہ درس اُس نے اپنی بیوی کی محبت اور اخلاق سے حاصل کیا تھا - اس میاں بیوی کی زندگی ستاہلانہ زندگی کا سچا نمونہ تھی - لیکن روحانی آزادی کی حفاظت کرکے

اُنھوں نے ہمیشہ اپنی شخصیت کو سنبھالے رکھا ' اور ایک دوسرے کو اس کا موقع دیا کہ جدا جدا اپنے دماغ اور روح کی تکمیل کرسکیں " —

انجمن شباب (The League of Youth) ابسن کا پہلا سوشل ڈراما ہے - نثر کے ڈرامے ابسن نے اس سے قبل بھی لکھے تھے ' لیکن اُس کے مشہور و معروف نثر کے ڈراموں کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے - قبل اس کے کہ ہم اس ڈراما پر تنقید کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابسن کے ایک دوسرے ڈراما " ماہر تعمیر " سے وہ مقام نقل کردیں جہاں اس نے استعارے میں اپنی تصانیف کی قسمیں بتائی ہیں - سولنس ہلڈا سے کہتا ہے کہ میں نے ابتدا میں گرجے تعمیر کئے ' یعنی شاعرانہ ڈرامے تصنیف کئے ' اسکے بعد آدمیوں کے لئے مکانات بنائے ' یعنی وہ سوشل ڈرامے لکھے جن کی مدد سے گھریلو زندگی کی اصلاح مقصود تھی - اس کے بعد ہوائی قلعوں کی تعمیر شروع کی - یہاں ابسن کے آخری ڈراموں کی جانب اشارہ ہے جو تخیلی رنگ میں ڈوبے ہوے ہیں - اس بیان کو ذہن میں رکھئے اور " انجمن شباب " کو ایک اصلاحی ڈراما تصور کیجئے ' جو ملک کی تمدنی حالت کو درست کرنے کے لئے لکھا گیا تھا - یہ سنہ ۱۸۶۸ اور سنہ ۱۸۶۹ ع کے موسم سرما میں تصنیف ہوا ' اور ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع کو کرسچیانا تھیٹر میں پہلی مرتبہ دکھایا گیا - مگر اس ڈرامے کے سیاسی رنگ نے حاضرین میں اتنا اشتعال پیدا کیا کہ ایک طوفان برپا ہو گیا - اس کے بعد یہ پھر دو مرتبہ اسٹیج ہوا اور ختم ہونے سے قبل پھر وہی طوفانی مناظر رونما ہوئے - لیکن رفتہ رفتہ اس کی خوبیاں لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے لگیں اور آخر کار یہ ناروے اور سویڈن میں ایک کلاسیکل ڈراما تصور کیا جانے لگا - یہاں پھر وہی بات ذہن میں رکھئے کہ ابسن اپنے زمانے سے آگے دیکھتا ہے

اور اس کی نظر میں وہ جلوے سمائے ہوے ہیں جہاں تک اوروں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی —

پہلا ایکٹ ۱۷ مئی کو شروع ہوتا ہے جو ناروے میں ایک متبرک دن شمار کیا جاتا ہے ' یہ ناروے کی آزادی کا دن ہے ' اس روز شہروں اور دیہاتوں میں بڑا جشن منایا جاتا ہے ' چیمبرلین کے مکان سے قصے کی ابتدا ہوتی ہے - چیمبرلین کا مکان جشن کا مرکز بنا ہوا ہے ' گوشے گوشے سے رقص و سرود کی صدا آرہی ہے ' درختوں میں رنگین قندیلیں آویزاں ہیں ' بڑی بڑی میزوں پر فوا کہات چنے ہوئے ہیں ' لوگ کثرت سے جمع ہیں ' یہاں ہماری ملاقات اسٹینسں گارڈ سے ہوتی ہے جس کو اس ڈارما کا روح و رواں کہنا چاہئیے ' لوگ اس کا خیرمقدم کرتے ہیں اور عزت کی جگہہ دیتے ہیں ' ایک شخص اس سے کہتا ہے ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ تم یہاں آکر آباد ہوئے ' ہم نے اخباروں کے ذریعہ سے تمہاری قابلیت اور فصاحت کا حال سنا تھا - اخبار کے نمایندے اسٹینسں گارڈ سے ملنے کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں ' اور بار بار اُسے یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے اخبار آپ کے رشحات قلم کے لئے وقف ہیں - اسی زمانے میں انتخابات ہونے والے تھے ' چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوجاتی ہے - اور موسین کہتا ہے :—

" اگر کچھہ کرنا ہے تو جلد کرنا چاہئیے ' ابتدائی انتخابات کے صرت تین یوم باقی ہیں " —

اس کے بعد جب خود موسین کا نام تجویز ہوتا ہے تو وہ دوسرے کی بات کاٹ کر کہتا ہے میرے کاروبار کو نقصان پہنچے کا تو پہنچنے دو ' اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ میری قوم کی بہبودی اسی میں ہے '

تو میں ذاتی معاملات کو یک قلم نظر انداز کردوں گا " —

گفتگو جاری رہتی ہے ' اور اسی سلسلے میں چیمبرلین کے والد کا ذکر آجاتا ہے ' اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ناروے میں عہدے اور آسامیاں وراثت میں ملتی تھیں ' قابلیت کا کوئی معیار نہ تھا ' بلکہ جس خاندان میں جو عہدہ آ گیا وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا گیا - اسی بات چیت کے دوران میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے کار و بار کے لئے غیر ملکی افراد قابل ترجیح سمجھے جاتے تھے ' اور انھی کو کام دیا جاتا تھا - اسی طرح مختلف محکموں کی آسامیاں انھی لوگوں کو ملتی تھیں جو افسروں کے واقف کار اور بھروسے کے لوگ ہوتے تھے - اسی دوران میں چیمبرلین اپنی جماعت کے ساتھ آ موجود ہوتے ہیں - ان کی تعریف میں ایک چھوٹی سی تقریر کی جاتی ہے اور ان کے استقبال کے لئے نعرے لگائے جاتے ہیں ' اس کے بعد اسٹینس گارڈ تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے ' لیکن وہ بار بار روکا جاتا ہے ' مگر آخر کار اس کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں :—

" اب تقریر کرنے میں بھی مزاحمت کی جاتی ہے - سنتے ہو ' زبان بندی کا حکم نافذ ہونے والا ہے - اس ظلم کو دور کرو ' میں یہاں کھڑا ہو کر چو پاؤں کے گلے سے ہم کلام نہ ہوں گا - میں بولوں گا - تم بھی خاموش نہ رہوگے - ہم ایک دوسرے سے دل کی بات کہیں گے " -

" ہم ایسے خشک جشن سے باز آے جس میں آدمی کا دم گھٹتا ہے - ۱۷ مئی کے دن نیک کاموں کا زرین موسم شروع ہو گا - کیا یہ موسم بہار اور بالیدگی کا زمانہ نہیں ... — "

چیمبرلین یہ تقریر سنتا ہے اور دم بخود رہ جاتا ہے - مقرر کی

اشتعال انگیزی بڑھتی جاتی ہے - لوگوں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں ' نو جوانوں کے دل اُچھلنے لگتے ہیں ' اور بڑے جوش و خروش کے ساتھہ ایک خیمے کے اندر " انجمن شباب " کی بنا پڑتی ہے ' اور چیمبر لین چیں بجبیں ہوکر اپنی جماعت کے ساتھہ رخصت ہوتا ہے —

دوسرے ایکٹ کی ابتدا استینس گارڈ اور سیلما کی گفتگو سے ہوتی ہے ' لیکن اس کے بعد ہی اول‌الذکر چیمبرلین سے ہم کلام نظر آتا ہے - وہ بوڑھے چیمبرلین سے اپنی صاف گوئی کی معافی چاہتا ہے - چیمبرلین اس کو تسکین دیتے ہوے کہتا ہے کہ میں اب بوڑھا ہوگیا ' دوسرے یہ میری طبیعت کے خلاف ہے کہ میں اصلاحی کوششوں میں سب سے آگے بڑھوں - تم میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مصلح میں ہونا چاہئیں - غرض استینس گارڈ کی تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ انجمن کے قائم کرنے سے اس کا اصل مدعا کیا ہے —

" ایک ایسی زندگی جو میری قابلیتوں کے لئے میدان مہیا کرسکے اور میری آرزوئیں پوری کرسکے ' یعنی یہ کہ میں پارلیمنٹ کا ممبر ہو جاؤں ' مجھے وزارت مل جاے اور ایک دولت مند اور باعزت خاندان میں میری شادی ہوجاے " —

قومی خدمت کا جذبہ ' خطابت کا جوش ' اور " انجمن شباب " کا تصور اس مقصد سے تکرا کر فنا ہوجاتا ہے - شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں قومی خادم ذاتی مقاصد کو نظر کے سامنے نہ رکھتے ہوں - بے غرض لوگ ہوتے ضرور ہیں لیکن ان کی تعداد اس قدر کم ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے —

استینس گارڈ جب چیمبرلین کی پاکیزہ ستھری اور شریفانہ زندگی

پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے بہت رشک آتا ہے - " اس گھر کے انداز کیسے دلکش ہیں' یہاں زندگی کس قدر سبک روی کے ساتھہ حرکت کرتی ہوئي معلوم ہوتی ہے - یہاں کا فرنیچر کتنا نفیس ہے ' یہاں کا طرز گفتگو کتنا لطیف ہے ' یہاں آکر مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلی طبقے کی زندگی کیا شے ہے"- لیکن جب سلسلۂ کلام میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ میں چیمبرلین کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو فیلڈبو اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ایں خیال است و محال است و جنوں - بہر حال اس فضا نے استینس کارڈ کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ وہ اپنی تقریر میں جا بجا ترمیمیں کرنا چاہتا ہے - وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس نے جو کچھہ چیمبرلین کے متعلق کہا تھا وہ اخبار میں شائع ہو - یہاں اخبارات کي پالیسي کے متعلق ایک دلچسپ بحث شروع ہوجاتی ہے - اڈیٹر اور مالک اخبار کہتا ہے کہ اس نے اسی اخبار کی بدولت یہ سرمایہ حاصل کیا ہے - لیکن استینس کارڈ کے آتے ہی شہر میں نئے نئے خیالات پھیلنے لگے' جنھوں نے رفتہ رفتہ اخبار میں جگھہ پائی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کے پرانے خریدار بد دل ہو کر علحدہ ہو گئے - لیکن اب تو اس نئے "سیاسی ہیرو کے دل و دماغ میں چیمبرلین کی بیٹی کا خیال بسا ہوا ہے اور اس نے جو رنگ اختیار کیا تھا اسے چھوڑنے کی فکر کر رہا ہے - چنانچہ اخبار کے اڈیٹر کی گفتگو کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا - یہی نہیں بلکہ استینس کارڈ اپنی بے راہ روی کی تلافی کے لئے آمادہ نظر آتا ہے - اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چیمبرلین کے ایک مصاحب نے اس کے کان میں یہ بات کہی تھی کہ بجاے اس کے کہ تم دوسروں کی مدد کرو تم خود پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے - دوسرے ایکٹ کے آخر میں استینس کارڈ

اور چیمبرلین کے درمیان صفائی ہو جاتی ہے - اور آخرالذکر اس کی مدد کرنے کا پورا پورا وعدہ کر لیتا ہے ـــ

تیسرے ایکٹ کے شروع میں ہم چیمبرلین کی پریشان حالی کا منظر دیکھتے ہیں ' چنانچہ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ سنہ ۱۸۳۰ ع سے جب ہمارے والد کا انتقال ہوا تھا دنیا بہت بدل گئی ہے ' اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں خطاب اور سرکاری اعزاز کی کچھہ زیادہ قدر نہیں کرتا ' لیکن مجھے اپنے خاندان کی وہ دیانت داری بہت عزیز ہے جو نسلاً بعد نسل ہمارے گھر میں پختہ تر ہوتی ہوئی چلی آتی ہے ' اسی لئے میں پارٹیوں کی تفریق پیدا کرنے والی سیاست سے دور رہتا ہوں - یہاں یہ راز کُھلتا ہے کہ چیمبرلین کا فرزند اپنے والد کے دشمن موسن سے مل کر ایک تجارتی کارو بار میں شریک ہو جاتا ہے - باپ یہ چاہتا ہے کہ لڑکا گھر پر رہ کر عزت آبرو کی زندگی بسر کرے ' ورنہ وکالت کی جانب متوجہ ہو ' لیکن اس نے موسن سے میل جول پیدا کیا جو چیمبرلین کی نگاہ میں شہر کی عام بد اخلاقی کا ذمہ دار تھا - وہ اسی واقعہ سے کیا کم بد حواس تھا کہ استینس گارڈ یہ کہہ کر اسے اور زیادہ پریشان کر دیتا ہے

" آپ اور آپ کی بیٹی دونوں بہت جلد
مجھہ سے محبت کرنے لگیں گے "

ظاہر ہے کہ یہ اعلان حقارت سے سنا جاتا ہے - اس کے بعد ہم استینس گارڈ اور بوڑھے ان ڈے استاد کو ایک اہم مکالمے میں مشغول پاتے ہیں - آخرالذکر یہ کہتا ہے کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں - پارلیمنٹ سے کنارہ کشی کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میری جگہہ موسن پارلیمنٹ میں جگہہ پائے - اس بنا پر وہ استینس گارڈ کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ خود

پارلیمنٹ کا امیدوار بنے - یہاں شہر کی فرقہ بندی پر روشنی ڈالی جاتی ہے - اور یہ بتایا جاتا ہے کہ شہر کی ایک جماعت وہ ہے جس میں دولت، وسائل، قوت اور آزادی کے سرمایہ دار شامل ہیں - دوسری جماعت شہر کی نئی پود اور عوام الناس پر مشتمل ہے، جو ان برکتوں سے عموماً محروم ہیں - اسٹینس گارڈ اس جماعت کا رکن رکین ہے، اس کا دوست یہ بھی کہتا ہے کہ ملک میں بہت سی دولت مند اور صاحب جائداد لڑکیاں موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک سے شادی کرتے ہی وہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں آن واحد میں منتقل ہو سکتا ہے - ہمارا دوست اس جال میں فوراً پھنس جاتا ہے اور بے تابی کے ساتھ کہتا ہے کہ یہی میری دیرینہ دلی آرزو ہے - مجھے خود اسی کی تلاش تھی، خدا کے لئے اس معاملے میں میری مدد کرو —

تیسرے ایکٹ کی ابتدا میں پھر چیمبر لین اور اسٹینس گارڈ میں رد و بدل ہوتی ہے —

چیمبر لین :— تاریکی میں غائب ہو جاؤ، یا پاگل خانے میں پناہ لو تمہیں وہیں ہونا چاہئیے —

اسٹینس :— میں کہے دیتا ہوں کہ مجھ میں خدا کا قہر موجود ہے، تم اس کی مشیت کی مخالفت کر رہے ہو —

اسٹینس گارڈ کے جانے کے بعد چیمبر لین کہتا ہے کہ ایسے گستاخ اور بدمعاش سے مجھے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا .... لیکن اس کے بعد ہی وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس بدمعاش میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو مجھے دل سے پسند ہیں - یہ سین ختم نہیں ہوتا کہ موسن آ موجود ہوتا ہے - اس کو دیکھتے ہی چیمبر لین کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے -

وہ مکالمے کے دوران میں موسن سے کہتا ہے کہ تمھیں یہ عروج اور دولت ناجائز طریقوں سے حاصل ہوئی ہے - جس کا جواب موسن کے پاس یہ ہے کہ بیوپار کی دنیا میں اُتار چڑھاؤ ایک عام بات ہے - ایک شخص کے عروج کے ساتھ ساتھ بہت سے افراد کی تباہی وابستہ ہوتی ہے جس کا چارہ کار قانون کے پاس بھی نہیں - چیمبرلین ' موسن کے استدلال سے زچ ہوجاتا ہے ' لیکن اس کی مالی امداد کرنے سے صاف انکار کردیتا ہے اور اس کا بھی روادار نہیں ہوتا کہ اس کا نام بطور ضمانت کے پیش کیا جاے- یہاں اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایک دو ہزار کے بل پر چیمبرلین کے جعلی دستخط کئے گئے تھے - اس کو سنتے ہی وہ پریشان ہوجاتا ہے اور اپنے مصاحبوں کو سیونگ بنک اور آئرن ورکس بنک میں تفتیش کے لئے روانہ کرتا ہے - دوسرے سین میں چیمبرلین کا لڑکا آتا ہے اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ آپ میری مدد کیجئے ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا - باپ مدد کرنے سے انکار کرتا ہے - ایرک پر مایوسی طاری ہوجاتی ہے- اتنے میں سیلما آتی ہے- ایرک اس سے کہتا ہے کہ میری عزت ' گھر ' بار ' اور بزرگوں کا نام سب خاک میں مل گیا - آؤ ہم دونوں اس مصیبت کو برداشت کریں ' سیلما چیں بجبیں ہوکر جواب دیتی ہے :—

" تم نے میرے ساتھ ہمیشہ ظلم کیا - نہایت شرمناک طریقے سے - ... تم نے ... مجھے ہمیشہ تمھارا احسان قبول کرنا پڑا - میں خود کچھ نہ دے سکی ' میں تمھارے ہاں ہمیشہ مفلس رہی - تم نے مجھ سے کبھی کوئی قربانی طلب نہ کی - گویا میں کسی قابل ہی نہ تھی - میں تم سے نفرت کرتی ہوں ' نفرت ! "

میں تمھاری مصیبتوں اور پریشانیوں کے ایک قطرہ تک کی

پیلسی رهی، میں نے جب منت کی تم نے همیشه هنسی میں
بات ٹال دی - تم نے مجھے ایک گڑیا بنا رکھا ہے، تم مجھ سے
اس طرح کھیلتے رهے جیسے بچوں کے ساتھ کھیلتے هیں - میں نے
همیشه اس کی تمنا کی که میں تمھارا بوجھ اٹھانے میں شریک
هوجاؤں، اور کارزار حیات میں ذمه دارانه حصه لے سکوں، ایرک! اب
تم اس لئے میرے پاس آتے هو که تمھارے پاس کچھ نہیں رہا -
مگر میں اس کو گوارا نہیں کرسکتی که مجھے ایک آخری وسیله
سمجھا جاے - اب مجھے تمھاری تکالیف سے کوئی سروکار نہیں،
میں تمھارے ساتھ اب نہیں رہ سکتی، اس سے بہتر هے که میں
سڑکوں پرگانے بجاتی پھروں، مجھے جانے دو، جانے دو"— (ایکٹ تیسرا)

سیلما چلی جاتی هے اور قبل اس کے که چیمبرلین اپنے دل و دماغ کا جائزہ
لے سکے اسے بتایا جاتا هے که بنکوں سے یه پته چلا هے که دو هزار ڈالر کے
ایک بل کے سوا اور کوئی اس کا دستخطی بل بنکوں میں موجود نہیں -
اسی اثنا میں لن ڈے اسٹاڈ اور فیلڈ بو سے معلوم هوتا هے که وہ جعلی بل
اسٹینس گارڈ کے پاس پہنچ چکا اور وہ اسے انتخابات میں استعمال کرنا چاهتا
هے - یه سنتے هی چیمبرلین کے اوسان خطا هوجاتے هیں —

چوتھے ایکٹ میں سب سے پہلے مادام رنڈهول مین سے ملاقات هوتی هے،
گو اب ان کے گلستان حسن کی دیواروں پر محض تھوڑی تھوڑی دھوپ باقی هے
لیکن اب بھی انھیں شوهر کی جستجو هے، ان کے پبلک هاؤس میں شہر
کے سیاسی مذاق کے بے فکروں کا مجمع هوتا هے - اسٹینس گارڈ اور اڈیٹر
اسلاک سین موجود هیں اور مخالف اور موافق ووٹ کی تعداد کے متعلق
گرما گرم بحث هو رهی هے - مقام راے شماری سے لوگ برابر آتے اور خبریں

سناتے جاتے هیں' اسي اثنا میں ڈاکٹر فیلڈ بو آتا ہے۔ اور استینس گارڈ کو یہ خوشخبری سناتا ہے کہ اُسے زیادہ ووٹ مل رہے ہیں۔ ان دونوں میں پھر چیمبرلین کے متعلق بات چیت شروع ہو جاتی ہے اور آخر میں استینس گارڈ یہ کہتا ہے :—

"مجھے اس گندے ماحول سے جلد نکلنا چاهئے' آخر اس خشک فضا میں کب تک پھنسا رهوں ...... اگر میں اسی طرح عوام الناس کے گھروندے میں بند رہا تو میرے جذبات مردہ هوجائیں گے۔ مجھے ایسا معلوم هوتا هے کہ میرے الفاظ سے برقی لرزش غائب هورهی هے' مجھے تازہ هوا کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی ..."

اسی مکالمے میں لن ڈے اسٹاڈ بھی آکر شریک ہو جاتا ہے' اور اپنے دوست کو وہ جعلی بل دکھاتا ہے جس پر چیمبرلین کی عزت کا دار و مدار تھا۔ استینس گارڈ اس بل کو دیکھ کر بہت ملول ہوتا ہے' اس کے جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے اور وہ اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہے کہ میں قربانی کے لئے طیار هوں۔ اتنے میں باس ٹی ان آموجود ہوتا ہے اور اپنے دوست استینس گارڈ سے التجا کرتا ہے کہ اُس کی سفارش اُس کی معشوقہ مادام سے کر دے کیوں کہ مادام کی بہن چیمبرلین کے یہاں کام کرتی ہے' ممکن ہے کہ اس کے وسیلے سے باس ٹی ان کو کچھ اچھے ٹھیکے مل جائیں۔ مگر اس انداز کلام کا استینس گارڈ پر برا اثر ہوتا ہے اور وہ اپنے دوست سے کہتا ہے کہ ٹھیکوں کا نام لے کر محبت کی توهین نہ کرو۔ اس کے بعد هي مادام آموجود ہوتی ہے اور استینس گارڈ اس کو بغیر اپنے دوست کا نام بتائے شادی کے لئے راضی کر لیتا ہے۔ یہ

بات ختم نہیں ہوتی کہ موسن کی بیتی اپنے باپ کی تلاش میں وہاں آجاتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی ہمارے دوست کی حالت غیر ہوجاتی ہے اور وہ اپنی داستان درد چھیڑ دیتا ہے۔ راگنا بات کو ٹال کر چلی جاتی ہے اور جاتے وقت یہ کہہ جاتی ہے کہ خدا کا شکر ہے مجھے تمہاری عیاری کا وقت پر پتہ چل گیا، ورنہ میں مصیبت میں پھنس جاتی۔ اسٹینس کارڈ انتخابات میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد جعلی بل ایک لفافہ میں رکھہ کر رنگڈال کی معرفت اس پیام کے ساتھہ چیمبرلین کے پاس بھیج دیتا ہے کہ میں اس طریقے سے اپنے دوستوں کے ساتھہ سلوک کیا کرتا ہوں خصوصاً ان کے ساتھہ جو میرے خلاف ووٹ دیتے ہیں۔ اس واقعے سے چیمبرلین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونے لگتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ موسن کا کاروبار بگڑ جاتا ہے اور وہ قرض خواہوں کے ڈر سے فرار ہو جاتا ہے۔ اس ناکامی میں چیمبرلین کا لڑکا ایرک بھی ملوث ہے، چنانچہ اسے خیال ہوتا ہے کہ آج میرے قدیم خاندان کی آبرو برباد ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے پبلک عہدے سے دست بردار ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر فیلڈبو اس کو تسکین دیتے ہوے کہتا ہے کہ زندگی میں محض مسرت کو مقصد حیات بنانا اچھا نہیں ہے —

" آپ کی خوشی ایک سراب تھی، - آپ نے بہت سی چیزوں کی بنیادیں کھوکلی رکھی ہیں۔ یہ آپ کی کوتاہ نظری اور خود رائی کا نتیجہ ہے۔ آپ اپنے خاندانی اعزاز پر ناز کرتے ہیں لیکن اس اعزاز کی کبھی جانچ بھی ہوئی ہے؟ ...... آپ نے اپنے لڑکے کی ذہنی تربیت ضرور کی لیکن اس کے کیرکٹر کی تعمیر آج تک نہیں ہوئی ...... لوگ سیکھتے ہیں لیکن جو سیکھا

ہے اسے عمل کا جامہ نہیں پہناتے ... سینکڑوں انسان ہیں جن
کی سیرت نا تمام ہوتی ہے ان کے خیالات اور جذبات کچھہ ہوتے
ہیں ' اور ان کی عادتیں اور افعال کچھہ اور ہوتے ہیں ...... "

اسی سلسلے میں وہ اسٹینس گارڈ پر ایک سخت حملہ کرتا ہے '
لیکن چیمبرلین اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے اور اسے یقین دلاتا ہے کہ اس نے
اسٹینس گارڈ کو پوری طرح سمجھا نہیں - جب ڈاکٹر کو یہ پتہ چلتا
ہے کہ اس نے وہ جعلی بل خود بخود چیمبرلین کو بھیج دیا تو اس کے
تعجب اور ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہتی - چیمبرلین اس کی خوب
خبر لیتا ہے اور کہتا ہے میرا ارادہ ہے کہ " انجمن شباب " میں شریک ہوجاؤں -
اب لنڈے اسٹاڈ داخل ہوتا ہے اور چیمبرلین کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری
پالیسی خود ہماری ذات تک محدود ہے ' لیکن اسٹینس گارڈ کے طرز
عمل کا اثر جمہور پر پڑتا ہے - اسی گفتگو میں وہ رئیس شہر کو مشورہ
دیتا ہے کہ خیالات جدید اصل میں ایک قسم کے بھوت ہوتے ہیں جنھیں
صندوق میں بند کر کے مقفل نہیں کیا جا سکتا - اس لئے بہتر یہی ہے کہ
ان سے سمجھوتا کر لیا جائے —

پانچویں ایکٹ کے آخری حصے میں ڈرامے کے تقریباً سارے افراد چیمبرلین
کے عالی شان مکان پر اکٹھا پائے جاتے ہیں اور اس موقع پر اُس راز کا انکشاف
ہوتا ہے جو اس ڈرامے کی جان ہے - رئیس شہر کی تائید سے فیلڈ بو اس امر
کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی منگنی چیمبرلین کی بیٹی تھورا سے ہو گئی - یہ
خبر سنتے ہی اسٹینس گارڈ کے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے ہیں ' لیکن وہ
اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ راگنا
اور ہیلے کی منگنی کا باضابطہ اعلان ہو وہ کہتا ہے :—

" اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپانے کے لئے میں حیلے سے کام لوں - جب رفاہ عام کا معاملہ ہو تو میں اسے جائز سمجھتا ہوں - میری زندگی کا کام یہیں پھیلا ہوا ہے - اور میرے لئے یہی بہت ہے - میں نے اس شہر کے لئے اپنی ساری قوتیں وقف کردی ہیں - مجھے یہاں کے خیالات الجھے ہوے معلوم ہوتے ہیں ، جنھیں سلجھانا میرا فرض ہے ، مگر یہ کام صرف ایک آوارہ گرد سے انجام نہیں پا سکتا - اس شہر کے لوگوں کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا - اس لئے میں نے اپنے اغراض آپ کے اغراض سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے ، اگر میں نے اتفاقاً جھوٹی اُمید کو بیدار کیا ہو تو مجھے معاف کیجئے ، میری بھی منگنی ہو گئی ہے ! " —

اس تقریر کے بعد یہ سب سمجھتے ہیں کہ استینس کارت کی محبوبہ مادام رنڈھول میں ہے - پھر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ خطوط میں رد و بدل ہو گئی اور جو خط استینس کارت کی جانب سے راگنا کو ملنا چاهئے تھا وہ مادام کو وصول ہوا اور جو باس تی ان کی جانب سے مادام کو ملنا چاهئے تھا وہ راگنا کے پاس پہنچا - اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ذرا مزید تفصیل کی ضرورت ہے :—

چیمبرلین :— (مادام سے) تم اپنی بہن کو مبارک باد نہیں دیتیں ؟

مادام :— کس کو ؟

تھورا :- راگنا کو ! ان کی بھی تو منگنی ہو گئی ہے !

باس تی ان :— راگنا کیا تمھاری منگنی ہو گئی ؟

مادام :— سچ مچ ! باس تی ان کہتے تھے کہ کوئی شخص ان سے شادی کی

درخواست کر رہا ہے ۔ میری دعا ہے کہ دولہا دلہن خوش رہیں ۔ مسٹر استینس گارڈ میں اپنے خاندان میں تمہارا خیر مقدم کرتی ہوں —

فیلڈبو :- نہیں یہ نہیں ہیں —

چیمبرلین :- یہ نہیں بلکہ مسٹر ہیلے ہیں ، نہایت اچھی پسند ہے ۔ اور ہاں ! میری لڑکی کو بھی تو مبارک باد دو —

مادام :- مس بریٹسبرگ ! تو پھر لن ڈے استاد ٹھیک کہتے تھے ! مس تھورا ! میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں ۔ اور مسٹر استینس گارڈ تمہیں بھی !

فیلڈبو :- یعنی ڈاکٹر فیلڈبو کو ۔

مادام :- یعنی ؟

فیلڈبو :- وہ خوش نصیب میں ہوں ۔

مادام :- خوب ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔

چیمبرلین :- مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔

استینس گارڈ شرمندہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور چیمبرلین اطمینان کی سانس لیتا ہوا کہتا ہے خس کم جہاں پاک ۔ خسر کو خوش دیکھ کر سیلما اپنے شوہر کی سفارش کرتی ہے اور رئیس شہر اپنے بیٹے کی خطا معاف کرکے کہتا ہے کہ اب میں خود ایرک کا شریک بن‌کر کاروبار چلاؤں گا ۔ تھورا ، سیلما اور مادام رنڈھولمین سب خوش خوش اپنے اپنے مشاغل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور ابسن کا پہلا سوشل ڈرامہ ختم ہوتا ہے —

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈراما میں ابسن نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان پر ہم ایک گھری نظر ڈالیں ۔ سب سے پہلے ابسن موروثی

عہدے کو لیتا ہے اور اپنے ابنائے وطن کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ملکی انتظام میں وراثت کو جگہ دینا ایک شدید غلطی ہے - یہ ضروری نہیں کہ زید کا بیٹا زید ہی کی طرح ملک کے لئے مفید ہو اور اگر وہ ملک کے لئے مفید نہیں ہے تو اس کا اپنے باپ کی جگہ مقرر کیا جانا ایک نا روا بے انصافی ہے جس کا خمیازہ ملک کو اُٹھانا ہوگا - قرون وسطیٰ میں جب علوم و فنون کے خزانوں تک عوام الناس کا پہنچنا دشوار تھا اس وقت موروثی عہدوں کے کچھ معنی ہو سکتے تھے' لیکن دنیا کی تاریخ کے اس دور میں جب حصول علم میں 'محمود' اور 'ایاز' کی تمیز باقی نہیں رہی' ذہانت اور قابلیت کو حقوق خاندانی پر قربان کر دینا آئین ملک داری کے خلاف ہے - یہ ضرور ہے کہ وراثت اور خاندان کے ماحول کا اثر بچے پر پڑتا ہے' لیکن یہ اثر محدود ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی تو بالکل مفقود ہوتا ہے - اس لئے مصالح کو توارث کا تابع بنانا ایک خطرناک تجربہ ہے - اس میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں - اولاً یہ کہ جب میراث پانے کا بھروسہ ہوتا ہے تو اولاد غافل اور جاہل رہ جاتی ہے' دوسرے مستحقوں کی حق تلفی ہوتی ہے- پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ چیمبرلین خاندانی اعزاز کے گھمنڈ میں ایرک کو نہ تو وکالت کرنے دیتا ہے اور نہ اس کا تجارت میں شرکت کرنا پسند کرتا ہے - مگر ایرک اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تجارت شروع کر دیتا ہے کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ کوئی شے تو ایسی ہو جس کی خاطر وہ زندگی بسر کرے' جو اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز بن سکے - فطرت ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ انسان ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح بے جان ہو جائے ـــ

اس کے بعد ہماری نگاہ ایرک سے ہٹ کر اس کی بیوی سیلما پر پڑتی

ہے۔ سیلما نوجوان اور اغلباً حسین، اور ذہین ہے، لیکن سوسائٹی میں اس کی حیثیت کچھ نہیں، اس کا شوہر اُسے ایک کھلونا سمجھتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے محبت کرتا ہو لیکن وہ اس کی شریک حیات کسی طرح نہیں کہی جاسکتی اور جو بیوی شریک حیات نہیں ہوسکتی وہ ہرگز بیوی نہیں، بلکہ محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ اس خیال کو ابسن نے پوری وضاحت اور دلیری کے ساتھ "گڑیا کا گھر" میں بیان کیا ہے جس کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔

یہاں سیلما کے اس بیان کی جانب اشارہ کر دینا کافی ہے جس میں وہ شکایت کرتی ہے کہ جب سر سے پانی گذر گیا تب اس کا شوہر اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ابسن کے وطن میں عورتوں کی حیثیت سوسائٹی میں بہت پست تھی اور مردوں کا خیال تھا کہ ان سے مشورہ لینا، ان کو شریک غم اور ہمدرد تصور کرنا، ان کے روبرو اہم معاملات پر گفتگو کرنا، ان کو صاحب عقل و دانش سمجھنا سراسر نادانی ہے۔ اس لئے چیمبرلین کے ہاں اہم معاملات پر بات چیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب عورتیں وہاں موجود نہیں ہوتیں۔ ہم ابسن کے زمانے میں وہاں عورتوں کی وہی حالت دیکھتے ہیں جو اب مشرقی ممالک کی ہے، بلکہ مشرقی ممالک کے بجائے صرف ہندوستان اور چین کہنا چاہئے کیوں کہ اور مشرقی ممالک تو بہت آگے بڑھ رہے ہیں۔ "انجمن شباب" کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے فرائض بہت کم ہیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُمور خانہ داری میں مہارت تامہ رکھتی ہوں، میزبانی کے فرائض سے کماحقہ واقف ہوں اور بس۔ سیاست، لٹریچر، فلسفہ کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی تھی، خیالات میں اور معاشی زندگی میں انہیں مطلق آزادی حاصل

نہیں تھی - وہ محض ماں، بہن، بیٹی اور بیوی سمجھی جا تی تھیں، گو یا ان کا وجود محض اضافی تھا، کتابیں وہ پڑہ سکتی تھیں لیکن محض مذہبی کتابیں- ابسن ان حالات کے خلاف جہاد کرتا ھے، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ھے کہ اس کے وطن کی عورتوں میں بیداري پیدا ہونے لگتی ھے اور وہ ایک موقع پر جس کا ہم اوپر ذکر کر آے ھیں ایک محفل منعقد کرکے ابسن کی تعلیم و تبلیغ کا شکریہ ادا کرتی ھیں —

قصے کے دوران میں اخبار کے اڈیٹر اسلاس کین کا کیرکٹر بہت دلچسپ معلوم ہوتا ھے - اڈیٹر کے فرائض جس قدر سخت ہوتے ھیں اتنے شاید ھی کسی اور منصب کے ھوں - سرکاری ملازم دن بھر کام کرتا ھے اور رات کو مزے کی نیند سوتا ھے - جب محلےاور شہر کے اُچکے اور بدمعاش قابو میں آ جاتے ھیں تو پولیس کے ملازمین کو بھی عافیت حاصل ہو جاتی ھے - لیکن اڈیٹر کو ھمیشہ چوکس رھنا پڑتا ھے- اس کو آپ ملک کی ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی حالت کی جانب سے ھمیشہ متردد اور فکر مند پائیں گے - بعض اوقات ملک پر یکایک سیاسی ھیجان چھا جاتا ھے - کبھی اخلاق کی اصلاح کی شدید ضرورت ہوتی ھے - کبھی معاشرت کے معاملات اس قدر پیچیدہ ھوجاتے ھیں کہ خدا کی پناہ - وہ اڈیٹر جو حقیقی کامیابی کا آرزومند ہو نہ غافل ھوسکتا ھے اور نہ اپنا نقطۂ نظر بار بار بدل سکتا ھے - اس کے خیالات میں استحکام اور استواری نہایت ضروری ھے - مگر اسلاس کین بالکل تھالی کا بینگن ھے - ابھی وہ استینس گارڈ کی خوشامد کرتا ھے اور ابھی چیمبرلین کي چاپلوسی میں سو گرم نظر آتا ھے - اس سے آپ اندازہ کرسکتے ھیں کہ ابسن اپنے ملک کی صحافت سے کتنا بدظن تھا —

اب ذرا ہم اس ڈرامے کے ھیرو کی سیرت کا بھی جائزہ لیں اور یہ

دیکھیں کہ "انجمن شباب" کہاں تک کامیابی حاصل کرتی ہے اور اگر ناکام ہوتی ہے تو اس ناکامی کی کیا وجوہ ہیں۔ اسٹینس گارڈ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ چیمبرلین اور اس کا دوست لن ڈے اسٹاڈ دونوں میدان عمل میں متحد ہیں اور جو کچھ کہ چیمبرلین کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ دراصل آخرالذکر کے خیالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ رئیس شہر کی موجودگی میں اسٹینس گارڈ "انجمن شباب" کے انعقاد کا اعلان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ملک میں ابتری کی علامات اس قدر نمایاں ہو گئی ہیں کہ اصلاح کی جو توقعات ہو سکتی تھیں وہ بھی خاک میں ملی جارہی ہیں۔ وہ اپنے وطن کی افسوس ناک حالت دیکھتا ہے اور رنج کے آنسو بہاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے دوست فیلڈبو سے یہ کہتا ہوا کہ ہمیں ناپاک رسوم و آئین کو جلد سے جلد برباد کردینا چاہئے وہ دلچسپ خواب بیان کرتا ہے جس میں اس نے شہنشاہوں کو ایک سخت طوفان کی حالت میں اپنی سلطنتوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوے دیکھا تھا جو ہوا کے جھونکوں میں اڑی جا رہی تھیں۔ مگر قبل اس کے کہ یہ طوفان برپا ہو، آندھیاں نظام عالم کو زیر و زبر کریں اور بادشاہ اپنی اپنی ریاستوں کے پیچھے بھاگیں، اسٹینس گارڈ پر خود ایک تغیر واقع ہوتا ہے اور وہ اپنا پرانا سبق بھول کر رئیس شہر کے دولت کدے کا ساز و سامان سلیقہ و پاکیزگی؛ لطافت اور حسن و خوبی سے مسحور ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے حسن و ادا جادو نظری اور دلفریبی کا اس پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ملک کی اصلاح سے غافل ہو جاتا ہے اور آرزو کرنے لگتا ہے کہ میری شادی ایک دولت مند اور تعلیم یافتہ خاندان میں ہو جاے۔ وہ چیمبرلین کی حالت کا اپنی حالت سے مقابلہ کرتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ میری زندگی بھی کیسی

خشک بے مزہ اور محبت سے خالی ھے۔ رفتہ رفتہ وہ جذبہ حب وطن کو بالکل فراموش کردیتا ھے اور شادی کے چکر میں پڑ کر ایک نہایت خود غرض انسان بن جاتا ھے اور بد قسمتی سے اپنے اغراض میں یہی فنا کام رھتا ھے۔ سچ ھے قوم کی خدمت کا دعوی کرنا سہل ھے لیکن اس وادیء پر خار میں جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانا پڑتی ھیں ان کا صحیح اندازہ وھی کرسکتے ھیں جنھوں نے اس وادی میں قدم رکھا ھو۔ قدم قدم پر اس قدر ترغیبات سد راہ ھوتی ھیں کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ھیں۔ با اثر کامیاب اور لائق قومی خدمت گذاروں کے لئے حکومت کی جانب سے نئے نئے جال ڈالے جاتے ھیں، دولت کا وعدہ کیا جاتا ھے، ثروت کا لالچ دیا جاتا ھے، دھمکی سے کام لیا جاتا ھے۔ اس لئے اس کٹھن راہ میں وھی کامیاب ھوتے ھیں جو مجنون کی طرح سر فروشی کے لئے آمادہ ھوں۔ جب تک سچا ایثار اور بے نفسی نہ ھو قوم کی خدمت کا دعوی کرنا فضول ھے —

در رہ منزل لیلی کہ خطر ھا ست بجان شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

"انجمن شباب" کے بعد ھی "سوسائٹی کےستون" "The Pillars of Society" کا نمبر آتا ھے، یہ ڈراما سنہ ۱۸۷۷ ع میں تصنیف ھوا۔ اس کے نام ھی سے ظاھر ھے کہ ابسن کے پیش نظر اصلاح معاشرت کا مقصد ھے۔ پہلے ایکٹ کی ابتدا قنصل برنک کے مکان میں ھوتی ھے۔ پائیں باغ میں خواتین جمع ھیں اور ایک پادری سے باتیں کر رھی ھیں۔ قنصل کا لڑکا اولف تیر و کمان لئے ادھر اُدھر دوڑتا پھرتا ھے اور نشانہ بازی کر رھا ھے۔ اسی اثنا میں جہازوں کا معمار اون داخل ھوتا ھے جس کو قنصل کی جانب سے یہ حکم دیا جاتا ھے کہ اپنی تقریریں بند کردو۔ مستورات پادری سے گفتگو میں مصروف ھیں، پادری یہ کہہ رھا ھے کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اخلاقی اوصاف سے عاری

ہوتی ہیں۔ اور مثال کے طور پر وہ امریکہ کے اُن جہاز رانوں کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت بندرگاہ میں آے ہوے تھے۔ وہ زمانے کی ابتری کا نوحہ خواں ہے:-

"ہر طرف شکوک اور ہیجان کی علامات ہویدا ہیں۔ لوگوں کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں، ہر طرف بے اطمینانی موجزن ہے، دیکھو خاندانی اجتماع کا شیرازہ کیونکر بکھر رہا ہے، اور تخریب کی روح کس طرح اہم ترین حقائق پر حملہ کر رہی ہے ..."—

اسی گفتگو کے دوران میں اس ریلوے کا ذکر آ جاتا ہے جو گذشتہ سال اس نواح میں جاری ہونے والی تھی۔ اور جو قنصل کی کوششوں سے روک دی گئی تھی۔ عین اسی وقت قنصل کابینہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا اسی ریلوے اسکیم پر گفتگو کر رہا ہے۔ گفتگو اس قدر زور شور سے ہوتی ہے کہ عورتیں چونک پڑتی ہیں۔ اسی اثنا میں ہلمر آ موجود ہوتا ہے۔ یہ نوجوان مسز برنک کا رشتے کا بھائی ہے اور اپنی باتوں سے اور حرکتوں سے مسخرا سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا کیرکٹر ان سب لوگوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ خواتین اس قدر مردہ اور بے حس ہیں جیسے عجائب خانوں میں ممیاں ہوتی ہیں۔ ان کے خیالات پر مذہب کا اس قدر گہرا رنگ طاری ہے کہ آزادی کے ساتھ سانس بھی نہیں لے سکتیں۔ باتیں بھی کرتی ہیں تو مذہب کے رعب سے دبی ہوئی آواز میں، ان کی شخصیتیں معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی روایات، مذہبی تعصبات اور رسم و رواج میں محو ہو کر عرصہ ہوا فنا ہو چکی ہیں۔ ہلمر آتے ہی اول تو اس مذہبی کتاب پر حرف گیری شروع کرتا ہے جو یہ خواتین پڑھ رہی تھیں اور اس کے بعد اولف کو تیر و کمان سے کھیلنے کے بجاے بندوق سے کھیلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ خواتین ان آزاد خیالی کی باتوں پر ہکا بکا رہ جاتی ہیں۔ ہلمر پادری پر حقارت کی نظر ڈالتے

ہوئے اس بات پر زور دیتا ہے کہ قوم کے بچوں میں ہر ممکن طریقے سے ہمت، شجاعت اور بہادری پیدا کرنی چاہئیے - اولف اپنے ماموں کی شہ پا کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ امریکہ جانے کا آرزو مند ہے تا کہ یوحان اور لونا سے مل سکے ۔ یہ بات سنتے ہی مسز برنک اُسے اس قدر زور سے للکارتی ہیں کہ وہ دم بخود رہ جاتا ہے، باتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے اور خواتین اس امر پر مسرت کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے قصبے سے رقص، موسیقی اور تمثیل کے کلب غائب ہو گئے جن کی وجہ سے اکثر خاندانوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی - اس کے بعد مسز برنک پائیں باغ میں جاکر میزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہیں اور بقیہ عورتوں میں یوحان اور لونا کے افسانے کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یوحان کو اپنے وطن سے مجبوراً فرار ہونا پڑا تھا، کیونکہ وہ ڈینا کی ماں کے ساتھ ملوث ہو چکا تھا - ایک اور وجہ جس سے وہ فرار ہونے پر مجبور تھا یہ تھی کہ وہ مسٹر برنک کے والد کے دفتر کا خزانچی تھا اور جو روپیہ اس کی تحویل میں تھا اس میں غبن ثابت ہوا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرار ہونے کی اصلی وجہ کسی کو معلوم نہ ہو سکی - مگر ڈینا کے والد نے اپنی بیوی اور بچی ڈینا دونوں کو چھوڑ دیا، ناکامی اور تنگ دستی نے ماں کو جلد قبر میں جا سلایا اور ڈینا کو اس مکان میں عافیت نصیب ہوئی ۔ اسی سلسلے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوحان لونا پر عاشق تھا اور وہ اس کے ساتھ امریکہ چلی گئی —

اس کے بعد کے سین میں ڈینا کا کیرکٹر ایک دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے - وہ پادری کے پندار و تمکنت کے پرزے اڑاتی ہے، اور

اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ کبھی اپنی خودسری سے باز نہیں آ سکتی۔ پھر کہتی ہے کہ میں اس گھر سے عاجز آگئی ہوں جہاں لوگ اس قدر سخت گیر اور ثقہ ہیں کہ سانس لینا بھی دشوار ہے۔ اصل میں اسے نہ تو یہ پادری دل سے پسند ہے اور نہ اس کی باتوں میں لطف آتا ہے۔ وہ اس کی شکایت کرتی ہے کہ آخر وہ اپنی محبت چھپانے کی غیر ضروری کوششیں کیوں کرتا ہے۔ پادری جواب دیتا ہے کہ میں سوسائٹی کا اخلاقی ستون ہوں اس لئے مناسب نہیں کہ میرے جذبات عوام الناس پر ظاہر ہوں پھر بھی اسے امید ہے کہ جب تقدیر یاوری کرے گی تو دینا اس کی محبت کی قدر کرنے کو طیار ہوگی۔ دینا جذبات کا ایک امنڈتا ہوا دریا اپنے دل میں لئے ہوے اس سے اقرار محبت کر لیتی ہے —

دوسرے سین میں برنک کابینہ کی مجلس ختم کر کے ممبروں کے ساتھ پائیں باغ میں آتا ہے۔ اور میزوں کے چاروں طرف حلقہ جمتا ہے۔ وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ریلوے اسکیم آخر کار منظور ہو گئی اور جلد جاری ہو جاے گی۔ اس خبر کو سنتے ہی پادری چراغ پا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو گرد و نواح کے اخلاق کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے جواب میں برنک عبادت خانوں کی برکات کا ذکر کرتا ہے اور گھریلو زندگی کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے —

" گھر سوسائٹی کا جوہر ہے ' اچھا گھر ' باعزت اور قابل اعتماد احباب کا ایک مختصر سا حلقہ جہاں پریشان کن عناصر کا سایہ تک نہ آ سکے... "

دراصل یہ حصہ ایک قسم کا ضروری دیباچہ ہے جس سے پڑھنے والا زمانے اور ملک کے حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس اثناء میں یہ خبر آتی ہے کہ بیرونی ڈاک کا جہاز آ گیا اور مجلس یکلخت برخاست ہو جاتی ہے - برنک کو نیویارک کا تار ملتا ہے کہ ' جہاز ' انڈین گرل ' جلد سے جلد سومت کرا کے فوراً روانہ کردو - برنک سوچتا ہے کہ جہاز ہرگز سفر کے قابل نہیں ہے ' کیسے روانہ کر دیا جاے - نفع حاصل کرنے کی ہوس میں انسانی جانوں کا خیال نہ کرنا ان اقوام کا طرۂ امتیاز ہے جن کے دنیا میں بڑے نام ہیں - پور یہ خبر ملتی ہے کہ جہاز میں ایک سرکس کمپنی آئی ہے - یہ خبر پادری کو اور عورتوں کو بے چین کر دیتی ہے - ان کا خیال ہے کہ ان لوگوں کو یہاں تماشا کرنے کی اجازت نہیں ملنا چاہئے - اتنے میں باغ کے دروازے پر سارے سرکس والے آ موجود ہوتے ہیں اور عورتیں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے ڈال دیتی ہیں - ادھر باغ کے پھاٹک سے ایک عورت داخل ہوتی ہے ' ساری جماعت ششدر ہو کر اسے دیکھتی ہے ' سب یک زباں ہو کر چلا اٹھتے ہیں 'اونا' اونا کی آمد جس قدر حیرت انگیز ہے اسی قدر یہ خبر وحشت اثر ہے کہ اس کے ہمراہ یوحان بھی آیا ہے- اونا کھڑکیوں کو بند پاکر یہ دیکھتی ہے کہ عورتیں تاریکی میں بیٹھی ہوئی کوئی سفید کپڑا سی رہی ہیں - اسے خیال ہوتا ہے کہ کہیں گھر میں کوئی موت نہ ہوگئی ہو- پادری فضا بدلی ہوئی دیکھ کر جانے لگتا ہے - اونا کہتی ہے کہ میں بھی تمھارے حلقے میں اس غرض سے شریک ہونا چاہتی ہوں کہ اس میں کچھ تازہ ہوا پہنچا سکوں —

ڈرامے کا اصلی لطف دوسرے ایکٹ سے شروع ہوتا ہے - برنک کو یوحان کے آنے سے اپنی بدنامی کا خوف ہے اور وہ پریشان ہے - اس وقت اسے اپنی ساکھ قائم رکھنے کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ ریلوے اسکیم نافذ ہونے والی ہے - اب اون آتا ہے اور اپنے آقا سے کہتا ہے کہ " پام ٹری " (Palm Tree)

جہاز قریب طیار ہے ' لیکن انڈین گرل (Indian Girl) امریکن جہاز اس قدر ناقص ہے کہ اس کی مرمت جلد نہیں ہوسکتی ۔ برنک کہتا ہے کہ تم دیر اس لئے کرتے ہو کہ مشین استعمال کرنا نہیں چاہتے ۔ اون جواب دیتا ہے کہ اگر مشین یہاں چلائی جائے گی تو ہزاروں مزدور بیکار اور بے روز گار ہوجائیں گے ۔ اون کا انداز کلام اور خیالات برنک کو بیحد برافروختہ کردیتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ اگر دو دن کے اندر یہ جہاز طیار نہ ہوا تو تم برطرف کردئے جاؤ گے ۔ اون وعدہ کرلیتا ہے کہ پرسوں جہاز روانہ ہونے کے قابل ہو جائے گا —

ہلمر داخل ہوتا ہے اور مسز برنک کی نمناک آنکھیں دیکھہ کر سمجھہ جاتا ہے کہ اُسے یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ یوحان اور لونا ' دینا کے ساتھہ شہر کا چکر لگا رہے ہیں اور سارے شہر میں ان کی آمد پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں ۔ یوحان اور دینا میں باہم صحبت ہوجاتی ہے جس کا اندازہ اس مکالمے سے ہوگا —

یوحان :- تو اسے گولی مارو اور ہمارے ساتھہ چلی چلو

دینا :- تم تو مذاق کر رہے ہو ۔ تم نے اول سے بھی یہی کہا تھا ۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کیا وہاں (امریکہ) بھی لوگ ایسے ہی پارسا ہوتے ہیں جیسے یہاں ۔ سمجھے کہ نہیں ؟

یوحان :- پارسا ؟

دینا :- ہاں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ ایسے ہی با اصول اور سخت گیر ہوتے ہیں جیسے یہاں کے لوگ ؟

یوحان :- کم سے کم وہ اتنے خراب بھی نہیں ہیں جیسا یہاں کے لوگوں نے سمجھہ رکھا ہے ۔ لیکن آخر تم اس قدر خائف کیوں ہو —

ڈینا :- تم میرا مطلب نہیں سمجھتے ' میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ وہ
ایسے پارسا اور سخت گیر نہ ہوں جیسے یہاں والے ہوتے ہیں -

ڈینا اپنے والدین کے جرم سے واقف ہے - وہ اپنی ماں کی کمزوری اور باپ کے غیض و غضب کی داستان سن چکی ہے - وہ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ برنک کے خاندان کے افراد اُسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے سامنے اچھے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان سے سبق لے سکے کیونکہ ان کے خیال میں ڈینا کو اچھی تعلیم کی اشد ضرورت ہے - وہ رہبانیت کی فضا اور پادری کی خشک ' بے کیف ' دور از عقل ' غیر دلچسپ اور بے مزہ کتابوں سے اُکتا گئی ہے - مسز برنک وغیرہ کی جا و بے جا نصیحتیں اس کا جام صبر لبریز کر چکی ہیں - وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کی آرزو مند ہے - اس لئے امریکہ جانا چاہتی ہے ' مگر پہلے یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہے کہ وہاں کی فضا بھی آزاد ہے یا نہیں —

دوسرے ایکٹ کے وسط میں ایک دلچسپ سین آتا ہے جس میں یوحان اور برنک تنہا باتیں کرتے ہیں - برنک ' یوحان سے کہتا ہے کہ مجھے یہ گھر ' یہ دولت اور زندگی کی مسرت و کامیابی سب تمہاری بدولت نصیب ہوئی ہے - تم نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہزاروں میں ایک بھی نہ کرتا - یوحان کہتا ہے کہ تم میرے عزیز ترین دوست تھے ' میں نے تمہارے لئے جو ایثار کیا اس پر فخر کرتا ہوں - مجھے اپنے اوپر اس لئے الزام لینا پڑا کہ تمہاری منگنی ہو چکی تھی ' میں ایک لاوارث یتیم تھا ' مجھے ایک نئی دنیا میں زندگی شروع کرنا مشکل نہ تھا - یوحان کی باتیں سن کر برنک کے تشکر و امتنان کی کوئی حد نہیں رہتی - لیکن

ڈینا کی نگاہ میں حتیٰ کہ خود اپنی بہن مسز برنک کی نگاہ میں یوحان مجرم ہے - اور برنک نیکی اور شرافت کی جیتی جاگتی تصویر - اس سلسلے میں یوحان اُن قربانیوں کا ذکر کرتا ہے جو لونا نے اس کے لئے امریکہ میں کی تھیں —

" میں بیمار ہوگیا اور عرصے تک اچھا نہ ہوسکا ' نہ خود کما سکتا تھا اور نہ اُسے کمانے سے روک سکتا تھا - اُس نے قہوہ خانوں میں گانا شروع کیا ' جلسوں میں لکچر دئیے ' ایک کتاب لکھی ' اور یہ سب اس لئے کہ مجھے فاقوں مرنے سے بچائے "

اس کے بعد برنک اور لونا کو تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع ملتا ہے - اس لئے برنک اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے طرز عمل کی تاویلیں پیش کرے ' اُس نے ابتدا میں لونا سے عشق بازی شروع کی تھی ' لیکن رسومات کی پابندی اور مصلحت وقت کی وجہہ سے وہ اس سے شادی نہیں کرسکا تھا - لونا کہتی ہے تم جب تک وطن سے دور رہے تم آزاد خیال تھے ' مجھہ سے محبت کرتے تھے ' لیکن وطن میں آتے ہی ناروے کی تنگ نظری تم پر حاوی ہوگئی اور تمہاری آزاد خیالی اور محبت دونوں جاتی رہیں ' کیونکہ تمہاری بیوی میری خالہ کی وارث بنی ' اور میں مفلس رہ گئی - برنک اپنی کمزوری کا خندہ پیشانی کے ساتھہ اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعی میں اپنی بیوی کی دولت پر فریفتہ ہوا تھا نہ کہ اس کے حسن پر - تنگ نظر برنک اپنے گھر کی خوبیوں اور اپنی شادی کی کامیابی کا ذکر کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ شرافت ' صداقت ' اور تہذیب و شائستگی میں میرا گھر ' میری قوم کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہے - لونا کہتی ہے کہ تم بے شک شہر کے سب سے دولت مند اور باائر رئیس ہو ' تمہاری زندگی

تمهارا کاروبار ' اور تمهارا گهر عوام کے لئے نمونه مانا جاتا هے ' هر جماعت میں تمهارا نام عزت اور آبرو کے ساتهه لیا جاتا هے ' هر مجلس میں تمهارا احترام کیا جاتا هے ' لیکن تمهارے کاروبار اور شهرت کا قلعه ریت کے تودے پر بنا هوا هے ' اس کی بنیاد جهوٹ پر قائم هے ' ممکن هے که ایسا وقت آجائے که یه جهوٹ کُهل جائے اور یه ساری عمارت دم بهر میں بیٹهه جائے - میں امریکه سے اسی غرض سے آئی هوں که اس کی بنیادوں کو استوار کردوں - برنک بد حواس هوکر کهتا هے که کیا تم مجهه سے انتقام لینا چاهتی هو ' اگر تمهارا ایسا خیال هے تو میں اپنی آبرو بچانے کی پوری کوشش کروں گا - اسی دوران میں کابینه کے دو ممبر آتے هیں اور برنک کو اپنے ساتهه لے جانا چاهتے هیں کیونکه لوگوں نے ریلوے اسکیم کی مخالفت شروع کردی هے - ان کا خیال هے که اس اسکیم سے ذاتی اغراض وابسته هیں ' اب برنک اس لئے مدعو کیا جاتا هے که عوام کو اُس پر اعتماد هے ' اگر وه اس اسکیم کی تائید کردے گا تو پبلک کو اس اسکیم کی جانب سے کوئی شبه باقی نه رهے گا —

تیسرے ایکٹ کی ابتدا برنک کی ایک تقریر سے هوتی هے جس میں وه اپنی بیوی کی نادانی اور غفلت شعاری پر غصه کا اظهار کرتا هے - اتنے میں کراپ داخل هوتا هے اور برنک کو یه خبر سناتا هے "پام ٹری" کل روانه هونے کے لئے طیار هے - "انڈین گرل" بهی روانه هوسکتا هے ' لیکن سفر خیریت کے ساتهه ختم نه کرسکے گا ' کیونکه اون نے اس معامله میں ایک چال چلی هے ' اس میں نئی لکڑی نهیں لگائی گئی هے ' بلکه ناقص طریقے سے مرمت کرکے اوپر سے اچهی پالش کردی گئی هے - کراپ کا خیال هے که اون نئی مشین کے کام کو بدنام کرنا چاهتا هے - برنک اس چالبازی

سے سخت پریشان ہوتا ہے اور کراپ سے کہتا ہے قبل اس کے کہ میں اس معاملے کی رپوٹ کروں بہتر ہے کہ تم اس کی پوری تفتیش کرکے اطمینان کرلو —

کراپ کے جاتے ہی هلمر داخل ہوتا ہے اور برنک کو یہ خبر سناتا ہے کہ سارے شہر میں یہ افواہ ہے کہ ریلوے اسکیم سے بعض اکابر شہر منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں ' چنانچہ اسی غرض سے اس نواح کے سارے جنگلات خریدے جاچکے ہیں - برنک یہ خبر هلمر سے سن کر اور پریشان ہو جاتا ہے - اس کے بعد ہی لونا آموجود ہوتی ہے اور وہ اور برنک ایک نہایت خفیہ مگر اہم مکالمے میں مشغول ہو جاتے ہیں - لونا جب برنک کی زبان سے یہ سنتی ہے کہ یوحان پر روپیہ غبن کرنے کا الزام سراسر بہتان تھا اور خود برنک نے اس خبر کو اپنے فائدہ کی غرض سے پھیلایا تھا تو اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی - برنک کہتا ہے کہ عین اس زمانے میں ہمارے کاروبار کی حالت تباہ ہو رہی تھی ' شہر میں یہ یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ یوحان کثیر رقم لے کر امریکہ چل دیا - میں نے اس افواہ کی اس لئے مخالفت نہ کی کہ مجھے قرض خواہوں سے ادائگیء زر کے لئے تھوڑے سے وقفے کی ضرورت تھی -

برنک :- لونا ! اس افواہ نے میرے گھر کو محفوظ رکھا اور مجھے وہ بنا دیا جو تم آج دیکھتی ہو "۔

لونا :- تو کیا تم جو کچھہ ہو وہ ایک جھوٹ کے بنائے ہوئے ہو -

برنک :- مگر اس جھوٹ سے کسے نقصان پہنچا - یوحان کا امریکہ سے واپسی کا مطلق ارادہ نہ تھا -

لونا :- تم یہ پوچھتے ہو کہ اس سے کسے نقصان پہنچا ' خود اپنے اندر دیکھو ' کیا

تمھاری روح محروم نہیں ہے -

برنک :- ہر شخص کی روح میں کم سے کم ایک داغ تو ایسا ہوتا ہے جسے پوشیدہ رکھنا چاہئیے -

لونا :- اور اس پر تم اپنے آپ کو سوسائٹی کا ستون سمجھتے ہو!

برنک :- سوسائٹی کے ستون سب کہیں ایسے ہی ہوتے ہیں -

لونا :- تو پھر سوسائٹی کے قائم رہنے ہی کی کیا ضرورت ہے ' اس کے اندر کن باتوں کا چلن ہے' جھوٹ اور فریب کا - اس کے علاوہ کچھہ نہیں- تم شہر کے سب سے بڑے آدمی ہو ' تمھارے پاس دولت ' اثر اور عزت سب کچھہ ہے - تم نے ایک بے گناہ انسان پر جرم کا داغ لگایا -

برنک :- کیا تم سمجھتی ہو میں اسے محسوس نہیں کرتا کہ میں نے اسے بدنام کیا ہے' کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ میں اس کی تلافی کے لئے طیار نہیں ہوں -

لونا :- کیسے ؟ حقیقت حال کا اعلان کرکے ؟

اس سوال سے برنک چونک پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس زمانے میں کسی قسم کی بدنامی مول نہیں لے سکتا - اتنے میں یوحان بھی آکر مکالمے میں شریک ہو جاتا ہے اور برنک سے کہتا ہے کہ خیر جو کچھہ ہوا سو ہوا- مگر اب تم سچی بات کا اعلان کر کے میری بے گناہی ظاہر کر دو ' میں دینا سے شادی کر کے یہاں آباد ہونا چاہتا ہوں - برنک کے ہاتھوں کے توتے اُڑ جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں خاک میں مل جاؤں گا - وہ صاف صاف کہتا ہے کہ جہازوں کی تجارت اور ریلوے اسکیم سے مجھے بڑے منافع کی توقع ہے - ریلوے اسکیم کی مخالفت محض

اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ لوگ مجھ پر بھروسا کئے ہوئے ہیں ورنہ آج بھانڈا پھوٹ جائے اور وہ بے شمار روپیہ جو ہم نے جنگلات، کانوں اور آبشاروں کو خریدنے میں صرف کیا ہے سب غارت ہوجائے یہاں اس راز کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ کابینہ کے سارے ممبر اس سازش میں شریک ہیں۔ اور منافع میں حصہ دار ہیں۔ لیکن ان میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہیں جو برنک کی امداد کے بغیر اس بڑے کام کو چلا سکے۔ اسی گفتگو میں یوحان کہتا ہے کہ میں کل "انڈین گرل" میں واپس جانے والا ہوں، مگر دو مہینے بعد واپس آکر یہاں آباد ہوں گا۔ اس کے بعد اپنی بے گنا ہی ثابت کرنے کے لئے وہ خطوط پیش کروں گا جو تم نے مجھے لکھے تھے۔ یہ جہاز انڈین گرل وہی ہے جس کی مرمت کے لئے اون کو صرف دو دن کا وقفہ دیا گیا تھا اور جس کی اچھی طرح مرمت نہیں ہو سکی ہے۔ کراپ آتا ہے اور برنک سے کہتا ہے کہ اگر اس حالت یہ میں جہاز روانہ ہوا تو پھر شاید ہی اس کی کوئی خبر ملے۔ اُدھر پادری دینا اور یوحان کے اختلاط کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور سب کے سامنے اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ دینا میری منگیتر ہے۔ دینا اس کا اقرار کرتی ہے اور یوحان غیظ و غضب کی حالت میں کہتا ہے کہ میں امریکہ سے جلد واپس آؤں گا اور تم میں سے ایک ایک کو کچل ڈالوں گا۔ اولف کے چہرے سے اور اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دماغ پر بھی امریکہ کا سودا سوار ہے۔ عین اُس وقت یہ خبر ملتی ہے کہ ایک شدید طوفان اٹھا ہے، مگر برنک کہتا ہے اس کے با وجود "انڈین گرل" روانہ ہوگا۔

ڈراما کا چوتھا ایکٹ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں نقاش ادب جو نقوش طیار کر رہا تھا وہ پوری آب و تاب کے

ساتھ اس ایکٹ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ رمل برنک سے کہتا ہے کہ تمہاری زندگی کا سب سے کامیاب لمحہ آ گیا۔ یہ لمحہ اصل میں نقطۂ انقلاب ہے۔ ابسن کے ہیرو کی سیرت میں کایا پلٹ ہونے والی ہے۔ ڈراما کا یہ حصہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے تاکہ برنک میں جو انقلاب رونما ہوا اس کے اسباب اور کم و بیش علامات بھی پہلے سے رفتہ رفتہ ظاہر کردی جائیں۔ اس کی مثال شیکسپیر کے میکبتھ میں ملتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ابسن کے اشارے بہت لطیف ہوتے ہیں، اس کی تصاویر میں نزاکت ہوتی ہے، وہ اپنے قلم کی ہلکی سی جنبش سے کام لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں کایا پلٹ بہت مشکل سے ہوتی ہے، اس لئے برنک میں یہ انقلاب پیدا کرنے کے لئے ابسن کو غیر معمولی پیش بندی کرنا پڑی —

برنک کو جدید واقعات سے متعلق خیالات نے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا ہے اس لئے اسے جب رمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے لوگ ایک جلوس طیار کر رہے ہیں اور اس کے مکان پر اس کی قومی خدمات کا شکریہ ادا کرنے آنے والے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ رمل کا یہ خیال ہے کہ اس پبلک مظاہرے سے پورا فائدہ اٹھا کر دشمنوں کو پامال کردینا چاہئیے۔ مگر خلاف توقع برنک کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے، حالانکہ اس جیسے شخص کے لئے اس سے بڑھ کر عزت افزائی نہیں ہو سکتی تھی۔ واقعات کے اثرات اس کے دل و دماغ پر کارفرما ہیں اور اندر ہی اندر اس کی طبیعت میں عجیب و غریب تبدیلی پیدا ہورہی ہے۔ جو عنقریب ایک دلکش صورت میں ہمارے سامنے آنے والی ہے۔ رمل بار بار اس کو اس امر سے مطلع کرتا ہے کہ جلوس آرہا ہے۔ باجوں کی دلفریب صدائیں قریب ہوتی

جاتی ہیں اور کوئی دم میں یہ جلوس اُس کے مکان پر آموجود ہوگا - برنک جلوس کا استقبال کرنے سے عذر کرتا ہے ' لیکن وہ تو روانہ ہو چکا ' اب واپس نہیں کیا جا سکتا - اسی بھاگ دوڑ میں اولف کھڑکی سے کود کر جہاز کی راہ لیتا ہے اور لونا سے کہہ جاتا ہے کہ میں اپنے ماموں کو رخصت کرنے جارہا ہوں- دوسرے دروازے سے یوحان آتا ہے اور اس کے ساتھہ ساتھہ دینا اور مرتھا بھی داخل ہوتی ہیں - دینا یوحان کے ہمراہ امریکہ جانے کے لئے طیار ہے- وہ پھر وہی راگ گانا شروع کرتی ہے کہ میں اس رسمی اخلاق سے اُکتا گئی ہوں اور کسی آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں - مرتھا کہتی ہے کہ ہم عورتیں رسومات کی پابندیوں سے پسی جاتی ہیں ' وہ دینا کو بغاوت کے لئے آمادہ کرتی ہے اور اُسے یوحان سے شادی کرنے کی ترغیب دیتی ہے ' - دینا اقرار کرلیتی ہے ' لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھی کہتی جاتی ہے کہ شادی سے قبل میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں تاکہ میں خود اپنے آپ کو یوحان کی خدمت میں پیش کرسکوں - نہ صرف یہ بلکہ مرتھا سے وہ یہ وعدہ بھی کرنے کے لئے طیار نہیں ہے کہ وہ یوحان کو خوش رکھے گی - وہ کہتی ہے وعدہ کرنا فضول ہے' نظام حیات بالکل فطرت کے مطابق ہونا چاہئیے' جس میں وعدے اور کوشش کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو - یہاں مرتھا لونا سے اس امر کا اعتراف کرتی ہے کہ اُس نے تمام عمر یوحان اور اس کی یاد کو جان سے زیادہ عزیز رکھا - لیکن ناروے واپس آنے پر وہ کچھہ ایسا مبہوت ہوگیا کہ اُسے دیکھہ بھی نہ سکا —

دوسرے سین میں شاندار جلوس کی روشنی اور دھواں دھار تقریروں کو پیش کرنے سے قبل ابسن لونا اور برنک میں بات چیت شروع کراتا ہے ' جس میں برنک اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کیا ' خصوصاً اس وجہ سے کہ اگر وہ اپنے ابنائے وطن کے خیالات سے

آگے بڑھنا چاھتا تو اس کا برا حشر ھوتا کیونکہ وہ سوسائٹی کا ستون تصور کیا جاتا ھے ' مگر اُسے اس کا اطمینان ھے کہ آنے والی نسل کو اس کی مساعی سے فیض پہنچ سکے گا لونا برنک کو بتاتی ھے - کہ یوحان دینا کو لے کر جا چکا اور اب کبھی واپس نہ آے گا - برنک متحیر ھوجاتا ھے اور جب اُسے یہ معلوم ھوتا ھے کہ وہ دونوں " پام تری " میں سفر کرنے والے ھیں تو وہ جلد سے جلد یہ حکم نافذ کرتا ھے کہ " انڈین گرل " کو آج روانہ نہیں ھونا چاھئیے - لونا برنک کو تسلی دیتی ھوئی کہتی ھے کہ میں یہ قیمتی خطوط جس سے تمھارے گناہ ثابت ھوسکتے ھیں پھاڑے ڈالتی ھوں ' لیکن یہ ضرور چاھتی ھوں کہ تم اس جھوٹ کے گورکھہ دھندے سے باھر نکل آؤ جس میں تمھارا بال بال جکڑا ھوا ھے - معاً ھلمر آکر یہ خبر سناتا ھے کہ اولف " انڈین گرل " میں فرار ھوگیا ' برنک کا چہرہ زرد پڑجاتا ھے ' وہ اس جہاز کو روکنے کا حکم دیتا ھے لیکن جب اُسے یہ معلوم ھوتا ھے کہ یہ ناممکن ھے تو اُس کی افسردگی اور شکستہ دلی دیکھہ کر رحم آتا ھے - اسی اثنا میں جلوس آموجود ھوتا ھے ' مسز برنک کا کہیں پتہ نہیں ' برنک دیوانہ وار مرتھا سے کہتا ھے کہ لڑکا یوں فرار ھوا کہ اس کی جان خطرے میں ھے - بیوی خدا جانے کدھر سدھاریں ' میں کس دل سے جلوس کا استقبال کروں - اس حالت میں مسز برنک داخل ھوتی ھیں ' وہ غریب بچے کی تلاش میں ساحل تک گئی تھیں - "انڈین گرل " کے سامان تجارت کے گٹھوں میں سے اس نے اولف کو نکالا - تلاش میں اتنی دیر لگی کہ رات ھوگئی اور جہاز روانہ نہ ھوسکا - یہ مژدہ سن کر برنک کی جان میں جان آتی ھے کہ لڑکا موت کے منہ میں سے نکل آیا اور سینکڑوں آدمیوں کی جانیں بچیں جو اس جہاز میں سفر کرنے والے تھے- اتنے میں جلوس آموجود ھوتا ھے اور سارا

پائیں باغ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر امنڈا چلا آرہا ہے - پادری شہر کی جانب سے برنک کی پبلک خدمات کا شکریہ اداکرتے ہوے اس کی بےلوث زندگی اور حسن اخلاق کی بڑے زور شور سے تعریف کرتا ہے - ہر طرف سےنعرہ ہاےتحسین بلند ہوتے ہیں اور لوگ اس کا اعتراف کرتےہیں کہ سوسائٹی کے ستون کا اخلاق اور کردار ایسا ہی بےلوث اور پاک ہونا چاہئیے جیسا برنک کاہے- اُس کےعلاوہ سوسائٹی کے اور ستون جو برنک کے رفیق اور معین کار تھے ان کی بھی مدح سرائی ہوتی ہے اور سب کو پبلک کی جانب سے قیمتی تحائف دئے جاتے ہیں —

وہ نا ہموار راہ جس کو مسطح کرنے میں ابسن نے اس قدر عرق ریزی کی تھی ختم ہوتی ہے اور اس کے موڑ پر وہ منزل نظر آرہی ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے یہ زحمت برداشت کی گئی تھی - جس خیال پر ڈراما کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ اب واقعے کی صورت اختیار کر رہا ہے' یعنی لونا کی دیرینہ آرزو کہ اس کا محبوب برنک جلد سے جلد اپنے اوپر سے ردائے باطل اُتار کر پھینک دے پوری ہونے والی ہے - یہ نقطۂ انقلاب ڈراما کی جان اور ابسن کے کمال کا بہترین نمونہ ہے - ہمیں معلوم ہے کہ اس نے اپنی دنیاوی وجاہت اور ثروت کی عمارت ایک افسوس ناک فریب کی بنیاد پر تعمیر کی تھی جس کا علم یوحان کے علاوہ لونا کو ہو چکا تھا - اس ڈرامے کے آخری سین میں رفتہ رفتہ ایسے واقعات رو نما ہوے کہ برنک خود اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ حقیقت کا انکشاف کردے اور گناہ کے داغ کو توبہ کے پاک پانی سے دھو دے - چنانچہ جب جلوس اس کے مکان میں پہنچتا ہے اس وقت ہم کو برنک نئی شان سے نظر آتا ہے- اس کا دل اس جرأت اور ہمت سے معمور ہے جو اظہار حق کے لئے در کار ہے- وہ جب پادری کی مدح سرائی کا جواب دیتا ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے

خود اس کا عزیز ترین دوست حیران رہ جاتا ہے ۔ لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ برنک کا دماغ مختل ہو گیا ہے ۔ اپنے افعال قبیحہ کا جن پر بھاری ثروت اور دولت کا انحصار ہو اس قدر دلیری کے ساتھ مجمع عام میں اعلان کرنا اخلاقی جرات کا اتنا بڑا کار نامہ ہے کہ جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے ملتی ہیں ۔ وہ کہتا ہے :—

" ... آج ہم اپنے ملک کی زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے والے ہیں ' لیکن اس کی ابتدا کرنے سے قبل ہمیں سچائی کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لینا چاہئیے ۔ سب سے پہلے میں پادری صاحب کے قصیدے کی تردید کرتا ہوں ' میں اس کا مستحق نہیں ہوں ' کیونکہ آج تک میرا کوئی عمل خلوص پر مبنی نہ تھا ۔ گو میں نے ہمیشہ مادی منافع کا خیال نہیں کیا مگر قوت اور اثر حاصل کرنے کی کوشش ہمیشہ کرتا رہا ... ... مثلاً ریلوے لائن کی تجویز کے سلسلے میں ایک بڑی جائداد کے خریدے جانے کی افواہ گرم ہے ۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ جائداد خود میں نے تنہا خریدی ہے ۔ اب میں نے اپنے احباب رمل ' ویگ لانڈ اور سانڈ اسٹاڈ کی شرکت میں ایک متحدہ کمپنی کے اجرا کا ارادہ کیا ہے ۔ اب جو چاہے وہ اس کے حصے خرید سکتا ہے ... یہ بیان کیا گیا ہے کہ " بدی کا عنصر " آج یہاں سے دور ہو گیا ' مگر آپ پر واضح ہو کہ یہ شخص تنہا نہیں گیا ۔ اس کے ساتھ دینا اس کی بیوی بننے کے لئے گئی ہے ۔ ...... (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب ہمیں اس شخص کے سامنے ادب سے جھکنا چاہئیے جس کی گردن پر پندرہ

برس سے ایک گناہ کا بوجھہ ہے ' وطن کے دوستو ' میں وہ گناہ بیان کئے دیتا ہوں ' اس کا زہر میری رگ رگ میں پیوست ہوچکا ہے - اب سنو ' پندرہ سال ہوے میں مجرم تھا - جرم دوسرے شخص کا نہ تھا میرا تھا - مگر میری جگھہ اسے فرار ہونا پڑا - اب ان پندرہ برس کی افواہوں کے اثر کو زائل کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہے ' میں ان افواہوں سے پندرہ سال تک فائدہ اٹھاتا رہا ...... " —

اعلان ہو چکا - لوگ بڑے جوش و خروش سے باتیں کرتے گھر واپس جا رہے ہیں - برنک اور مسز برنک ایک دوسرے سے گلے مل کر سچی خوشی کا لطف حاصل کرتے ہیں - برنک کہتا ہے کہ یہ سب لونا کی جوتیوں کا طفیل ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سوسائٹی کے ستون عورتیں ہی ہوسکتی ہیں - لونا امریکہ سے محض اسی غرض سے آئی تھی کہ اس کی جوانی کا ہیرو برنک اس فریب کے دام سے آزاد ہو جاے - اصل میں لونا کو برنک سے نفرت کرنا چاہئے تھی کیونکہ اس کے جذبات کے مقابلے میں اس نے ایک دوسری عورت کی دولت کو ترجیح دی اور لونا کو آخر کار شکستہ دل ہو کر امریکہ بھاگنا پڑا ' لیکن لونا اب تک اس کو دل سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اور اس کو دلدل میں سے نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے ' جس نتیجہ پر برنک پہنچا ہے اس کو سن کر لونا مسکراتی ہے اور کہتی ہے کہ :

" روح صداقت اور روح آزادی ' یہ ہیں دراصل سوسائٹی کے ستون عورتوں کو سوسائٹی کا ستون نہیں کہنا چاہئے " -

ابسن کے اس معرکۃ الآرا ڈرامے کا خلاصہ آپ کی خدمت میں موجود ہے- اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم ابسن کے ان خیالات پر ایک ناقدانہ نگاہ

ڈالیں جو اس نے اس تصنیف میں ظاہر کئے ہیں اور ڈراما کے خاص خاص اشخاص کے کیرکٹر کا غور سے مطالعہ کریں۔ ڈراما کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے وطن کی طرز معاشرت سے خصوصاً اور یورپ کے سوشل حالات سے عموماً برسر جنگ ہے - ابسن جب جنگ کرنے پر آتا ہے تو پورے ساز و سامان کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے - ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ بز دل تھا ' اس لئے اُس نے ناروے کو خیر باد کہہ‌کر براعظم یورپ کو اپنا وطن بنا لیا تھا ' مگر وہاں سے اس شدت سے آگ برساتا تھا کہ مخالفوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے - اس ڈرامے میں وہ جھوٹ ' مکر ' فریب کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے - ان کے علحدہ علحدہ مجسمے بناتا ہے اور غصے میں آکر ان کو پاش پاش کر دیتا ہے - ہر ملک ' ہر طبقے اور ہر زمانے میں سوسائٹی کے بعض ایسے بت ہوتے ہیں جن کو جھوٹ ' مکر ' اور فریب کا دیوتا کہنا بےجا نہ ہوگا - مذہب' سیاست ' معاشرت ' علم و فن ' غرض شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں ان بتوں کی پوجا نہ ہوتی ہو - ابسن انہیں حضرات کے مضبوط مورچوں پر حملہ کرکے انہیں مسمار کر دیتا ہے - برنک اپنے وطن میں سب سے ممتاز ' مقتدر ' باعزت اور دیانت دار شمار کیا جاتا ہے - مگر اس کی یہ نیک نامی ایک ناپاک فریب پر قائم ہے جس کا زہر اس کے خاندان کے رگ و پے میں پھیل چکا ہے - ''سوسائٹی کے ستون'' ان الفاظ سے ابسن کو اس قدر نفرت ہے کہ وہ پندرہ مرتبہ اس ترکیب کو اپنے ڈراما میں استعمال کرتا ہے مگر ہر جگہ حقارت اور تمسخر کے ساتھ - ابسن کا دل غصے اور نفرت سے لبریز معلوم ہوتا ہے ' لیکن وہ قدم قدم پر اپنے طوفان جذبات کی روک تھام کرتا ہے اور اپنے غصے کو طنز کی شکل میں منتقل کرکے سوسائٹی کے ستونوں کا مضحکہ اڑاتا ہے —

قصے کی ابتدا کے لئے ایک ساحلی قصبہ پسند کیا گیا ہے ' جہاں کی آبادی شدت سے قدامت پسند ہے ' لیکن زمانے کی ستم ظریفی سے یہاں بھی دستکاری کی بجاے مشین کا استعمال شروع ہوگیا ہے' ایک اخبار کی بھی ابتدا ہوگئی ہے ' سرمایہ داروں اور مزدوروں کی جنگ بھی چھڑ گئی ہے' جہازوں کی آمد و رفت کی بدولت بیرونی ممالک کے اثرات رفتہ رفتہ پھیلتے جاتے ہیں ' قصبے کے تمدنی اور معاشرتی حالات تبدیل ہو رہے ہیں - لوگ بالعموم جاہل اور تنگ نظر ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ اس قصبے کے باہر ہر متمدن شہر میں بدکاری ' بے راہ روی اور بد اخلاقی کا زور ہے - اگر دنیا میں اخلاق اور افعال درست ہیں تو صرف اسی خطے میں' وہ بھی اس وجہ سے کہ یہ قصبے بیرونی اثرات سے نسبتاً محفوظ ہے - قصبے کی عورتیں سمجھتی ہیں کہ ساری خدائی میں بس ہمیں پاک دامن ہیں' بیرونی ممالک کے حالات سنتی ہیں تو بہت خوش ہوتی ہیں کہ ہم اس بدی سے دور ہیں' قصبے میں اگر تھیٹر یا سرکس آجاتا ہے تو عورتیں ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں اور ان " بازاری عورتوں " سے پردہ کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں کہ کہیں ان کی مفروضہ بد اعمالی انھیں وبا کی طرح نہ لپٹ جاے - مسز برنک اور ان کا حلقہ جب سنتا ہے کہ سرکس کی ایک عورت سڑک پر منہ دھو رہی ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی - جب سرکس کی عورتیں ان کے پھاٹک کے آگے سے گذرتی ہیں تو پادری کا حکم نافذ ہوتا ہے کہ پھاٹک بند کرکے کھڑکیوں پر پردے ڈالدئے جائیں - آزاد خیالی ' تلاش حق ' روح کی آزادی ان کے اندر نام کو نہیں - اصل میں ان کا ماحول ایک آئینہ خانہ ہے جس میں سواے اس کے کہ اپنی صورتیں دیکھیں اور کسی کی شبیہ ان کو نظر نہیں آسکتی - ان کے مکانات خوب صورت ہیں لیکن ان میں روشندان نہیں کہ ہوا

اور روشنی کا گذر ہو - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازک نازک موم کی پتلیاں ہیں
جو سورج کی روشنی اور ہوا سے بڑی احتیاط کے ساتھہ محفوظ رکھی جاتی ہیں
کہ کہیں پگھل نہ جائیں —

لیکن ذرا سطحی میناکاری کو دور کر کے دیکھئے تو دھات کی اصلیت کا
پتہ چل جائے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ میناکاری ایسے بھدے طریقے
سے کی گئی ہے کہ دور ہی سے دھات کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے - یوں
تو یہ عورتیں بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ڈینا کی ماں کی
بداعمالی کا ذکر آجاتا ہے تو خوب مزے لے لے کر چپکے چپکے اس کی
داستان بیان کرتی ہیں ؛ مگر اس کا خیال رکھتی ہیں کہ اس گفتگو کی
بھنک مسز برنک کے کان میں نہ پڑجائے - یہ ہے اس اخلاقی بلندی کی حقیقت
جو انھیں باہر کی عورتوں سے پردہ کرنے کی تلقین کرتی ہے - یہی حال
مردوں کا ہے - ابسن اس بات پر بہت زور دینا چاہتا ہے کہ کسی ملک اور
کسی قوم میں مردوں کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی جب تک کہ عورتوں کا
اخلاق درست نہ ہو —

دوسری بات جو نہایت غور طلب ہے یہ ہے کہ اس سوسائٹی میں عورتوں
کی کوئی اہمیت نہیں - مسز برنک حسین ، دولت مند اور کارگذار ہے لیکن وہ
یا تو پادری سے مذہبی باتیں سنا کرتی ہے ، یا اپنی سہیلیوں سے خشک اور
سنجیدہ گفتگو کرتی ہے یا شوہر کی جھڑکیاں سہتی ہے - قدم قدم پر اس
کو یہ احساس مارے ڈالتا ہے کہ میں یوحان کی بہن ہوں جو برنک کی
بدولت بچ گیا ورنہ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا - بات بات میں وہ
اپنے شوہر کی قابلیت ، فیاضی ، اولوالعزمی اور سیاسی اقتدار سے دبی جاتی ہے -
وہ جب یہ سنتی ہے کہ لونا نے امریکہ میں روپے کمانے کے لئے گیت

گاے ، لکچر دئے اور کتابیں لکھیں تو اس کی روح لرزنے لگتی ہے اور اسی کے ساتھہ ایک خفیف سا غرور اس کے چہرے سے جھلکنے لگتا ہے۔ مگر ذرا غور تو کیجئے کہ آخر اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ برنک کے گھر کی منتظمہ ہے۔ اولف کی دایہ ہے یا پادری کی بے زبان مرید۔ اس کے علاوہ وہ ایک مٹی کی مورت ہے جسے انسان کا لباس پہنادیا گیا ہے۔ خود اس کے دماغ سے نکلی ہوئی کوئی بات ہمارے کان میں نہیں پڑتی۔ وہ سنتی خوب ہے ، سیتی بہت اچھا ہے ، پاکباز ہے ، سلیقہ شعار ہے ، لیکن نہ سوچتی ہے ، نہ کسی بات کا ارادہ کرتی ہے اور نہ کچھہ کر گذرتی ہے ، اس کی شخصیت برنک کے دباؤ سے فنا ہو چکی ہے ، اس کی روح کو پادری کے تحکم نے پامال کردیا ہے ، اس لئے اس سے آزاد خیالی کی توقع کرنا ایک فعل عبث ہے —

اب ذرا لونا ، مرتھا اور دینا پر ایک گہری نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ سوشل قیود نے انکے ساتھہ کیا سلوک کیا ، اور وہ کیوں بغاوت پر آمادہ ہیں۔ سب سے نمایاں کیرکٹر لونا کا ہے ، وہ یوحان کے ساتھہ امریکہ جاتی ہے اور جب وہ علیل ہوکر مفلس ہوجاتا ہے تو بے دریغ میدان عمل میں اتر آتی ہے۔ گاتی ہے ، بجاتی ہے ، تقریریں کرتی ہے ، مضامین لکھتی ہے اور یوحان کو مرض کے پنجے سے چھڑا لیتی ہے۔ ایثار ، قربانی اور عمل کی یہ شاندار مثال ہر پڑھنے والے سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔ وہ جب امریکہ سے آزادی کا پیام لے کر برنک کے مکان میں آتی ہے تو عورتوں کو بغاوت پر آمادہ پاتی ہے۔ سب سے پہلے تو دینا علم بغاوت بلند کرتی ہے اور رسمی اخلاق کی سخت گیری سے اکتا کر پادری کو ٹکا سا جواب دے دیتی ہے۔ وہ یوحان سے بار بار دریافت کرتی ہے کہ کہیں امریکہ میں تو یہ سخت گیری اور ظاہر پرستی کا

دور دورہ نہیں ہے۔ وہ جوان، حسین، اور ذہین ہے۔ آزادی کے لئے ایسی بے چین ہے۔ جس گھر میں رہتی ہے وہاں ہر شخص زاہد خشک اور رسمیات کا غلام ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اخلاق پر ماں کی بد اعمالی کا اثر پڑا ہوگا، اس لئے اس کی ہدایت پر غیر معمولی توجہ کی جاتی ہے۔ اس سے وہ اور تنگ آجاتی ہے۔ آخرکار وہ ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجاتی ہے اور یوحان کے ساتھ امریکہ چلی جاتی ہے۔ اس کا کیرکٹر دراصل بڑی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جب یوحان اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے طیار ہوتا ہے تو اس کی حمیت اور غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ میں تمہاری زیادہ ممنون احسان نہیں ہونا چاہتی بلکہ صرف اس کی آرزومند ہوں کہ تم مجھے امریکہ تک پہنچا دو، اس کے بعد میں خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ پہلے آزاد ہوجائے اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق شوہر تلاش کرے۔ یہ دراصل اس سختی کا رد عمل ہے جس میں اس کی زندگی گذری تھی۔ اسی موقع پر مرتھا کے کیرکٹر کی ایک جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ ڈراما کے واقعات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیتی، لیکن بغاوت کے جذبات اُس کے دل میں بھی اُسی زور شور سے موجزن ہیں، جیسے لونا اور ڈینا کے دلوں میں۔ خود اُسے ان جذبات کو عمل میں ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن ڈینا کی مدد وہ بڑے خلوص سے کرتی ہے ـــ

ابسن نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ عورتیں اس بغاوت سے کیا بات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کوئی بات دبی زبان سے نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے برملا کہتا ہے، ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے۔ ان عورتوں کا مدعا یہ ہے کہ ان فطری روحانی قوتوں کو پامال نہ کیا جائے، بلکہ اُنہیں

اس کا موقع ملے کہ وہ آزادی کے ساتھہ اپنی شخصیت کی نشو و نما کرسکیں اور اپنے رجحانات کو عمل میں لا سکیں۔ جب پادری کی تلقین شروع ہوتی ہے تو یہ رجحانات مذہب کی پیچیدگیوں میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا نشان تک نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ رسم و رواج کی قید' ظاہری اخلاقی اصولوں کی پابندیاں' روح کو طائر پر بستہ کی طرح جکڑ دیتی ہیں اور وہ تڑپ تڑپ کے رہ جاتی ہے۔ یہ ہے وہ زہریلی آب و ہوا جو پاک روحوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے' اور آخرکار لونا کی رہنمائی اور مرتھا کی ہمت افزائی سے دینا اس قفس کی تیلیوں کو توڑ کر چھوڑتی ہے —

اب ہمیں برنک کے کیرکٹر پر نظر ڈالتے ہوے ان اسباب کا پتہ لگانا چاہئے کہ جن کی وجہ سے اس کے اخلاق میں ایسی عظیم الشان اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی' وہ ایک بدمعاش کی حیثیت سے زندگی شروع کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ لونا سے محبت کرنا شروع کرتا ہے' پھر یوحان سے اس لئے دوستی کرتا ہے کہ اس کی بہن سے عشق بازی کرسکے۔ لونا ترکۂ پدری سے محروم ہو جاتی ہے اس لئے برنک کا عشق بھی کافور ہو جاتا ہے اور جب ڈوارف کی بیوی کے گناہ کا راز فاش ہوتا ہے تو وہ یوحان کو اس میں اینٹ دیتا ہے اور خود پاکباز بنا رہتا ہے۔ وہ غریب عورت مصیبت میں مبتلا ہوکر جلد خاک میں مل جاتی ہے اور اس کی بیٹی دینا برنک کی بہن مرتھا کے یہاں پناہ پاتی ہے۔ برنک رفتہ رفتہ اپنی بہن کی جائداد پر قابض ہونا شروع کرتا ہے اور یوحان کو بدنام کرکے پبلک میں اقتدار حاصل کرتا جاتا ہے۔ اپنے فائدے کی غرض سے وہ انڈین گرل جہاز کو جو بہت خراب حالت میں ہے طوفانی سمندر میں روانہ ہونے کا حکم دیتا ہے۔ تجارتی منافع کے

مقابلے میں وہ انسان کی جان کی کچھہ قیمت نہیں سمجھتا - وہ تین چیزوں کا طالب ہے - دولت ' اثر ' اقتدار اور ان کے حاصل کرنے کے لئے ہر جائز اور نا جائز عمل کرنے کو تیار ہے - مگر امریکہ سے لونا کا واپس آنا برنک کی سیرت میں ایک بڑی زبردست تبدیلی کا پیش خیمہ ہے - وہ اس بات کا بیڑا اٹھا کر آئی ہے کہ برنک کو اس مکر و فریب کی زندگی سے نجات دوں گی- جب برنک اس کے قصد کا حال سنتا ہے تو سراسیمہ ہوکر کہتا ہے کہ بھلا میں ایسے وقت میں کس طرح اپنے گناہوں کا اعتراف کرسکتا ہوں جب میری بدنامی سے ریلوے کی اسکیم کے بیٹھہ جانے کا اندیشہ ہے جس میں میری ساری دولت کھپ چکی ہے —

میرا یہ خیال ہے کہ ڈراما کے آخر میں برنک ایک کھلونے کی طرح تقدیر کے ہاتھہ میں ہے' واقعات کی رو اُسے کہیں سے کہیں لے جاتی ہے —

لونا کا امریکہ سے وطن کو محض اس لئے واپس آ نا کہ وہ اپنے محبوب کی اصلاح کرے زیادہ موثر نہیں معلوم ہوتا - ممکن ہے اس کا اثر برنک کے دل پر پڑا ہو لیکن وہ اس اثر کو ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن جب وہ یوحان سے مل کر یہ پتہ چلاتا ہے کہ وہ راز افشا کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور اس کے دل پر یہ خوف چھا جاتا ہے کہ اب میری شہرت اور عزت کا خاتمہ ہے- اندازہ کیجئے کہ اس خیال سے اس کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوئی ہوگی ' چنانچہ یوحان کا قصہ پاک کرنے کے لئے وہ اپنے شکستہ جہاز " انڈین گرل " کو روانہ ہونے کا حکم دیتا ہے' وہ جانتا ہے کہ یوحان اسی جہاز سے جائے گا اور یہ راستے میں ڈوب جائے گا - یہ حکم دینا قتل عام سے کم نہیں - اتنی جانوں کے خون کرنے کا خیال رفتہ رفتہ اس کے نظام عصبی میں ہیجان پیدا کرنے لگتا ہے - اب تک اس نے سب کچھہ

کیا ہے لیکن اس کا ھاتھہ خون سے آلودہ نہیں ہوا - اب جہاز کی تباھی سے سینکڑوں جانوں کا خون ھونے والا تھا - اس خیال سے وہ اتنا بدحواس ھو جاتا ھے کہ پادری سے روحانی تسکین کا طالب ھوتا ھے - اس سے آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ھیں کہ اس کے دل پر کیا گذر رھی ھوگی - ٹیگور نے اپنے افسانہ " ماشی " میں انسانی سیرت کا جو انقلاب دکھایا ھے وہ اس قدر جلد اور اچانک طریقے سے رونما ھوتا ھے کہ پڑھنے والے کا ذھن اس تبدیلی کے اسباب اور علامات تلاش کرتا ھے اور نہیں پاتا - اس کے بر خلاف ابسن ایک شیطان کو فرشتہ بناتا ھے لیکن اس انتقال میں متعدد منازل ھیں اور وہ سب مطابق فطرت اور قرین قیاس ھیں - اسی کو افسانہ نگاری کا کمال کہتے ھیں —

یکے بعد دیگرے برنک کو ایسے دماغی دھکے پہنچتے ھیں کہ اس کی آنکھیں کھلتی جاتی ھیں اور صداقت کی وہ شمع جو لونا اس کے دل میں روشن کرنا چاھتی تھی خود بخود جل اٹھتی ھے اور اپنے نور سے اس کی روح کی گہرائیوں کو منور کر دیتی ھے -

اس کی تفصیل حسب ذیل ھے :—

لونا اُسے یہ بتاتی ھے کہ یوحان دینا کو لے کر امریکہ گیا اور اب واپس نہ آئے گا اس لئے وہ سوچتا ھے کہ میں نے اس کا اور دوسرے خدا کے بندوں کا خون اپنے سر ناحق لیا - یہ ذھن میں رکھئے کہ جوانی میں یوحان برنک کا عزیز ترین دوست تھا —

لونا وہ خطوط پھاڑ ڈالتی ھے جن سے برنک کے گناہ ثابت ھوسکتے تھے ؛ ان سے وہ حد درجہ خائف تھا اور یہ اس کے خیال میں یوحان کے

پاس تھے - لونا اور یوحان کا یہ عفو و احسان اُسے بندۂ بے درم بنا لیتا ھے - پھر جب وہ اس ھلاکت کا خیال کرتا ھے جس میں اس نے یوحان کو ڈالا ھے تو کانپ اُٹھتا ھے - اس کے بعد ھی یہ خبر آتی ھے کہ اولف فرار ھو کر " انڈین گرل " میں روانہ ھوچکا ھے - اس خبر نے اس کو حد سے زیادہ سر اسیمہ کر دیا ھے - وہ کف افسوس ملتا ھے کہ میں نے جال تو یوحان کے لئے بچھایا مگر اولف اس میں پھنس گیا —

اسی اثنا میں جلوس پائیں باغ میں آموجود ھوتا ھے - برنک عجیب شش و پنج میں ھے ' اس کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ' دل ھے کہ خود بخود بیٹھا جاتا ھے ' سوچتا ھے کہ میرا سارا مکر و فریب دولت کمانے کے لئےتھا اور یہہ دولت اولف کے لئے تھی - اسی تردد اور پریشانی کی حالت میں خبر ملتی ھے کہ اولف مل گیا اور انڈین گرل روانہ نہ ھوسکا - اُس کی جان میں جان آتی ھے اور وہ سجدۂ شکر ادا کرتا ھے - ان پے درپے دماغی حملوں' ان موثر اور سبق آموز واقعات کا سلسلہ یقیناً ایک شیطان کو عبرت کا درس دے کر راہ راست پر لا سکتا ھے - یہاں ایک علم النفس کا لطیف نکتہ غور طلب ھے ' بڑے بڑے ھیبت ناک پہاڑ جب زلزلوں کی زد میں آ جاتے ھیں تو ان کی قوی بنیادیں ھل جل کر کمزور ھو جاتی ھیں اور ان میں سے خوبصورت پانی کے چشمے بہنے لگتے ھیں - یہی حالت انسانی عقائد اور خیالات کی ھے - جو خیالات سالہا سال سے پختہ ھو چکے ھوں ان کو زیر و زبر کرنے کے لئے دماغی اور دلی زلزلے کی ضرورت ھوگی ' اور یہہ زلزلہ جس قدر قوی ھوگا اسی قدر شدید انقلاب طبیعت میں واقع ھوگا - ابسن برنک کی ذات کو ایک ھی زلزلے میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ زلزلوں کا تار باندہ دیتا ھے کیونکہ وہ جانتا ھے کہ

برنک کا بدلنا کچھ آسان نہیں ہے - ابسن کا عمل کامیاب ہوتا ہے اور اس ہیبتناک پہاڑ کے گوشوں سے ایسے لطیف اور پاکیزہ چشمے بہنے لگتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے - برنک اپنے گناہوں کا بڑی خود داری سے اعتراف کرتا ہے ' لیکن وہ یہہ نہیں چاہتا کہ ندامت سے گوشہ نشیں ہوکر خاموشی اور عزلت میں زندگی گذار دے ؛ بلکہ عملی طور پر اپنے گناہوں کی تلا فی کرنا چاہتا ہے - وہ جانتا ہے کہ میرے وطن میں اچھے کاروباری افراد کا قحط ہے - وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود قابلیت ' انتظام اور دور اندیشی میں اپنے هم وطنوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے - اُس کو اس کا بھی علم ہے کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹا تو اس کا وطن سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا ' اس لئے وہ پبلک لائف سے دست بردار ہونے کے لئے طیار نہیں - ابسن کا نظر یہ اس معاملہ میں دلچسپ ہے ' وہ توبہ کے معاملے میں گذشتہ گناہوں کی فہرست دہرانے کا اس قدر قائل نہیں ہے جس قدر آئندہ کے لئے نیک ارادہ کرنے کا - اس کے نزدیک یہ کافی ہے کہ انسان صداقت کے حسن کا دلدادہ ہو جائے اور سچائی کے راستے پر پورے عزم کے ساتھہ گام زن ہونے لگے ' چاہے وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے یا نہ کرے ' وہ یہہ بھی کہتا ہے کہ جبراً گناہوں کا اعتراف کرانا کبھی کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ انسان کے خیالات ' اعتقادات اور نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا نہ ہو - یہاں ویگ لانڈ نے ابسن پر ایک نہایت دلچسپ نکتہ چینی کی ہے - فاضل نقاد کہتا ہے تعجب ہے کہ اعتراف گناہ کے وقت بھی برنک کے حواس اس حد تک قائم ہیں کہ وہ نئے حالات سے پورا فائدہ اُٹھانے کا بندوبست کر رہا ہے ؛ حالانکہ جس شخص کو پے درپے اتنے دماغی دھچکے پہنچ چکے ہوں اس کے اوسان ٹھکانے نہیں رہتے ' اس موقع پر ابسن

نے برنک کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں سے جذبات کی شدت کا عنصر بالکل نکال دیا ہے ، حالانکہ ایسے موقع پر جذبات کو نظر انداز کرکے تصویر کو محض دماغی اثرات کا مرقع بنانا جائز نہیں - تصویر دلکش ضرور ہے لیکن یہ دلکشی علم النفس کے اصول کو پامال کرکے حاصل کی گئی ہے —

ادب

تاریخ

مذہب و اخلاق

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

———(*)———

ادب

مشاهیر اُردو کے خطوط

(مرتبہ مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ عربی ، فارسی ، اردو ، ہندو یونیورسٹی بنارس - مشتہر رائے صاحب رام دیال الہ اباد - قیمت آٹھ آنے) —

ادب میں خطوں کی اہمیت اور دلکشی مسلم ہے - بعض اہل قلم کے خط ادب کا زیور اور زبان کی جان ہیں - اس سے پہلے جب فارسی کا رواج تھا تو مکاتیب درس میں داخل تھے اور مختلف " انشائیں " اسی غرض سے لکھی گئیں تھیں اور نصاب میں شریک تھیں - لیکن یہ مکاتیب عموماً مصنوعی ہوتے تھے جن میں اس زمانے کے دستور کے مطابق زیادہ تر لفاظی اور انشا پردازی سے کام لیا جاتا تھا - اس تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ ہر موقع کے لحاظ سے خط کیونکر لکھنا چاہئیے - مثلاً : شادی ، غمی ، تعزیت ، مبارک باد ی، شکریہ، عیادت وغیرہ وغیرہ - اس کے خاص خاص قواعد تھے کہ ابتداء کیونکر کی جاے ، خاتمہ کس طرح ہو - مدارج کے لحاظ سے القاب و آداب بھی مقرر تھے - نتیجہ اس تعلیم کا یہ تھا کہ عام طور پر سب خط ایک ہی قسم کے ہوتے تھے

اور جدت کم ہوتی تھی - نظر انشاپردازی پر رہتی تھی - دلی خیالات اور جذبات کا بے تکلف اظہار کم ہوتا تھا - سب سے پہلے مرزا غالب نے جن کی جدت ہر رنگ میں نظر آتی ہے ' ان خشک اور مصنوعی اصول و قواعد کو توڑا اور خط نویسی میں ایک نئی شان پیدا کی - ان کے خط اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کا لطف کبھی کم نہ ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ اچھا خط زبان میں سب سے اچھی چیز ہے —

اس مجموعے میں مہیش پرشاد صاحب نے زمانۂ حال کے نامور اہل قلم مثلاً سر سید ' آزاد ' حالی ' نذیراحمد ' اکبر ' محسن‌الملک ' شبلی ' چکبست وغیرہ کے خط جمع کئے ہیں - ہر شخص کے خط ایک سے نہیں ہوتے - اس لئے اس قسم کے مجموعے کے لئے سلیقے اور نظر کی ضرورت ہوتی ہے - قابل مرتب نے اس کا بھی خیال رکھا ہے اور ایسے خط انتخاب کئے ہیں جو فی الحقیقت پڑھنے کے قابل ہیں - ان میں بعض غیر مطبوعہ خط بھی ہیں - "مولوی" مہیش پرشادصاحب کا ارادہ اس سلسلے کو جاری رکھنے کا ہے اور دوسرا حصہ بھی وہ شایع کرنے والے ہیں —

ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری

(تالیف میرحسن صاحب - طالب علم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے 'مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن) -

---

دوسری زبانوں کی ادبیات اور اس کے ممتاز مصنفین اور شعرا کا کلام اور حالات ہمیشہ بصیرت افروز ہوتے ہیں - خاص کر اردو زبان کو جو ابھی بن رہی ہے اس کی بڑی ضرورت ہے - میرحسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے کہ ورڈس ورتھ کے حالات اور اس کی

شاعری کی خصوصیات کو اردو زبان میں بیان کیا - ورڈس ورتھ کا پایہ انگریزی شاعری میں بحیثیت فطرت نگاری بہت بلند ہے اور اس کا منتخب کلام بے مثل ہے - قابل مولف نے جگہ جگہ اس کی منتخب اور عمدہ نظموں کے ترجمے بھی درج کیے ہیں - نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے - لائق مولف اور قابل مقدمہ نویس دونوں نے اس امر کو وثوق سے بیان کیا ہے کہ مولانا حالی نے " ورڈس ورتھ کی شاعری اور اس کے شاعرانہ نصب‌العین اور اصلاحی شاعری کی تجویز سے کسی نہ کسی طرح واقفیت حاصل کر لی تھی " - اس قیاس کی بنیاد انھوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں پر قائم کی ہے - داخلی شہادت ان کی نظم "شعر سے خطاب" اور مقدمۂ شعر و شاعری کے بعض فقرات ہیں اور خارجی شہادت لاهور بک ڈپو کا تعلق - لیکن یہ دونوں شہادتیں کافی نہیں - حالی کے شعر سے خطاب اور ورڈس ورتھ کے "شاعر سے خطاب" میں کوئی ایسا خاص تعلق نہیں جو یہ قیاس قائم کیا جاے - دونوں کے خیال کا رنگ جدا ہے - شعر و شاعری پر قدیم سے ہمارے شعرا اپنے خیالات ظاهر کرتے آئے ہیں یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی - خصوصاً حالی کے دل میں اس خیال کا آنا، جبکہ ہمارے ہاں شاعری کا رنگ بگڑا ہوا تھا - ایک قدرتی بات تھی، اس کے لئے ورڈس ورتھ کی واقفیت ضروری نہ تھی - رہا بک ڈپو کا تعلق سو وہ بھی اس قیاس کی تائید نہیں کرتا - اس زمانہ میں انگریزی کی بالکل ابتدائی کتابوں اور خاص کر مدرسوں کی درسی کتابوں کے اسباق کا ترجمہ ہوتا تھا - شعر و شاعری یا ادبی تنقید پر کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی - علاوہ اس کے اس زمانے میں جب کہ حالی نے جدید شاعری شروع کی ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ورڈس ورتھ سے بہت کم واقفیت تھی - پنجاب یونیورسیٹی کے نصاب میں اس کا کہیں پتا نہیں اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی تعلیم کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ نئے لکھنے والوں پر ہوا اور مولانا حالی بھی ان خیالات کے اثر سے خالی نہ تھے —

بہر حال میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لایق قدر ہے اور اردو شعرا کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے —

حقیقی علمی شاعری

(مصنفہ مولوی نصیرالدین ' نصیر ' پیر سترایت لا مطبوعہ
معارف پریس اعظم گڈھ)۔

اس مثنوی میں قابل مصنف نے شروع میں عام شاعری اور اُس کی خوبی پر اور اس کے بعد عبرانی ' سنسکرت ' یونانی ' لاطینی ' عربی ' اور فارسی ' اور هندی بھاشا کی شاعری پر مختصر بحث کی هے ' پھر شاعری کے اقسام بیان کئے هیں اور فنون لطیفہ کا ذکر کیا هے - اس کے بعد اردو شاعری کی مختصر تاریخ بیان کی هے اور آب حیات کے تتبع میں پانچوں دور کے نامور شعرا کی خصوصیات پر راے کا اظہار کیا هے - سب سے آخر میں انگریزی شعرا کا مختصر ذکر کیا هے - اس کے بعد شاعری پر ملک اور آب و هوا کا اثر اور مشرق و مغرب کی نظم کا مقابلہ و موازنہ هے —

حضرت نصیر پختہ شاعر هیں - ان کی نظم بے تکلف اور سادہ هے - اپنے خیالات شعر و شاعری اور شعرا کے کلام کے متعلق خوبی سے ظاهر کئے هیں ان خیالات اور تنقید میں کوئی خاص بات نہیں —

شروع میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی اور سید محمد اسمعیل صاحب رسا همدانی ایم - اے ' بی - ایل کے دیباچے هیں —

دیوان گرامی

شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کا کلام ' شاعر خاص اعلیٰ حضرت حضور نظام - مطبوعہ شیخ مبارک علی تاجر کتب ' لاهور - قیمت دو روپے آٹھ آنے

گرامی سچا شاعر تھا ' ہمارے ہاں شاعر کے لئے جو جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے - بے نیاز و بے پروا ' دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر ' لا ابالی - اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا - پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا - اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا - گھر کا حال گھر والی جانے اور باہر کا حال باہر والے جانیں وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا - شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا ہے اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا - ذوق سخن ایسا اچھا تھا کہ اچھا شعر سن کر وجد میں آ جاتا تھا - صورت شکل ' وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایسا اچھا شاعر اور ایسا صاحب ذوق ہوگا - اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا - تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے لڑتا ہے اور یہہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی - دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدر داں تھا —

ضد ضرور تھی لیکن وہی بچوں کی سی ' منانے پر فوراً من جاتا تھا اور دوستوں کا کہنا مان لیتا تھا ' لیکن سچ بات کہنے میں وہ بڑے بڑوں سے بھی نہیں چوکتا تھا - تصنع سے دور ' نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھا - وہ بہت بھولا تھا مگر بکار شعر ہوشیار اور بکار دنیا بیکار تھا - اگرچہ مدتوں دوابۂ گنگ و جمن اور حیدرآباد میں رہا مگر لب و لہجہ ٹھیٹ پنجابی تھا جو بعض وقت بڑا مزہ دیتا تھا - غیر لوگ آ آکر اصرار سے اس کا کلام سنتے تھے مگر دوستوں کو وہ خود سناتا ' وہ بھی محظوظ ہوتے اور خود بھی محظوظ ہوتا - اگرچہ ہندی نژاد تھا مگر فارسی کا اُستاد تھا - اتنا کچھ لکھا مگر کہیں محاورۂ فارسی میں لغزش نہیں ہوئی - اس کا کلام اُستادانہ تھا اور قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا - اس کے کلام میں جوش ' گرمی اور شوکت پائی جاتی ہے اس نے بڑے بڑے معرکے جیتے اور بڑے بڑے استادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور کہیں ہیٹا نہیں رہا - اس کی وفات سے ایک بڑے استاد کی جگہ خالی ہوگئی اور اب چونکہ فارسی کا رواج اٹھتا جاتا ہے اس لئے امید نہیں کہ پھر کوئی گرامی پیدا ہو —

شیخ مبارک علی نے مبارک کام کیا کہ مرحوم گرامی کا کلام چھپوادیا ' اگرچہ افسوس ہے کہ یہ اُس کا پورا کلام نہیں اس نے اس سے کہیں زیادہ لکھا تھا ' لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ رباعیات الگ شایع ہو رہی ہیں - دیوان نہایت عمدہ کاغذ پر بہت اچھا چھپا ہے - فارسی کلام کے دلدادہ اسے ضرور پڑھیں وہ پڑھ کر یقیناً خوش ہوں گے —

غالب

چند سال ہوے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ' حیدرآباد نے یہ کتاب انگریزی میں شائع کی تھی اب اس کا سید معین‌الدین صاحب قریشی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور ایک خوش وضع سرورق کے ساتھ صاف ستھرا چھپوادیا ہے -

معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کی آب و ہوا غالب مرحوم کو ساز گار نہیں ہے - ان کے دیوان کی وہ مشہور شرح جس میں خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی تھی ' حیدرآباد ہی کی پیداوار تھی - حال میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کے " محاسن کلام غالب " نے دوبارہ غالب کی تحسین کا غلغلہ برپا کیا ' تو گویا اس رسالے کے توڑ پر ' ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے زیر نظر کتاب ڈاہبند کی - جس میں کلام غالب کے ساتھ ساتھ غریب شاعر کی سیرت و کردار اور عقائد و عادات پر بھی اس شد و مد سے جرح کی گئی ہے کہ دنیا کا کوئی شاعر مشکل سے اس کی تاب لاسکتا ہے — غالب کی شاعری پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے بہت سی دشوار شرطیں تجویز کی ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے :-

> " سب سے پہلے ان اثرات کی چھان بین کرنی چاہئے جو اس (غالب) کے گھر کی تعلیم و تربیت سے مترتب ہوے - اگر اس

کے والد اور اکلوتے چچا کا انتقال پانچ برس کی عمر سے پہلے ہی ہوچکا تھا ' جیسا کہ خود غالب کہتا ہے ' تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس کی پرورش کی ؟ وہ کس قسم کے لوگ تھے اور کس تہذیب سے انھوں نے اس کے دل و دماغ پر نقش بٹھائے ؟ تعلیم کس قسم کی دی گئی اور اس کے تعلیم دینے والے کون تھے ؟ عبدالصمد اور شیخ معظم اس کے استاد بیان کئے جاتے ہیں - ان کی بزم تعلیم سے اس کو کیا فیض حاصل ہوا - اس کے اور بھی کوئی استاد تھے جن کے فیض و اثر کا پتہ چلایا جاسکتا ہے ؟ کون سے مضامین اور کتابیں اس کو سب سے زیادہ مرغوب تھیں ؟ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے اس کی غزل گوئی پر نظیری ' عرفی ' ظہوری ' شیخ علی حزیں ' اور طالب آملی کے بھی اثرات پڑے ہیں - ان کا اثر ممکن ہے کہ اس کی تنظیم شعر پر ہوا ہو لیکن سوال یہ ہے کے اس کے خیالات پر اس کے اثرات کس طرح مترتب ہوے ؟ " (صفحہ ۶۳)

اس تفصیلی معلومات کے نہ ہونے کے باوجود جو لوگ غالب کی تحسین میں رطب‌اللسان ہیں ' ان سے ڈاکٹر عبداللطیف ناراض ہیں مگر خود غالب کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں تامل نہیں کرتے اور طول طویل بحثوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ " اس نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سایے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے - اس کا شمار مشاہیرعالم میں نہیں ہوسکتا " — (صفحۂ ۱۳۱) -

اس " ہم آہنگی " کے مضمون پر ڈاکٹرصاحب نے بار بار زور دیا ہے اُن کے نزدیک " پرعظمت شاعری " کا معیار ہی یہ ہے کہ شاعر زندگی میں ہم آہنگی کو پالے - اور چونکہ غالب کو یہ ہم آہنگی کبھی حاصل نہیں ہوئی ' لہذا وہ اعلی درجہ کا شاعر نہیں شمار ہوسکتا اگرچہ اردو غزل کو شعرا میں ایک " لفظی صنعت گر " کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب اسے ایک بلند مرتبہ دینے پر آمادہ ہیں ' -

تقریباً پوری کتاب میں " ہوا سے لڑنے " کی کیفیت نظر آتی ہے اور

ادبی بحث میں خاصا عدالتی مناظرے کا رنگ پیدا ہوگیا ہے - افسوس ہے کہ غالب کے مقدمے میں خود ہمارا فیصلہ فاضل مصنف کے خلاف ہے لیکن ہم ان کی عرق ریزی اور قابلیت کی خوشی سے داد دیتے ہیں - انھوں نے نفس شاعری کے بعض پہلوؤں پر نہایت پر مغز بحث کی ہے جو ایشیائی شاعری کے معتقدوں کو غور سے مطالعہ کرنی چاہئیے اور ان کی کتاب ادبی تنقید کا ایک دلچسپ اور قابل قدر نمونہ ہے -

(حجم ۱۴۰ صفحے - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

رباعیات حالی (ترجمہ انگریزی)

مولانا حالی مرحوم کی اردو رباعیات کا انگریزی ترجمہ کچھ مدت ہوئی جی - ای وارڈ نے شائع کیا تھا - اب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے زیر نگرانی اس کی نظرثانی ہوئی اور پھر ٹیوٹ صاحب نے (جو عمر خیام کی رباعیات کا بھی ایک ترجمہ شائع کر چکے ہیں) وارڈ کے نثریہ ترجمے کو نظم کردیا اور اردو متن کے ساتھ یہ دونوں ترجمے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نے بہت صاف ستھرے چھاپے میں شائع کردئیے ہیں - نظم میں کہیں کہیں ترجمہ اصل مطلب سے دور ہوگیا ہے لیکن مجموعی طور پر کتاب قابل قدر ہے اور مطبع مذکور کی شاخوں سے جو کلکتہ ، مدراس ، بمبئی میں قائم ہیں ، جلد کی نوعیت کے اعتبار سے دو ، تین یا چھ روپے میں خریدی جا سکتی ہے -

---

تاریخ

رہنمایان ہند

مترجمہ بابونارائن پرشاد ورما المتخلص بہ مہر ' درمیانی تقطیع صفحات ۲۱۵ قیمت فی جلد تیرہ روپیہ ' ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۔

عرصہ ہوا کہ جناب بابوصاحب منمتھ ناتھ دت ' ایم ۔ اے ' ایم ' آر' اے ' ایس وکٹر کیشب اکیڈیمی کلکتہ نے انگریزی میں ایک رسالہ " پرافٹس آف انڈیا " لکھا تھا - اس کی مقبولیت اور افادے پر نظر کر کے انجمن ترقی اردو نے جناب مہر کا ترجمہ رہنمایان ہند کے نام سے شائع کیا تھا - یہ ترجمہ اس سے قبل تین بار چھپ کر شائع ہوچکا ہے - چوتھی بار اب پھر انجمن نے اس کو خاص اہتمام سے طبع کر کے شائع کیا ہے —

اس کتاب میں ہندو مذہب کے عقاید اور تعلیمات کا تذکرہ ہے ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنما سری کشن ' گوتم بدھ شنکر اچاراج ' رامانج ' رامانند اور کبیر کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ہے ' خصوصاً سری کشن مہاراج کے حالات اور ان کی تعلیمات (بھگوت گیتا) کا کسی قدر تفصیلی خلاصہ درج ہے - بہت ہی کم وقت میں اور نہایت واضح طور سے ہندو مذہب کے برگزیدہ عقاید کا علم اس کتاب سے ہوسکتا ہے ' اس کے سوا ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماوں کی تعلیمات اور ان کی عملی جانفشانیوں اور سرگرمیوں سے بخوبی واقفیت ہوسکتی ہے - گو یہ کتاب ترجمہ ہے لیکن طرز بیان اس قدر فطری اور دلکش ہے اور زبان اس قدر

پاک صاف ہے کہ کہیں ترجمہ کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا —

(چ)

امرائے ہنود

[مولفہ منشی سعید احمد صاحب مارہروی درمیانی تقطیع صفحات ۵۹۱ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے غیر مجلد تین روپے ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد]

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں ہندوؤں کو خاص دخل تھا - مالی، ملکی اور انتظامی شعبوں میں ہندو، مسلمانوں کے دوش بدوش تھے، چنانچہ مختلف تاریخوں میں ان مشہور ہندو امراء کے حالات بالتفصیل درج ہیں جو اسلامی حکومتوں میں ممتاز عہدوں پر مامور تھے - اس کا ثبوت کتاب زیر تبصرہ سے بھی بخوبی ملتا ہے جس میں لایق مولف نے تاریخ و تذکرہ کی مختلف (۴۱) کتابوں سے ان ہندو امرا کے حالات یکجا جمع کئے ہیں جو ہندوستان کی عظیم الشان اسلامی حکومت (مغلیہ) میں اعلیٰ خدمات اور مناصب پر سر فراز تھے —

یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ اس وقت کی یاد دلاتی ہے جب ہندو مسلمانوں کے تعلقات خوش گوار تھے اور شرمناک مذہبی تفریق اور تعصب کو دخل نہ تھا - اس کے ہر صفحے پر مسلمان حکمرانوں کی رواداری، بے تعصبی اور حق شناسی کی نمایاں مہریں ثبت ہیں اور اس میں جا بجا ہندو امرا کی وفاداری جاں نثاری اور فرض شناسی کی مثالیں موجود ہیں —

یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی ابتدائی مطبوعات میں ہے - عرصہ ہوا اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا تھا - انجمن نے خاص اہتمام سے اس کا دوسرا اڈیشن طبع کر کے شائع کیا ہے —

(چ)

انقلاب سنہ ۱۸۵۷ ع کی تصویر کا دوسرا رخ

(مترجمہ شیخ حسام الدین صاحب بی اے۔ بڑی تقطیع' صفحات ۹۱ قیمت درج نہیں مترجم کے پتے ' ذو الفقار گنج لدھیانہ پنجاب سے مل سکتی ہے)

انگریزی حکومتوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں جو نفرت اور حقارت پیدا ہوگئی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ آزادی اور حریت کا جو جوش اور ولولہ اہل ہند میں پیدا ہوگیا ہے وہ ایسا نہیں کہ آسانی سے سرد ہو سکے ' انگریز مفکرین اس کو محسوس کرتے ہیں چنانچہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ایک رسالہ (The Other Side of The medal) کے نام سے لکھا ' جس میں اس نے بڑی حد تک ان اسباب وعلل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ مصنف نے ہندوستانیوں کے ان افعال اور حرکات کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بنا پر انگریزوں کو شرمناک اور ناقابل بیان ظلم و تعدی اور خون ریزی و غارت گری سے کام لینا پڑا۔ مصنف نے مختلف واقعات اور حادثات کو لے کر اس عمدگی سے کتاب کو مرتب کیا ہے کہ اس کی سخن گستری کی داد دینی پڑتی ہے ' اس نے بہت کم طرف داری کو ظاہر ہونے دیا اور آخر میں صاف لکھ دیا کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے مظالم کا کفارہ نہ دے حالات نازک سے نازک تر ہوتے جائیں گے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات تیز تر ہوتے جائیں گے۔ کفارہ سے مراد فاضل مصنف کی یہ ہے کہ انگریزی حکومت اپنے قبضہ و اقتدار کی بندش ڈھیلی کردے اور ہندوستان کو زیادہ دنوں آزادی سے محروم نہ رکھے۔ ان کا خیال ہے انگریزی حکومت اور ہندوستانی مجاہدین دونوں بڑی حد تک تھک چکے ہیں اور دونوں کے دلوں میں سمجھوتے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کتاب کے تین حصے ہیں پہلا غدر ' دوسرا ' غدر کے اثرات ' تیسرا خاتمہ یا نتیجہ۔ ترجمے میں بعض غیر اہم حصے حذف کردئے گئے ہیں۔ ترجمہ پاک صاف ہے۔ مصنف کے خیالات کی ترجمانی عمدگی سے ہوئی ہے ' کہیں کہیں زبان اور قواعد کی غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً —

"اگر ہم نے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں رکھنا ہے" صفحہ ۱۰۱
" دیسی باشندوں کے درمیان رہائش بنائیں" صفحہ ۱۰۰

شروع میں مولوی عبدالرحیم خان پوپلزئی (پشاور) کا مقدمہ ہے جس میں کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب کا نہایت مختصر خاکہ بھی درج کیا گیا ہے —

(چ)

مذہب و اخلاق

ملفوظ کبیر

مترجمہ مولانا مفتی محمد ابراهیم بدایونی - دو حصے ' صفحات حصہ اول ۱۴۸ حصہ دوم ۱۹۷ بڑی تقطیع قیمت فی حصہ ایک روپیہ - ملنے کا پتہ - مولوی سید قادر بادشاہ صاحب مشائخ - پٹن ضلع اورنگ‌آباد (دکن)

حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی (رح) مسلمانوں کے اکابرقوم اور ابطال روزگار سے ہیں - دنیا کی تقریباً ہر اسلامی آبادی میں ان کے عقید تمند ہیں - ان کے مواعظ کا مجموعہ ملفوظ کبیر کے نام سے مشہور ہے- ایک مدت ہوئی کہ اس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ شایع ہوا تھا لیکن اب نہ تو ترجمہ ملتا ہے اور نہ اصل کتاب کے نسخے آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں- مولوی سید قادر بادشاہ صاحب قادری مشائخ کے خاندان میں اس کا ایک نہایت قدیم اور صحیح نسخہ تھا - انہوں نے اس کا اردو ترجمہ مولوی مفتی ابراهیم صاحب بدایونی سے کرایا اور خود اپنے خرچ سے طبع کرکے شایع کیا ہے - دو حصے چھپ چکے ہیں دو زیر طبع ہیں - پہلے دو حصوں میں ۴۲ خطبے ہیں اردو ترجمہ کے مقابل عربی متن بھی ہے - ترجمہ اچھا ہے جو لوگ حضرت غوث اعظم کے پاکیزہ نصائح اور مواعظ سے مستفید ہونا چاھتے ہیں وہ ضرور اس کا مطالعہ کریں —

(چ)

متفرق

میں نے ایک کرور روپیہ کیسے کمایا

اصل انگریزی کتاب کے مصنف مسٹر مان ٹیگ وہ ذات شریف ہیں ، جنھوں نے دھوکے سے مہاراجہ کشمیر کو دھڑی دھڑی کرکے لوٹا تھا - مہاراجہ بہادر پیرس کے ایک ہوٹل میں مسزرابنسن کے ساتھ عیش و نشاط میں مشغول تھے کہ مان ٹیگ صاحب اس مکار عورت کے شوہر کے روپ میں اس خلوت خانۂ عیش میں داخل ہوے - مہاراجہ صاحب کے اوسان خطا ہوگئے اور انھوں نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی غرض سے ریاست کشمیر کی پورے ایک سال کی آمدنی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ (یعنی ۲۲ لاکھ روپیہ) مسز رابنسن کے جعلی شوہر کے حوالے کر دیا ! چند سال کے بعد یہ سارا قصہ عدالتی تحقیقات کے دوران میں طشت از بام ہوا - اس وقت مسٹر مان ٹیگ کے جوہر کھلے اور اہل ہند کو بھی ان سے روشناسی کا شرف حاصل ہوا - لیکن حقیقت میں یہ شور انگیز واقعہ ان کی عجیب و غریب سوانح عمری کی محض ایک فصل ہے - ورنہ اس مصروف زندگی میں معلوم نہیں کتنے روز و شب ایسے گزرے جن میں وہ ضرورت سے زیادہ روپے والوں کو طرح طرح سے مفلس بنانے کی مفید خدمت انجام دیتے رہے - فریب دہی اور جعلسازی کے فن لطیف میں انھیں ایک مجتہد کا مرتبہ حاصل ہے اور اسی غیر معمولی ذہانت کی بدولت بے حساب دولت کما چکے ہیں - آخر میں اس " بے قاعدہ " اور خطرناک ترک تاز کو چھوڑ کر غالباً کسی دوسرے نام سے انھوں نے فریب کاری کا باقاعدہ پیشہ اختیار کرلیا - یعنی کسی حکومت کے محکمۂ سیاسیات میں ملازم ہوگئے اور اس حفظ ماتقدم کے بعد اپنے گذشتہ کارناموں کو کتاب کی صورت میں شائع کردیا —

یہ دلچسپ اور سچی آپ بیتی ، جس قدر حیرت انگیز ہے اسی قدر سبق آموز ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یورپ علم و فن کے

دوسرے شعبوں میں اہل ایشیا سے فائق ہے ' اسی طرح اس کی عقل و ذہانت ' جرم و گنہ گاری اور فریب و شیطنت میں بھی ایشیا سے کئی میدان آگے نکل گئی ہے - کتاب میں انسانی زندگی اور اخلاق کے تیں بدترین دشمن ' یعنی زنا کاری ' قمار و نشہ بازی ' نئے نئے پیرایوں میں لوگوں کو تباہ کرتے نظر آتے ہیں - اسی کے ساتھہ یہ تصریح بلکہ تنبیہ کردینی ضروری ہے کہ یہ مغربی تہذیب کا صرف تاریک رخ ہے - نیز یہ کہ ہندوستان کے قدامت پسند حضرات جو ان واقعات کو اہل یورپ کی بے دینی اور بداخلاقی کے ثبوت میں مزے لے لے کر بیان فرماتے ہیں ' وہ اپنے حالات اور تاریخ پر بھی نظر ڈال ایسا کریں تو غالباً زیادہ مفید و صحیح راے قائم کرسکیں گے ' —

انگریزی سے اس کتاب کو سید محمدعمرصاحب (حسنی) نے اردو میں ترجمہ کیا ہے - بعض حصے ایسے ہیں کہ جو لوگ یورپ کے تمدن اور طرز معاشرت نیز بیان کے طریقوں سے واقف نہیں ' وہ اچھی طرح مطلب نہ سمجھہ سکیں گے - لیکن جو باتیں صاف اور صریحی ہیں وہی کچھہ کم دلچسپ نہیں ہیں - اردو ترجمہ شیخ ضیاءالحق‌صاحب (سابق مدیر روزنامۂ پیشوا) نے بہت اچھا چھپوا دیا ہے اور شیخ‌صاحب موصوف سے ہاپوڑ (یوپی) کے پتے پر دو روپے میں مل سکتا ہے ' — (۲)

مشاہدات سائنس مولفہ سیدمحمدعمرحسنی‌صاحب -

(قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد)

سید محمد عمرصاحب نے علي گڑہ میں تعلیم پانے کے بعد جرمنی اور جاپان تک دھاوا کیا اور وہاں اینجینیرنگ اور دوسرے علوم کی علمی اور عملی تعلیم حاصل کي - غیر ممالک سے واپس آنے کے بعد وہ نچلے نہیں بیٹھے اور کچھہ نہ کچھہ برابر کام کرتے رہے - انھیں مطالعہ اور لکھنے کا ابتدا سے شوق ہے اور اپنے مفہوم کو اردو زبان میں ادا کرنے کا اچھا

سلیقہ رکھتے ہیں —

مشاہدات سائنس جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سیدصاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق سائنس سے ہے - یہ مضامین جن میں تحت الثری کی سیرسے لے کر توپ کے گولے تک اور بچوں کی نشو و نما سے نظام شمسی تک کی جولانیاں نظر آتی ہیں بہت دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں، اگرچہ بعض مضامین کا عام زبان میں بیان کرنا مشکل تھا لیکن قابل مولف نے بڑی خوبی سے اس کام کو سر انجام دیا ہے - آخر میں انگریزی اصطلاحات کے مترادف اردو زبان میں درج کر دئے ہیں - یہ بہت اچھا کیا ہے - کتاب اچھی چھپی ہے اور موزوں تقطیع پر ہے —

اردو کے جدید رسالے

پاسباں

(اڈیٹر لطیف انور صاحب گورداسپوری - گورداسپور - چندہ سالانہ ساڑھے تین روپے)

اسی سال ماہ اگست میں گورداسپور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے پنجاب میں شاید ہی کوئی ایسا ضلع باقی رہ گیا ہو جہاں سے دو ایک اردو رسالے نہ نکلتے ہوں - اس شوق کی داد دینی پڑتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل پنجاب کو اردو سے کس قدر محبت ہے - رسالہ زیادہ تر ادبی ہے اور نظم و نثر دونوں سے تفریح کا سامان مہیا کیا گیا ہے - عام اردو رسالوں کے مقابلے میں کوئی خاص امتیازی بات نہیں ہے —

آئینہ

(اڈیٹر محمد اسحاق صاحب ۔ کلکتہ نمبر ۱۱ ھرن باڑی لین سالانہ چندہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ مصور ہے اور ماہ اکتوبر سے کلکتہ سے شایع ہوا ہے ۔ اگر چہ عنوان پر علمی ' ادبی ' تاریخی ماہوار رسالہ لکھا ہے لیکن پہلے نمبر میں صرف چند ادبی مضامین ' فسانے اور نظمیں ہیں ۔ لیکن رسالہ سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور دلچسپ ہے ۔ کلکتہ سے ایک ایسے رسالے کا نکلنا مغتنمات میں سے ہے اور اس قلیل چندے پر قابل قدر ہے —

یاد گار

(اڈیٹر نہر صاحب بی ۔ اے ۔ لاھور ۔ سالانہ چندہ تین روپے)

یہ خالص ادبی رسالہ ہے اور مصور ہے ۔ ادب سے ہمارے رسالوں میں عام طور پر جو مراد لی جاتی ہے یعنے نظم اور نثر کے ایسے مضامین جو دلچسپ ہوں اور جن کا مطالعہ دماغ پر بار نہ ہو اور تھوڑی دیر کے لئے دل کا بہلاوا ہو جاے ' وہ اس رسالے میں سب موجود ہیں ۔ لکھائی ' چھپائی سب کے اعتبار سے خوشنما ہے —

فانوس

(اڈیٹر سردار علی احسن و نذیر احمد ام ۔ ایس ۔ سی ۔ لاھور ۔ سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے)

اس میں غزلوں ' نظموں اور فسانوں کے ساتھ علمی مضامین بھی ہیں عمر خیام کی ایک رباعی کو تصویر میں دکھایا گیا ہے ۔ مضامین کے اعتبار سے رسالہ بہت اچھا اور دلچسپ ہے اور کم خرچ بالانشین ہے ۔ بالکل حال ہی میں یعنے ماہ نومبر سے شایع ہونا شروع ہوا ہے —

دو جرمن رسالے

(۱)   DIE WELT DES ISLAMS (دنیاے اسلام)

جرمنی کے دارالسلطنت برلن میں ایک انجمن عرصہ سے قائم ہے جس کا نام ہے " الجمعیتہ الالمانیہ ' للمعارف الاسلامیہ " انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے متعلق ہر قسم کے تمدنی ' مذہبی ' تجارتی اور ادبی مسائل پر علمی تحقیق کو ترقی دے - اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی صورت یہ کی گئی ہے کہ علوم مشرقی کے ایک کتب خانہ کے قیام کے علاوہ اراکین انجمن کے سامنے تقریریں کرائی جاتی ہیں اور ایک سہ ماہی رسالہ " دنیائے اسلام " کے نام سے شائع کیا جاتا ہے —

جنوری سنہ ۳۲ ع کا " دنیائے اسلام " ہمیں تبصرہ کے لئے وصول ہوا ہے - اس کے اڈیٹر پروفیسر کامپف مایر ہیں جن کا شمار جرمن مستشرقوں کی پہلی صف میں ہوتا ہے - ان کی ادارت رسالہ کے اعلیٰ معیار کی کافی ضمانت ہے اور یہ بغیر کسی شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ جرمن زبان میں Der Islam کے بعد یہ اپنی قسم کا بہترین رسالہ ہے - اس میں مضامین زیادہ تر ادب سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسرے جرمن سہ ماہی رسالوں کی طرح اپنی زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جاتا ہے —

اس نمبر میں تبصروں کے علاوہ تین مضامین ہیں - شروع میں مصر کے نوجوان اور ہونہار ادیب محمود تیمور کے حالات زندگی ہیں اور اس کے بعد محمود تیمور نے اپنے افسانوں کے مجموعہ پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس کا جرمن ترجمہ ہے - اس مقدمہ میں عربی افسانہ نویسی کی تاریخ اور تدریجی نشو و نما پر بہت گہری نظر ڈالی گئی ہے - ۴۵ صفحات میں عربی افسانے کی پوری تاریخ اس سے بہتر طریقہ سے پیش کرنا مشکل ہے - مقدمہ کے بعد محمود تیمور کی چھہ مصری کہانیوں کا ترجمہ ہے ' یہ مختصر کہانیاں خود مصنف کے خیال کے مطابق اُس کی افسانہ نویسی

کا بہترین نمونہ ھیں - ان سے اس کے انداز تحریر کا اچھی طرح اندازہ ھوسکتا ھے - محمود تیمور پر روسی افسانہ نگاروں اور خصوصاً چیخوف کا گہرا اثر معلوم ھوتا ھے —

دوسرے مضمون میں شامی ادیب نعیمی نے اپنی سوانح عمری آپ دلچسپ پیرائے میں لکھی ھے - جس میں اس نے بتایا ھے کہ وہ کہاں تک امریکی اور روسی ادب کا رھین منت ھے —

تیسرا مضمون سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے بہت اھم ھے - اس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ھے کہ بالشویک تحریک کو عرب اور خود روس کے اسلامی علاقوں میں کس نظر سے دیکھا جاتا ھے اور بالشویک پروپیگنڈے کو اسلامی دنیا میں کس حد تک کامیابی حاصل ھو رھی ھے - یہ ایسا موضوع ھے جس پر صحیح معلومات بہت کم ھیں اور جو کچھ معلومات ھیں وہ زیادہ تر یک طرفہ بیانات پر مبنی ھیں - اگر اس تحریر کو قابل اعتبار مانا جاے تو یہ کہا جاسکتا ھے کہ بالشویک خیالات کا عربوں ھی پر نہیں خود روسی مسلمانوں پر ابھی تک کوئی خاص اثر نہیں ' وہ اشتراکیت اور اشتمالیت کے اصولوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں معلوم ھوتے - یہ سب کچھ صحیح ھے کہ فلسطین کے علاقے میں بہت سے نوجوان اس تحریک سے متاثر ھیں ' ادھر روس ' حجاز اور یمن سے تجارتی تعلقات بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رھا ھے اور روسی تجار اور روسی مبلغوں میں ھمیشہ فرق کرنا بہت مشکل ھے' مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ھے کہ کم از کم اب تک حجاز اور یمن کے بادشاھوں کو اس میں پوری کامیابی حاصل ھوئی ھے کہ بالشویک خیالات ان کے ملکوں میں نہ پھیلنے پائیں - وہ سستا سامان خوشی سے خرید لیتے ھیں مگر روسی گماشتوں کو کسی قسم کی تبلیغ واشاعت نہیں کرنے دیتے - یہ کہنا مشکل ھے کہ یہ صورت کب تک قایم رہ سکے گی —

رسالہ کے مالک کا پتہ یہ ھے :

Arthur Collingon, G. M. B. H., Berlin N. W. F.

(۴۰م)

۲ MOSLEMISCHE REVUE (مسلم ریویو)

یه رساله برلین سے مولوی صدر الدین صاحب اور ڈاکٹر سید محمد عبدالله صاحب کی ادارت میں سال میں چار مرتبه شایع هوتا هے - اس کا مقصد تبلیغ اسلام هے - اور انداز کم و بیش وهی هے جو انگریزی رساله " اسلامک ریویو " کا جو ووکنگ سے شایع هوتا هے —

اکتوبر سنه ۳۲ ع کے نمبر میں جو اس وقت همارے پیش نظر هے صرف دو مضامین هیں - ایک تو ڈاکٹر عبدالله صاحب کا خطبه " اسلام اور تلوار " پر اور دوسرا هر انٹون هارٹ مان کا مضمون " حکمت درویشان " کے نام سے - ڈاکٹر عبدالله صاحب نے اپنے خطبے میں اسلام پر سے یه الزام هٹانے کی کوشش کی هے که وه تبلیغ کے لئے تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا هے - هرانٹون هارٹ مان نے بعض اسلامی تعلیمات کو درویشوں کی زبان کے ذریعه اچھے طریقه سے ادا کیا هے - رساله کی قیمت چار مارک (تقریباً چار روپے) سالانه هے اور ملنے کا پته یه هے :

Briennerstrasse 7, moschee, Berlin - Wilmersdorf

(معم)

نیرنگ خیال کا اقبال نمبر

(قیمت دو روپے)

سر محمد اقبال مدفیوضهم نے اپنی شاعری کی بدولت وه شهرت و امتیاز حاصل کیا هے که ان کے کلام کی تفهیم واشاعت میں جس قدر سعی کی جاے، مشکور هوے بغیر نه رهے گی - اس سلسلے میں ' لاهور کے مشهور رسالے ' نیرنگ خیال نے اپنی دو اشاعتیں یک جا کرکے " اقبال نمبر " کے نام سے ۴۰۸ صفحه کا ایک مجموعه شائع کیا هے جس میں حضرت اقبال کے حالات زندگی اور شاعری پر ۴۶ مضامین نظم و نثر درج هیں - یه سب تنقید کی بجاے تحسین کا پیرایه رکھتے هیں اور بے شبه ان کا مفهوم ایسا هے که اس کی جتنی تعریف کی جاے بجا هے - اسی کے ساتھه چونکه هر لکھنے

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

جلد ۱۳ — اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء — حصہ ۵۲

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

مرحوم دهلی کالج

(۴)

(از اڈیٹر)

کالج کے اساتذہ

پرنسپل جدید تنظیم کے وقت جب سنہ ۱۸۲۵ ع میں کالج کی صورت قائم ہوئی تو جے - ایچ ٹیلر مجلس مقامی کے ' جو کالج کی انتظامی کمیٹی تھی ' سکرٹری اور کالج کے سکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوے - ابتدا میں ان کا تقرر ۱۷۵ روپے ماہانہ پر ہوا بعد میں تین سو روپے ہو گئے - ان کے ذمے بہت سے دوسرے کام تھے اور کالج پر بہت کم وقت صرف کر سکتے تھے ' لہذا مجلس مقامی نے سنہ ۱۸۳۷ ع میں یہ تجویز کی کہ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل مقرر کئے جائیں اور ان کی تنخواہ آٹھ سو روپے ماہانہ قرار دی جاے - گورمنٹ نے اس تجویز کی منظوری کو بعض حالات کی دریافت پر ملتوی رکھا اور کالج یونہیں چلتا رہا —

سنہ ۱۸۳۹ ع میں جنرل کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک پرنسپل مقرر کیا جاے جو اپنا تمام وقت کالج کے فرائض انجام دینے میں صرف کرے اور مشرقی شعبے نیز انگلش انسٹی ٹیوشن کی عام نگرانی کرے اور انگریزی شعبے کی اعلیٰ جماعتوں کو سائنس اور ادب کی اعلیٰ

شاخوں میں تعلیم دے اور اس کے ساتھہ ھی مقامی مجلس کے سکرتری کی خدمات بھی انجام دے - یہ تجویز منظور ھوی اور سنہ ۱۸۴۱ ع میں مسٹر ایف بٹروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ۶۰۰ روپے ماھانہ پر ھوا —

یہ بہت قابل اور صاحب علم شخص تھے' انھوں نے مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج میں بڑی کوشش کی اور دیسی زبان میں ترجمے کے ذریعہ علم کی اشاعت کے بڑے حامی تھے - چنانچہ دھلی ورنیکار ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام و ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا اور یہی اس کے سکرتری تھے - اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ علوم مفیدہ کا دیسی زبان میں ترجمہ کیا جاے یا کتابیں تالیف کی جائیں - مسٹر بٹروس نے جس مستعدی اور حقیقی سر گرمی اور خلوص سے اس سوسائٹی کے ترقی دینے اور کتابوں کے ترجمے کرانے میں کوشش کی وہ نہایت قابل قدر ھے اور ان کا احسان اردو زبان پر ھمیشہ رھے گا - دھلی کالج میں انھوں نے بہت سی اصلاحیں کیں اور مشرقی شعبے کی تعلیم کو قابل اطمینان حالت میں چھوڑا اور اس کو مغربی علوم کی تعلیم میں انگریزی شعبے کے برابر برابر کر دیا' کمی جو کچھہ تھی وہ صرف کتابوں کی تھی - سنہ ۱۸۴۵ میں بوجہ بیماری دو سال کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے - مسٹر بٹروس نے در اصل استعفا داخل کیا تھا اور درخواست یہ کی تھی کہ فی الحال وہ دو سال کے لیے جارھے ھیں' اس اثنا میں اگر ان کی صحت اچھی ھوگئی تو بلا خیال ان کے استعفے کے انھیں ھندوستان آنے پر بحال کردیا جاے - گورنمنٹ نے یہ بات منظور کر لی - لیکن افسوس انھیں پھر آنا نصیب نہ ھوا —

ان کی جگہ ڈاکٹر اے سپرنگر' ایم - ڈی اسسٹنٹ سرجن بنگال سروس کا تقرر ھوا اور کالج کو مسٹر بٹروس کا نعم البدل مل گیا —

ڈاکٹر سپرنگر عربی زبان و ادب کے عالم تھے اور اس لیے دلی کے مسلمان شرفا اور اهل علم میں انھوں نے جلد اثر پیدا کرلیا اور شہر میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دوسرے' دھلی ورنیکلر سوسائٹی جس نے اردو زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت میں بڑا کام کیا تھا اور مشرقی شعبے کے طلبہ کی تعلیم اور تشویق علم میں بڑی مدد دی تھی' اس کے وہ روح و رواں تھے۔ انھوں نے کالج کی ترقی اور اصلاح میں بڑی مستعدی اور شوق سے کام کیا - نصاب تعلیم میں خاص کر مشرقی شعبے کے نصاب میں معقول اصلاحیں کیں - چنانچہ نصاب کی خاطر تاریخ یمینی کو ایڈٹ کیا اور چھپوایا' حماسہ اور متنبی کے نسخے بہم پہنچائے اور عربی ادب کے نصاب میں شریک کرائے - انتظامی حالت بھی ان کے زمانے میں بہت اچھی رھی - علاوہ اس کے وہ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکرٹری بھی تھے اور اسی جوش سے کام کر رھے تھے جیسے ان کے پیشرو مسٹر بٹروس —

فروری سنہ ۱۸۴۸ع میں ڈاکٹر صاحب بحکم گورمنٹ آف انڈیا لکھنؤ میں خاص کام پر متعین کئے گئے - وھاں انھیں شاھان اودہ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کا کام تفویض کیا گیا - یہ فہرست ان کی بڑی یادگار ھے اور بڑی قابلیت اور محنت سے تیار کی گئی ھے - ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری میں ھیڈ ماسٹر (مسٹر ٹیلر) ان کے قائم مقام ھوے —

ڈاکٹر صاحب لکھنؤ میں خاصی مدت تک رھے - وھاں کا کام ختم ھو گیا تو چودہ جنوری سنہ ۱۸۵۰ ع کو اپنی اصل خدمت پر عود کیا - لیکن انھیں اپریل سنہ ۱۸۵۰ ع کو بہ وجہ علالت شملہ چلے گئے - اس کے بعد مئی سنہ ۱۸۵۰ ع میں ان کی خدمات بنگال میں منتقل کر دی گئیں تو پرنسپلی کی خدمت پر مسٹر جے کارگل کا تقرر ھوا —

مسٹر کارگل کے چلے جانے کے بعد سنہ ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹیلر قایم مقام پرنسپل ہوگئے۔ یہ بہت پرانے استاد تھے اور ابتدا سے ان کا تعلق کالج سے چلا آرہا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں یہی پرنسپل تھے اور جس بےکسی کی حالت میں وہ مارے گئے اس کا ذکر اس سے قبل ہوچکا ہے۔ ان کے قتل کا سب کو رنج تھا، خاص کر ان کے طالب علموں کو بہت صدمہ ہوا۔

مسٹر ٹیلر نے دلی کالج میں تیس برس تک ہیڈ ماسٹری کی اور دو تین سال تک پرنسپل رہے۔ وہ طلبہ پر پدرانہ شفقت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب میری اولاد ہیں اور ان سے بہتر اولاد ہو نہیں سکتی، کیونکہ یہ سب صاحب لیاقت نیک سیرت اور نیک اطوار ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ کا طلبہ پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ ان سے سچی محبت کرتے تھے۔ بعض (ہندو) طلبہ نے تو ان کے اخلاق سے متاثر ہوکر اپنا مذہب تک بدل دیا۔

ناظم صاحب تعلیمات ممالک مغربی شمالی نے مسٹر ٹیلر کی وفات پر مفصلۂ ذیل الفاظ لکھے۔

"میں مسٹر ٹیلر کی بیش بہا کار گزاری کی تصدیق کرتا ہوں۔ گورنمنٹ کے کسی محکمے میں ان سے زیادہ صادق اور قابل قدر کوئی شخص نہ تھا۔ ان کے طویل قیام دہلی اور طلبہ سے گہری واقفیت نیز اس ادب و احترام کی وجہ سے جو دہلی والے ان کا کرتے تھے اور بوجہ اس اثر کے جو وہ کالج کے ہندوستانی اساتذہ پر رکھتے تھے، انہوں نے بہت سی اصلاحیں بغیر کسی مخالفت کے جاری کیں اور کالج کو بڑی

ترقی کے درجے تک پہنچایا " —

جب کالج سنہ ۱۸۶۴ع میں پھر کُھلا تو مسٹر ایڈ منڈ ولمٹ بی - اے ' ٹرنٹی کالج - کیمبرج انگلستان سے آے اور پرنسپلی کی خدمت پر فائز ھوے - لیکن تھوڑے ھی دن ھوے تھے کہ ان پر ایک ایسا حادثہ گزرا کہ کالج ان کی خدمات سے محروم ھوگیا اور ان کی ملازمت کا بہت سا حصہ بیماری میں کٹا - وہ ریاضی کے بڑے عالم تھے اور کالج کے درجوں اور انٹرینس کی جماعت کو ریاضی پڑھاتے تھے - علاوہ اس کے وہ اردو اور عربی سے انگریزی ترجمے کی بھی تصحیح کرتے تھے —

مسٹر بٹروس ' ڈاکٹر سپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ھیں کہ انھوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی - طلبہ اور اساتذہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے - خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح اور اُردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بٹروس اور ڈاکٹر سپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ھے —

انگریز اساتذہ میں پروفیسر ایلس بھی خاص طور پر قابل ذکر ھیں - وہ انگریزی ادب کے بڑے فاضل مانے جاتے تھے اور ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ھوا تھا - پرنسپل ان کو پروفیسروں کی جان سمجھتے تھے اور بے حد تعریف کرتے تھے - طلبہ سے ان کا ایسا اچھا برتاو تھا کہ وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے ' لیکن انھیں شراب کی ایسی دھت لگ گئی کہ اس نے بالکل تباہ کردیا - کچھ دنوں انھوں نے مسٹر ولمٹ کے جانے کے بعد پرنسپلی بھی کی - لیکن ان کی ھر وقت کی شراب نوشی کا یہ نتیجہ ھوا کہ کئی بار تنزل ھوا اور آخر پروفیسری سے سیکنڈ ماسٹر کر دئیے گئے - لیکن اس حالت

میں بھی کالج کی جماعتیں درس کے لیے انھیں کے پاس بھیجی جاتی تھیں—

مشرقی شعبہ کے بعض اساتذہ

عربی کے صدر مدرس مولوی مملوک علی بڑے جیّد عالم تھے اور شہر ہی میں نہیں بلکہ دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی - مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعراے ہند میں لکھتے ہیں کہ " مدرس اول مدرسۂ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں - عہدۂ مذکور مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں - حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بناے مدرسۂ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے - فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں - ہر ایک علم و فن سے جو ان زبانوں میں ہیں' مہارت تامہ اُن کو حاصل ہے - اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہوجاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے - اور جس کار پر مامور ہیں اُس میں کبھی کسی طرح کا حتی‌الوسع ان سے قصور نہیں ہوا - مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کبھی کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو - بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اُٹھایا ہوگا - اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے - کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھادیں گے گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے - اس لیے رات دن سواے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبا پڑے رہتے ہیں' ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں - اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کرسکتے' سب کو پڑھاتے ہیں......... عمر ان کی

سنہ ۱۸۴۷ ع میں ساتھہ برس کی هوگی - بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق هیں - تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارهویں اور بارهویں کا کیا هے - حق یہ هے کہ علم هندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا هے - اصل وطن ان کا نانوتہ هے مدت سے شاهجہاں آباد میں رهتے هیں " - مولوی صاحب نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا —

مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے - مصنف اور شاعر بھی تھے - ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں - ان کی بعض تصانیف اب تک پڑھی جاتی هیں - شہر میں ان کی بڑی عزت تھی - علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی ' جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج هیں - حدائق البلاغت (تصنیف شمس الدین) کا ترجمہ اردو میں کیا - شعراے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع هوکر شایع هوا —

ان کے تقرر کا عجیب واقعہ هے - سنہ ۱۸۴۰ ع میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر هونا چاهئے - مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ همارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص هیں - ایک مرزا نوشہ ' دوسرے حکیم مومن خاں ' تیسرے امام بخش صہبائی - لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا - مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے ' انھوں نے تو انکار کردیا - مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپیہ ماهانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا - مولوی امام بخش

کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپیہ ماہانہ کی قبول کرلی - بعد میں پچاس ہوگئے —

مولوی سبحان بخش جن کی کتاب " محاورات ہند " مشہور ہے اور کئی بار چھپ چکی ہے، دلی کالج کے قابل اور کارگزار مدرس تھے - پرنسپل نے اپنی رپورٹوں میں جا بجا ان کی تعریف کی ہے - وفیات اعیان ترجمۂ تاریخ ابن خلکان انھیں کا کیا ہوا ہے - تزک تیموری کا ترجمہ بھی اردو میں کیا - اس کے علاوہ ایک تذکرۂ مفسرین اور ایک تذکرۂ حکما بھی لکھا —

ماسٹر وزیر علی اور ماسٹر امیر علی بھی دہلی کالج کے قابل اور مشہور اساتذہ میں سے تھے —

ماسٹر رام چندر کالج ہی کے ایک ممتاز طالب علم تھے جو بعد میں سائنس کے ماسٹر ہوگئے اور اب تک ماسٹر رام چندر ہی کے نام سے مشہور ہیں - رپورٹوں میں ان کی کارگزاری کی بہت تعریف کی گئی ہے - ریاضی کے بڑے استاد تھے - اس علم میں ان کی تصانیف بھی ہیں - سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دیتے تھے اور طلبہ ان سے بے حد خوش تھے اور بڑی محنت کرتے تھے - ان کا ذکر قدیم طلبہ کے ضمن میں تفصیل سے کیا جائے گا —

ضیاءالدین بھی (جو بعد میں شمس العلما ڈاکٹر ضیاءالدین ہوے) اسی کالج کے طالب علم تھے - سنہ ۱۸۶۴ ع میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی کی خدمت پر مقرر کیے گئے اور بعد میں پروفیسر ہوگئے —

ماسٹر پیارے لال بھی کالج ہی کے طالب علم تھے اور ابتدا میں یہیں مدرس ہوے - ان کی کارگزاری کی بھی تعریف کی گئی ہے - ان کے مفصل حالات قدیم طلبہ کے تحت میں بیان کئے جائیں گے —

بھیروں پرشاد بھی یہیں کے طالب علم تھے جو بی - اے میں تمام یونیورسٹی میں اول آے تھے ' اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ھوگئے —

مولوی ذکاءاللہ بھی یہیں کے طالب علم اور سینیر پرشین اس کالج تھے - انھوں نے بھی ابتدا میں دھلی کالج ھی میں بیس روپے ماھانہ پر مہندس کی خدمت قبول کرلی تھی —

مولوی احمد علی دھلی کے رھنے والے تھے ' مدرسۂ دھلی میں مبتدیوں کو فارسی پڑھاتے تھے - قواعد اردو مسمی بہ " چشمۂ فیض " انھیں کی تالیف ھے —

میر اشرف علی مدرسہ میں منشی تھے اور بہت قابل شخص تھے - تاریخ کشمیر کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا - رسالۂ اصول حساب کی تالیف میں بابو ھردیو سنگھہ کو مدد دی اور بریف سروے آف ھسٹری کے اردو ترجمے کی اصلاح کی - مولوی کریم الدین نے اُن کے اخلاق اور لیاقت کی بہت تعریف لکھی ھے —

پنڈت رام کشن دھلوی بھی اسی مدرسہ میں مدرس تھے - انگریزی اور فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی اور اردو بھی خوب لکھتے تھے - ایک رسالہ علم طب میں انگریزی سے ترجمہ کیا - اور اصول قوانین دیوانی و فوجداری ' اصول قانون کلکٹری ' اصول قوانین گورنمنٹ ' سیراسلام کے چوتھے باب اور میکناٹن کے اصول دھرم شاستر کا ترجمہ کیا - قواعد صرف و نحو انگریزی ڈاکٹر اس پرنگر کی مدد سے اردو میں تالیف کی - اور ایک کتاب فن زراعت پر " مزید الاموال با صلاح الاحوال " کے نام سے لکھی —

ماسٹر حسینی مدرسہ میں بچوں کی تعلیم پر مقرر تھے - تاریخ مغلیہ کا ترجمہ اردو میں کیا - تاریخ ایران (مولفۂ کونلر) کا اردو ترجمہ

بھی انھیں کا ہے - علاوہ ان کے میکناٹن کی شرح شریف ' قانون محمدی فوجداری (مولفۂ میکناٹن)' قانون وراثت اسلامی (مولفہ میکناٹن) ' سکیپ وتھ کے خلاصۂ قانون دیوانی' قانون فوجداری کے ترجمے انھیں کے قلم کے ممنون ہیں—

ھر دیو سنگھ منشی گری کی خدمت پر مامور تھے - بہت محنتی ' ھوشیار اور خلیق شخص تھے - رسالۂ پیمائش (دوحصوں میں) انھیں کی تالیف ھے جو بعد اصلاح مولوی قادر علی طبع ھوا - پروفیسر ڈیمورگن کی کتاب اصول حساب کا ترجمہ اردو میں کیا جس کی اصلاح منشی اشرف علی نے کی اور سوسائٹی نے طبع کرایا —

ماسٹر نور محمد تحتانی جماعتوں کے مدرس تھے - انھوں نے تاریخ بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا - تاریخ مغلیہ کے ترجمے میں ماسٹر حسینی بھی شریک تھے —

مولوی حسن علی خان فارسی کے مدرس تھے ' بہت قابل اور ھوشیار شخص تھے - قانون مال' گلستان سعدی اور الف لیلہ (منتخب) کا ترجمہ اردو میں کیا - اور پرنسپل صاحب کی فرمائش سے کرۂ ارضی کا بھی ترجمہ کیا - یہ سب کتابیں سوسائٹی نے طبع کرائیں —

کالج کے بعض قدیم طالب علم

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ھے ' اسی طرح انسان اپنے کرموں سے اور ایک ادارہ اپنے کاموں سے جانچا جاتا ھے - دلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ھیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا - علم کے وہ پجاری آج ھماری زبان کے دیوتا ھیں -

اُن کے نام اردو زبان کی تاریخ میں روشن ستاروں کی طرح چمک رھے ھیں جن کی جگمگا ھٹ کبھی کم نہ ھوگی - وہ بھی کیا زمانہ تھا جب دلی کالج نیا نیا قایم ھوا تھا اور دلی کے شریف مگر غریب گھرانوں کے بھولے بھالے بچے جنھوں نے قدیم خیالات اور اخلاق اور آخری زمانے کے زوال یافتہ ماحول میں پرورش پائی تھی ' جوق جوق اس سرچشمۂ علم کے کنارے جمع ھو رھے تھے - وہ زمانے کی نیرنگیوں سے بے خبر اور اس دور کے انقلاب سے جو سروں پر منڈلارھا تھا نچنت اپنے شفیق استادوں کی زیر نگرانی ایک نئے مطالعے میں مصروف تھے - کلی کے کھلنے کی ایک آن ھوتی ھے جس میں وہ پھول بن جاتی اور اپنی معصومیت کو کھو کر زندگی کی نئی منزل میں جا پہنچتی ھے - لڑکپن سے نکل کر شباب کی سرحد میں پہنچنے کا ایک خاص وقت ھوتا ھے جب کہ بھولے پن کو خیر باد کہہ کر انسان کشمکش حیات کے ایک عجیب وغریب عالم میں جا پہنچتا ھے - یہی وقت ایک شوقین طالب علم پر گزرتا ھے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی کتابوں کے ورق لوٹنے میں مصروف ھے' کہ اسی الٹ پلٹ میں دفعتاً اس کے دل کا قفل کُھلتا ھے اور وہ اپنے سینے کو ایک نئی روشنی سے معمور اور اپنے آپ کو ایک نئے عالم میں پاتا ھے - یہ ایک عجیب وقت ھے جس کی کیفیت بیان کرنے سے زبان قاصر اور مصور کا قلم عاجز ھے - دلی کا لڑکا جس نے گھر کی چار دیواری اور پرانی روایتوں اور قصوں میں پرورش پائی ھے ' بغدادی قاعدہ' قرآن کی دوچار سورتیں یا ایک آدہ مذھبی رسالہ یا زیادہ سے زیادہ کریما ما مقیماں پڑھ کر اس قصر میں قدم رکھتا ھے جہاں زمانے کے بعض نباضوں نے آدم گری کا بیڑا اُٹھایا ھے - وھاں جاکر وہ نئی صورتیں ' نیا رنگ ' نئی بات چیت دیکھتا ھے ؛ اول اول ڈرتا' گھبراتا ' جھجھکتا اور

جھینپتا ہے اور پھر کچھ دنوں بعد یہی بھیانک مقام اس کا گہوارا ہو جاتا ہے - اب ایک وقت آتا ہے جب کہ مغربی علوم کی صدا اس کے کانوں میں اپنی کم زور مگر شیریں زبان کے ذریعے سے پہنچتی ہے- وہ جدید ہیئت کی کہانی سنتا اور علوم طبیعیات کے تجربے دیکھتا ہے - اس کے دل میں ولولہ، اور دماغ میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور پرانی روایتوں کی بنیاد متزلزل ہوتی ہے، اس کا شوق اور بڑھتا ہے اور لکچر کا ایک ایک لفظ کانوں سے سنتا نہیں، پیتا ہے، اس کی نظریں طبیعیات کے تجربے میں اس طرح گڑی ہوی ہیں کہ گویا وہ اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جاے گا - اس کا انہماک اسے ایک اور ہی عالم میں لے جاتا ہے، اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے، دل اُمنگوں سے چھلکنے لگتا ہے، آنکھوں میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے جو چاند تاروں میں نظر آتی ہے نہ سورج میں - وہ روحانی مسرت ہے - کولمبس کو امریکہ پاکر وہ خوشی نہوی ہوگی جو اس طالب علم کو یہ نئی دنیا پا کر ہوی ہے - پہلے وہ طالب علم تھا اب عاشق ہے - پہلے وہ لیلیٰ تھا اب مجنوں ہے - یہی عشق، یہی جنوں اُسے وہاں تک لے جاے گا جسے منزل مقصود کہتے ہیں- وہ کالج سے چل کر گھرجاتا ہے، اس کے قدم پڑتے ہیں لیکن اُسے کچھہ معلوم نہیں کہ کہاں جارہا ہے، بازار میں بھیڑ لگی ہوئی ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے، گھوڑے گاڑیاں، پالکیاں آرہی جارہی ہیں، شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، لیکن اس پر نہ دھکا پیل کا کچھہ اثر ہے نہ لوگوں کے شور و غل کا - وہ نہ کچھہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے - اس کی آنکھوں میں وہی سما چھارہا ہے جو اس نے کالج میں دیکھا تھا، اس کے کانوں میں وہی آواز گونج رہی ہے جو اس نے کالج میں سنی تھی - وہ

گھر پہنچتا ھے اور نہایت بے تابی اور شوق سے اپنے بزرگوں کے سامنے سائنس کے عجائبات اور تجربے بیان کرتا ھے اور باغ باغ ھوا جاتا ھے - اس کے ماں باپ اس کی انوکھی باتیں سن سن کر سہمے جاتے ھیں اور دل ھی دل میں کہتے ھیں خدا خیر کرے اس کے لچھن تو اچھے نہیں معلوم ھوتے - اسے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ اس نے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے - وہ اپنے حال میں مگن ھے وہ اس عالم میں نہیں ' کہیں اور ھے - یہ تھی پہلی کرن آفتاب علم کی جس نے بھولے طالب علم کے صاف دل کو منور کردیا - یہ وھی نور ھے جو ھم تک پہنچا ھے اور پشت ھا پشت تک پہنچتا رھے گا -

اب میں انھیں چند سپوتوں کا مختصر سا ذکر کرنا چاھتا ھوں - ان کے نام ھی اس بات کے سمجھنے کے لیے کافی ھیں کہ دلی کالج کیا چیز تھا اور اس نے کیا کام کیا - ماسٹر رام چندر ' شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد ' شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد ' شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ ' شمس العلما ڈاکٹر ضیاءالدین یہ ایسے مشہور و معروف بزرگ ھیں کہ ان کے حالات بیان کرنا فضول ھیں - اردو داں لوگ ان کے حالات اور ان کے کارناموں سے بہت کچھ واقف ھیں - ھماری زبان پر ان کے ایسے احسانات ھیں کہ ھم کبھی بھول نہیں سکتے - مولوی نذیر احمد ' مولوی محمد حسین آزاد وہ لوگ ھیں جن کی تصانیف اردو زبان میں بہت بڑا درجہ رکھتی ھیں اور ھمیشہ زندہ رھیں گی - مولوی ذکاءاللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنی سے اعلی درجے تک نیز تاریخ ' جغرافیہ ' اخلاق ' طبیعیات وغیرہ پر بے شمار کتابیں لکھی ھیں جو بجاے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ھیں - مولوی ضیاءالدین بھی ایک بڑے عالم تھے اور کالج میں عربی پروفیسر ھوگئے تھے ' افسوس کہ ان کی یادگار سواے رسوم ھند کے پہلے حصے کے

کوئی اور نہیں پائی جاتی ہے - لیکن اس میں بھی استاد کا کمال کہیں کہیں ضرور نظر آتا ہے - ماسٹر رام چندر ان سب میں سینیر اور قابل شخص تھے - ریاضی اور سائنس کے بڑے استاد تھے اور ریاضی کے فن میں بڑا نام پایا - افسوس لوگ انھیں بھولتے جاتے ہیں اس لیے میں یہاں ان کا مختصر سا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں - ایک بات عجیب یہ ہے کہ ان سب حضرات نے نیز دیگر قدیم طلبہ نے تعلیم کے بعد زندگی مدرسی سے شروع کی - بہت سے آخر تک مدرس رہے اور بعض جو مدرسے دوسرے مدارج پر پہنچے وہ اگرچہ مدرس تو نہ رہے مگر عمر بھر معلم رہے اور اپنی تعلیم سے اہل وطن کو فائدہ پہنچایا کیے - یہ سب کالج کے سینیر اسکالر تھے - لیاقت کا وظیفہ پاتے تھے - مضمون نویسی میں ان سب نے انعام اور تمغے پائے اور پرنسپلوں کی رپوٹوں میں ان کی بڑی تعریف پائی جاتی ہے —

اب میں ماسٹر رام چندر کا تھوڑا سا حال بیان کرتا ہوں —

ماسٹر رام چندر سنہ ۱۸۲۱ ع میں پانی پت میں پیدا ہوے - ان کے باپ سندر لال دھلی کے باشندے اور کائستھ تھے اور دھلی میں نائب تحصیل داری اور تحصیل داری کی خدمتوں پر رہے - پانی پت اس وقت مستقر ضلع تھا —

سندر لال دفعتاً بیمار ہوئے اور سنہ ۱۸۳۱ ع میں انتقال کرگئے - ایک بیوہ اور چھ بیٹے چھوڑے ' جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا - رام چندر کی عمر اس وقت نو سال کی تھی - ماں نے پالا پوسا اور ابتدائی تعلیم دلائی - شروع میں انھوں نے مکتب میں تعلیم پائی پھر سنہ ۱۸۳۳ع میں انگلش اسکول میں داخل ہو گئے - اس وقت ہر طالب علم کو

دو روپیہ مہینہ دیا جاتا تھا اور درجۂ اول و دوم کے تمام طالب علموں کو پانچ روپے ماھانہ وظیفہ ملا کرتا تھا ۔ رام چندر بچپن ھی سے لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے ۔ اس مدرسے میں چھہ سال رھے اور خوب دل لگا کر پڑھا —

ابھی ان کی عمر گیارہ ھی برس کی ھوگی کہ رواج کے مطابق شادی ھوگئی ۔ شادی ایک خوش حال کائستھہ خاندان میں ھوئی تھی ، لیکن لڑکی گونگی بہری تھی ۔ شاید روپے کے لالچ میں (جیسا کہ ھمارے ھاں اکثر ھوتا ھے) یہ عقد کر دیا گیا —

فکر معاش کی خاطر تعلیم چھوڑ کر محرری کی خدمت کرلی ۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی ۔ دو تین سال نوکر رھے ۔ سنہ ۱۸۴۱ ع میں جب دلی کا مدرسہ کالج ھوگیا تو وہ پھر اس میں داخل ھوگئے ۔ دو تین سال جو تعلیم چھٹ گئی تھی تو انھیں بہت زیادہ محنت کرنی پڑی ۔ انھوں نے سینیئر وظیفے کے مقابلے کی کوشش کی ، یہ وظیفہ تیس روپے ماھانہ کا تھا ، مقابلے کے امتحان میں کامیاب ھوے ۔ ان کے بھائیوں کو بھی وظیفہ ملتا تھا ۔ اس سے خاندان کی گذر ھوئی چلی جاتی تھی اور انھیں اس طرف سے قدرے بے فکری ھوگئی تھی —

رام چندر تین سال تک ھر امتحان میں کامیاب ھوتے رھے ۔ اٹھائیس فروری سنہ ۱۸۴۴ ع میں کالج کے شعبۂ مشرقی میں پچاس روپے مشاھرہ پر یوروپین سائنس کے مدرس ھوگئے ۔ اس زمانے میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ھوئی تھی ، انھوں نے اس کے لیے اردو میں الجبرا اور علم مثلث (Trigonometry) پر کتابیں لکھیں ۔ یہ کتابیں نصاب تعلیم کے کام آئیں ، جن سے مشرقی شعبے کے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا —

اسی زمانے میں ماسٹر رام چندر نے ایک ماہانہ رسالہ فوائدالناظرین کے نام سے نکالا جو بعد میں مہینے میں دو بار نکلنے لگا - اس میں اکثر علمی بحثیں ہوتی تھیں - ان نئے خیالات کو پڑھ کر لوگ ان کو بد مذہب اور ملحد کہتے تھے —

اس رسالے کے علاوہ انھوں نے ایک اور رسالہ " محب ہند " کے نام سے شایع کیا ' لیکن اپنے شہر اور ملک والوں سے انھیں کچھہ مدد نہ ملی - البتہ انگریز افسروں نے امداد کی مثلاً سرجان لارنس جو اس وقت دہلی میں میجسٹریٹ تھے ' ڈاکٹر راس (سول سرجن) ' مسٹر گبن (جج دہلی) ان رسالوں کے متعدد نسخے خریدتے تھے جس سے طبع کا خرچ نکل آتا تھا - لیکن حالات کچھہ ایسے بدل گئے کہ یہ رسالے بند کرنے پڑے اور پانچ سال چلانے کے بعد سنہ ۱۸۵۲ ع میں ان دونوں کا خاتمہ ہو گیا —

یہ بہت اچھے مدرس تھے اور اپنے شاگردوں پر بہت شفقت کرتے تھے اور بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے ' انھوں نے محنت کر کے اس زمانے میں مشرقی زبانوں اور خاص کر عربی میں معقول استعداد پیدا کرلی تھی -

ماسٹر رام چندر کو ریاضی سے خاص لگاؤ تھا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے اس میں بہت کچھہ ترقی کرلی تھی - شروع میں ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے کئے - اس سے ان کا ذوق اور بڑھ گیا - ان میں ایک ان کا جبر و مقابلہ ہے جو اس فن کی انگریزی کتابوں کی مدد سے تالیف کیا اور سوسائٹی نے طبع کرایا - اس کے علاوہ ایک رسالہ اصول علم مثلث بالجبر اور تراشہاے مخروطی میں اور علم ہندسہ بالجبر میں لکھا - سنہ ۱۸۵۰ ع میں جبکہ وہ مغربی سائنس کے مدرس تھے اور فوائدالناظرین نکالتے تھے انھوں نے اپنی کتاب کلیات و جزئیات (Maxima & Minima) شایع کی —

یہ کتاب کلکتہ میں چھپی - کلکتہ کے اخباروں اور رسالوں اور خاص کر کلکتہ ریویو نے اس پر مخالفانہ تنقید کی جس سے ماسٹر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی —

سنہ ۱۸۵۱ ع کی تعطیلوں میں یہ کلکتہ گئے اور وہاں بعض دوستوں نے کلکتہ ریویو کی تنقید کا جواب لکھنے کا مشورہ دیا - انہوں نے جواب لکھا جو انگلش‌مین میں چھپا —

کلکتہ میں دہلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے اُنھیں آنریبل ڈی بیتھیوں (D. Bethune) ممبر سو پریم کونسل و پریزیڈنٹ لا کونسل و کونسل آف ایجوکیشن سے ملایا - انھوں نے ماسٹر صاحب سے ان کی کتاب کا ایک نسخہ طلب کیا اور ۵۰ سو روپے پیش کئے —

ماسٹر صاحب نے یہ کتاب اپنے خرچ سے چھپوائی تھی جس کے لیے انھیں بہت تردد اور فکر کرنا پڑا اور قرض لینا پڑا - مسٹر بیتھیوں نے ان‌کی کتاب کے نسخے انگلستان میں متعدد اصحاب کے نام بھیجے جن میں سے ایک پروفیسر ڈی مارگن (A. De Morgan) ایف - آر - ایس' ایف - سی - پی - ایس- آف ٹرنٹی‌کالج کیمبرج' پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی تھے- پروفیسر مارگن نے اس کتاب کی بہت قدر کی اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور (۲۴ جولائی سنہ ۱۸۵۶ ع کو) ان کے چیرمین کرنل سائیکس کو ایک خط اس بارے میں لکھا جو لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کو بھیج دیا گیا - پروفیسر موصوف نے اس خط میں ماسٹر رام چندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ رام چندر کی کتاب کے انتخابات اس ملک (انگلستان) کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کئے جائیں - غرض ایک مدت کی باہمی مراسلت کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کے معزز ممبروں نے ایک

خلعت پنج پارچہ اور دو هزار روپیہ نقد بطور انعام ماسٹر رام چندر کے لیے منظور کیا - سنہ ۱۸۵۹ ع میں مسٹر ولیم تی آرنلڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے دهلی میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور وهاں کے تمام امرا و شرفا اور عہدہ داروں کو اس شرکت کی دعوت دی - اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ "فضیلت پناہ" ماسٹر رام چندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات حسنہ پر سرکار کی طرف سے خلعت عطا کیا جاے - چنانچہ یہ خلعت اور رقم اس جلسے میں ماسٹر صاحب کو عطا کی گئی هے - اس کے علاوہ ماسٹر صاحب نے ایک اور کتاب شایع کی جس میں تفرقی احصا (Differential Calculus) کا ایک نیا طریقہ بیان کیا - اس پر پروفیسر کلانڈ (اڈنبرا یونیورسٹی) اور پروفیسر فشر (سین ایلڈریوس) نے بہت اچھی راے کا اظہار کیا - ان کتابوں کے شایع هونے سے ماسٹر رام چندر کی شہرت بڑہ گئی اور ان کے ایجاد کردہ طریقے یورپ اور هندوستان کے کالجوں میں رائج هو گئے —

غدر کے زمانے میں جو مصیبت ان پر نازل هوئی اس کا سرسری ذکر پہلے آ چکا هے - جنوری سنہ ۱۸۵۸ ع میں وہ نیٹو هیڈ ماسٹر ٹامسن سول انجنیرنگ کالج کے مقرر هوے - ستمبر ۱۸۸۵ ع میں دهلی دسٹرکٹ اسکول کے هیڈ ماسٹر هو گئے —

لیکن اس کے کچھہ عرصے کے بعد ان کی صحت میں فرق آ گیا اور انھوں نے ۲۴ مئی سنہ ۱۸۶۲ ع کو علمی پنشن کی درخواست کی - غرض ایک طویل مراسلت اور واقعات و قواعد کی چھان بین کے بعد ایک سو پچیس روپیہ ماهانہ کی پنشن منظور هوئی - اس کے بعد وہ پٹیالہ میں ناظم تعلیمات هو گئے - وهاں سے بھی اسی قدر پنشن ملی —

عیسائی مذھب قبول کرنے کے بعد ان کا میلان مذھب کی طرف ھو گیا تھا - اس جھمیلے میں پڑ کر انھوں نے مذھبی بحث مباحثے کی کتابیں لکھنی شروع کردی تھیں جو ان کے شان کے شایاں نہیں تھیں - وفات سنہ ۱۸۸۰ع میں ھوئی —

میں نے ماسٹر رام چندر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لیے کیا ھے کہ انھوں نے شروع سے آخر تک دھلی کالج میں تعلیم پائی تھی اور اس کالج کے طلبہ کے صحیح نمائندے تھے - وہ بہت سادہ مزاج تھے اور سادہ ھندوستانی کپڑے پہنتے تھے اور لوگوں میں بہت ھر دلعزیز تھے -

ان کے علاوہ اس کالج کے اور بھی بہت سے ایسے طالب علم ھیں جنھوں نے کالج میں اور کالج چھوڑنے کے بعد جہاں رھے امتیاز اور اعزاز حاصل کیا - چند صاحبوں کے نام اور مختصر حالات یہاں لکھے جاتے ھیں —

مسٹر پتمبر بھی کالج کے قابل طلبہ میں سے تھے - ماسٹر رام چندر کے ھم جماعت اور سینیر اسکالرشپ پاتے تھے - کالج سے سنہ ۱۸۴۵ع میں انجینیری کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے - یہ پہلے دیسی سول انجینیر تھے جو دھلی میں مقرر ھوے —

موتی لال دھلوی (کشمیری پنڈت) کالج کے نہایت ممتاز طلبہ میں سے تھے - انگریزی کی اعلی قابلیت رکھتے تھے - انگریزی مضمون نویسی میں کینز اور بریتی متکاف کے میڈل حاصل کیے (سنہ ۱۸۴۹ و ۵۰ع) - کالج میں سینیر اسکالرشپ پاتے تھے - ان کے وظیفے کی توسیع کے لیے گورنمنٹ میں سفارش کی گئی تو منظوری دیتے وقت خصوصیت کے ساتھ اُن کے متعلق یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ھے کیونکہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی

ہے اور اپنی فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور اُردو رسالوں کے اڈٹ (مرتب) کرنے میں صرف کرتا ہے۔ ختم تعلیم پر سنہ ۱۸۵۰ میں بورڈ آف ایڈ منسٹریشن لاهور کے فارسی مترجم ہو گئے تھے۔ کئی سال پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی رہے۔ حکام بالا دست اور گورنمنٹ کی نظروں میں بہت اعتبار تھا۔ پھر اکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ جج ہو گئے تھے۔ اس آخری عہدے سے پنشن پائی اور گجرات (پنجاب) میں قیام پذیر ہو گئے۔ لاہور میں باسٹھہ سال کی عمر میں انتقال کیا —

اگرچہ یہ ایسے محکمے میں چلے گئے تھے جہاں تعلیم و تعلم کا چرچا نہ تھا لیکن ان کا علمی شوق ہمیشہ قائم رہا۔ پلوٹارک کے تذکرۂ سسرو کا ترجمہ اردو میں کیا جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے شایع ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک تذکرۂ شعرا لکھا تھا۔ تعلیم نسواں اور صغر سنی کی شادی پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔ دو کتابیں مسمرزم کے موضوع پر انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیں۔ اُردو فارسی میں بھی بڑی دستگاہ تھی، بسمل تخلص کرتے تھے۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن پر دہلی کالج کو فخر ہے —

بھیروں پرشاد بھی بڑے قابل طالب علم تھے۔ کالج کی رپوٹوں میں جا بجا ان کی تعریف پائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۸۶۶ ع میں انھوں نے لالہ وزیر سنگھہ کا وظیفہ (مالیتی ایک سو بیس روپے) مقابلے میں حاصل کیا۔ بی۔ اے کے امتحان میں پنجاب کے تمام طلبہ میں اول رہے۔ آرنلڈ گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کالج ہی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ اپنے وقت میں بہت مشہور تھے —

پنڈت من پھول، ذات کے برھمن، دلی کے رهنے والے، کالج کے قدیم طلبہ میں سے تھے۔ غالباً مولوی ذکاء اللہ کے ہم جماعت اور ماسٹر رام چندر

کے شاگرد تھے - کالج کی رپورٹوں میں ان کا ذکر تعریف کے ساتھہ آیا ھے- پنجاب گورمنٹ کے میر منشی ھوگئے تھے- انھیں کی سعی سے مولانا محمد حسین آزاد سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر کے دفتر میں اول اول پندرہ روپے کے ملازم ھوگئے تھے —

ماسٹر پیارے لال دھلی کے رھنے والے تھے - دھلی کالج میں تعلیم پائی اور ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی کی شاگردی کا فخر حاصل کیا - بعد تکمیل تعلیم سررشتۂ تعلیم میں ملازمت کی - گڑگانوں اسکول کی ھیڈ ماسٹری کے بعد دھلی نارمل اسکول کی ھیڈ ماسٹری پر مامور ھوگئے - پھر سنہ ۱۸۶۴ میں پنجاب گورمنٹ بک ڈپو کے کیوریٹر ھوے - بک ڈپو ٹوٹا تو مدارس کے انسپکٹر کے عہدے پر مقرر ھوے —

دھلی سوسائٹی جو ایک علمی اور ادبی انجمن تھی سنہ ۱۸۶۵ ع میں دھلی میں قائم ھوئی - یہ انجمن ماسٹر صاحب کی مساعی کی بہت کچھہ ممنون ھے - جب تک لاھور تشریف نہیں لے گئے وھی اس کے سکریٹری رھے - اس انجمن میں لکچر ھوتے اور مضامین پڑھے جاتے تھے اور علوم و فنون اور معاشرت و قانون وغیرہ پر مباحث ھوتے تھے - جب آپ دھلی سے بک ڈپو کی خدمت پر جانے لگے تو سوسائٹی کی جانب سے آپ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا جس پر دھلی کے سر برآوردہ عمائد اور سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے- مرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھہ یہ عبارت رقم فرمائی :—

"فقیر اسداللہ خاں غالب کہتا ھے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ھوا ھے وہ میرا جی جانتا ھے - بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ھے" —

اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ نہایت خلیق ملنسار معاملہ فہم اور سلیم الطبع شخص تھے، روا داری اور بے تعصبی ان کا شعار تھا —

ایک بار کسی کمیٹی کی شرکت کے سلسلے میں ماسٹر صاحب کو دھلی سے لاھور جانے کا اتفاق ھوا۔ میجر فلر اس زمانے میں سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ ماسٹر صاحب میجر فلر سے ملنے گئے تو انھوں نے لفظ ایجاد کی تذکیر و تانیث کا سوال کیا۔ ماسٹر صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے دفتر میں ایک ایسا شخص موجود ھے جو زبان کا پورا ماھر ھے اور ایسے مسائل پر رائے دینے کا اھل ھے۔ چنانچہ آزاد بلائے گئے اور اُن سے وھی سوال کیا گیا۔ جواب سے میجر صاحب کا اطمینان ھوگیا اور مولانا آزاد کو بہت جلد ترقی مل گئی۔ خواجہ حالی مرحوم بھی لاھور بک ڈپو میں ماسٹر صاحب ھی کی سعی اور توسط سے پہنچے۔ اس کے علاوہ مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، مولوی امو جان ولی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد مولف فرھنگ آصفیہ، مرزا ارشد گورگانی وغیرہ کو لاھور میں لانے کے ماسٹر صاحب ھی باعث ھوے اور اس جماعت نے اُردو کی خدمت بڑی سرگرمی اور تن دھی سے کی اور اسی وقت سے پنجاب میں اُردو کا چرچا اور ذوق پیدا ھوا —

ماسٹر صاحب باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے علمی اور ادبی خدمت بھی کرتے رھے۔ چنانچہ ذیل کی چند کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے ھیں —

۱ — قصص ھند حصہ اول۔

۲ — قصص ھند حصہ سوم۔

۴ - رسوم ھند کا ابتدائی نصف حصہ -

۵ - تاریخ انگلستان (کلاں) -

۶ - دربار قیصری سنہ ۱۸۷۷ ع تالیف مسٹر وہلر کا ترجمہ -

۷ - رسالۂ اتالیق کے اکثر مضامین -

رسالۂ اتالیق پنجاب کے بھی اڈیٹر رھے - سنہ ۱۹۱۴ ع میں انتقال کیا * -

سری رام ایم - اے بھی کالج کے طالب علم تھے - پہلے سررشتہ تعلیم میں ملازم ھوے - اس کے بعد ریاست الور میں برسوں دیوان یا وزیر اعظم رھے - بہت منتظم اور نیک نام تھے —

حکم چند دھلی کے رھنے والے بڑے ذھین اور قابل طالب علموں میں سے تھے - امتحانات میں ھمیشہ اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کی - ایم - اے میں کلکتہ یونیورسٹی میں اول آے - حیدر آباد (دکن) میں ملازم ھوگئے تھے اور اعلیٰ خدمات پر فائز ھوے - قانون میں ان کی قابلیت مسلم تھی - ان کی تالیف Res Judicata نے بہت شہرت حاصل کی —

نند کشور بی - اے دلی کے رھنے والے تھے - پنجاب میں انسپکٹر مدارس کے عہدے سے پنشن لی - کیفی صاحب (پنڈت برجموھن دتاتریہ) فرماتے ھیں کہ مجھہ سے ملاقات تھی - کئی سال ھوے انتقال ھوگیا —

ماسٹر کدارناتھہ نے بھی دھلی کالج میں تعلیم پائی - گورمنٹ ھائی اسکول میں سکنڈ ماسٹر ھوگئے - راے صاحب کدارناتھہ سابق سشن جج نے بھی اسی کالج میں تعلیم پائی - بڑے عہدے پر پہنچے لیکن اس سے بڑھ کر ان کی سب سے بڑی اور قابل تعریف یادگار رامجس کالج ھے جو بڑی کامیابی سے

---

* ماسٹر صاحب مرحوم کے اکثر حالات ھمیں حضرت کیفی دھلوی سے معلوم ھوے —

چل رہا ھے - تعلیمی معاملات میں بڑی دل چسپی ھے۔ ھندو کالج ٹوٹتے ٹوٹتے انھیں کی بدولت بچ گیا -

پیر زادہ محمد حسین ایم - اے' (سیشن جج) اور خواجہ محمد شفیع ایم - اے (وظیفہ یاب جج سمال کاز کورٹ) دونوں اسی کالج کے متعلم ھیں۔ دونوں نے نام پایا - پیر زادہ صاحب کا ترجمہ سفر نامہ ابن بطوطہ بڑی قابل قدر چیز ھے۔ اس پر جو جا بجا انھوں نے نوٹ لکھے ھیں ان سے ان کی وسعت نظر اور علمی قابلیت کا اندازہ ھوتا ھے۔ خواجہ صاحب نے بھی متعدد کتابیں لکھی ھیں —

میر ناصر علی اڈیٹر صلاے عام بھی دلی کالج ھی کے طالب علم ھیں -

مدن گوپال (ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی) دھلی کالج ھی کے طالب علم تھے لیکن کالج ٹوٹنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے ایم - اے' کامیاب ھوے۔ الہ‌آباد کی سند وکالت (ھائی کورٹ) بھی حاصل کی۔ دھلی میں وکالت شروع کی - پھر ولایت سے بیرسٹر ھوکر آے اور لاھور میں وکالت کرنے لگے - اپنے وقت میں پنجاب کے سر برآوردہ وکیل سمجھے جاتے تھے - کئی قانونی کتابیں لکھیں Punjab Tenancy Act اور Revenue Act وغیرہ - پروفیسر جیوانز کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا - پنجاب یونیورسٹی کے قیام میں ڈاکٹر لائٹنر کے بڑے معین و معاون تھے —

ماسٹر جانکی پرشاد ذات کے برھمن تھے' بعد میں عیسائی ھوگئے اور ان کے نام کے ساتھہ ریورنڈ لکھا جاتا تھا۔ برسوں سینٹ سٹیفن ھائی اسکول دھلی میں ھیڈ ماسٹر رھے - لایق شخص تھے —

دھرم نراین (ابن بشن نراین) کالج کے نہایت قابل اور ذھین طلبہ میں سے تھے - پولیٹکل اکانومی (معاشیات) کا ترجمہ اردو میں کیا - کچھہ حصہ

تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا - دونوں کتابیں اسی زمانے میں سوسائٹی نے چھاپ دی تھیں —

شیونراین بھی کالج کے بہت ہونہار اور قابل طالب علموں میں سے تھے - تذکرۂ دیواس تھینیز (پلوٹارک) کا ترجمہ اردو میں کیا - ہندوستان کا ایک جغرافیہ اردو میں لکھا - ارنوٹ کے رسالۂ عام طبیعیات کا ترجمہ بشرکت سروپ نراین کیا -

مولوی کریم‌الدین بھی کالج کے طالب علم تھے - پانی‌پت کے رہنے والے تھے پھر دلی ہی میں بس گئے اور ایک مطبع قایم کرلیا - ان کی متعدد تالیفات ہیں جن میں سے بعض اب بھی مشہور ہیں - بہت جفاکش اور قابل شخص تھے اور مدرسہ کی تربیت اور تعلیم نے ان میں علمی ذوق اور تالیف کا شوق پیدا کردیا تھا - ان کی بعض تالیفات یہ ہیں -

۱ - تعلیم‌النساء لڑکیوں کی تعلیم پر جس میں آٹھ باب ہیں -

۲ - گلستان ہند (جس میں کئی باب ہیں - قصے، نصائح، منتخب اشعار وغیرہ) —

۳ - تذکرۂ شعراے ہند جس کا دوسرا نام طبقات شعراے ہند ہے - یہ گارساں دتاسی سے ماخوذ ہے - اس کی تالیف میں ڈاکٹر فیلن بھی شریک تھے - علاوہ ترجمہ کے انھوں نے مختلف تذکروں سے بھی حالات جمع کر کے اضافہ کئے -

۴ - گلدستہ نازنیناں - یہ شعراے ہند کے کلام کا انتخاب ہے -

۵ - تذکرۃ‌النسا - اس میں نامور عورتوں کے تذکرے ہیں -

۶ - ترجمۂ ابوالفدا - اول و دوم چہارم و پنجم جلد کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر سپرنگر کی فرمائش سے کیا -

۷ - تاریخ شعراے عرب سوسائٹی کے لئے لکھی اور سنہ ۱۸۴۷ء میں

طبع ہوئی —

ان کے علاوہ اور بھی کئی رسالے ان کی تالیف سے ہیں -

ان کے علاوہ پنڈت کاشی ناتھ ' آتما رام ' لچھمن داس وغیرہ کالج کے مشہور طلبہ میں سے تھے جن کا ذکر کالج کی رپوٹوں میں آتا ہے -

---

خاتمہ

یہ ہے مختصر روداد مرحوم دہلی کالج کی - کالج نہیں رہا مگر اس کا کام زندہ ہے - اردو زبان و ادب کے سنوار نے اور بنانے میں جو خدمت اس نے کی ہے وہ کبھی فراموش نہیں ہوسکتی - ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا بہت کچھ اثر ہے - یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی - ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا - اس وقت بھی یہی اعتراض کیا جاتا تھا جو اب کیا جاتا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مغربی علوم اور جدید سائنس کے بار کی متحمل ہوسکے - اس وقت یہ اعتراض بہت کچھ بجا تھا مگر ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری ' لکچروں کے ذریعے ' کتابیں ترجمے کر کر کے اپنا کام جاری رکھا اور جس اصول پر کام شروع کیا گیا تھا اسے صحیح ثابت کر کے دکھا دیا - وہ زبانیں جن کا آج دنیا میں طوطی بول رہا ہے اور جن کے خزانے علم و ادب سے معمور ہیں ان کی نسبت بھی چند صدی پہلے یہی کہا جاتا تھا جو آج ہماری زبانوں کے متعلق کہا جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ہر قسم کے خیالات

کے ادا کرنے کی قوت موجود ھے بشرطیکہ ادا کرنے کے لیے کوئی خیال بھی دل میں ھو اور بے لوث اور پر جوش کام کرنے والے بھی ھوں - ھمارے ملک میں دلی کالج اس کی سب سے پہلی اور کامیاب نظیر ھے جس کے بعد کسی دلیل و حجت اور تجربے کی ضرورت باقی نہیں رھتی - اور یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگھم قائم ھوا - ایک ھی چھت کے نیچے، ایک ھی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا - اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ھماری زبان اور ھماری سوسائٹی پر ھمیشہ رھے گا - اگر دلی کالج نہ ھوتا تو کیا ماسٹر رام چندر، مولانا آزاد، مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، ماسٹر پیارے لال جیسے لوگ پیدا ھو سکتے تھے ؟ یہ اگر دلی کالج میں نہ ھوتے تو کیا ھوتے ؟ اس میں قیاس دوڑانے کی بہت کچھ گنجائش ھے - لیکن میں اس کا بار آپ پر ڈالنا نہیں چاھتا اور خود انھیں میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کرتا ھوں - مولانا نذیر احمد ایک جگہ لکھتے ھیں کہ اگر میں دلی کالج میں داخل نہ ھوتا تو کیا ھوتا - وہ اپنے خاص انداز میں فرماتے ھیں کہ :

معلومات کی وسعت، راے کی آزادی، تالریشن (در گزر)، گورمنٹ کی سچی خیر خواھی، اجتہاد علی بصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے

عہدہ نتائج هیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی هیں اُن کو میں نے کالج هی میں سے سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا هوتا تو بتاؤں کیا هوتا - مولوی هوتا تنگ خیال ' متعصب ' اکھل کھرا ' اپنے نفس کے احتساب سے فارغ ' دوسروں کے عیوب کا متجسس ' بر خود غلط

ترک دنیا بمردم آموزند
خویشتن سیم و غلہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوست ' تقاضاے وقت کی طرف سے اندھا بہرا " صم " بکم " عمی " فہم لا یرجعون ما اصابنی من حسنۃ فی الدین او فی الدنیا فمن الکالج " —

یہ کالج اس جدید عہد میں هماری تہذیب و علم کی ترقی کے سلسلے میں ایک ایسی کڑی هے جو کبھی جدا نہیں هو سکتی - گو هم اپنی غفلت یا ناشکری سے اس کا نام بھلا دیں مگر اس کا کام نہیں بھلا سکتے - کیوں کہ اتنی مدت کے بعد بھی هم اُسی رستے کی طرف عود کررهے هیں جس پر وہ گام زن تھا - وهی طریقے اختیار کر رهے هیں جو اس نے کیے تھے اور انھیں اصولوں پر کار بند هورهے هیں جو اس نے قائم کیے تھے - گویا پوری ایک صدی کے بعد اس مرحوم نے جامعۂ عثمانیہ کی جون میں دوبارہ جنم لیا هے اور اس بھولی هوئی داستان کو پھر تازہ کردیا هے —

اب یہ ارباب جامعہ کا فرض هے کہ اس قدیم سنت کو زندہ رکھیں ' اپنی زبان کی جڑیں مضبوط کریں ' مغربی علوم کو اپنی زبان کے ذریعے سے پھیلائیں - جدید سے جدید علم کے پڑھانے اور تحقیقات کرنے کا

سامان بہم پہنچائیں - مشرقی زبانوں کی تعلیم صحیح اصولوں پر دیں تاکہ بجاے اس کے کہ ہم اپنی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ جائیں اہل یورپ ان کی تکمیل کی خاطر ہمارے پاس آئیں - نئی چیزوں اور نئے خیالات کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں - ہمارے پرانے طریقۂ تعلیم میں جو عیوب تھے وہ خارج کریں مگر اس کی خوبیوں کو رواج دیں تاکہ طلبہ میں علم کا سچا شوق اور تحقیق و تلاش کی لگن پیدا ہو - نہ اپنے اسلاف سے شرمندہ ہوں - اور نہ جدید علمی ترقی سے در ماندہ —

کلام چکبست پر ایک تنقیدی نظر

از

(جناب صغیر احمد صدیقی صاحب بی - اے)

تمہید

اقبال نے شاعر کو " دیدۂ بینائے قوم " قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح شاعر ساری قوم کا ہمدرد ہوتا ہے اسی طرح آنکھ کی ہمدردی سارے جسم سے ہوتی ہے - کوئی عضو " مبتلائے درد " ہو آنکھ ضرور آنسو بہائیگی - مگر یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے - حالی کا مقولہ شائد حقیقت سے زیادہ قریب ہے - وہ شاعر کو " قوم کی زبان " قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ قوم کے تمام جذبات و تاثرات کا صحیح ترجمان ہوتا ہے خواہ وہ غم و الم سے متعلق ہوں یا بہجت و مسرت سے - شاعر واقعی سوسائٹی کا کوئی عضو معطل نہیں ، وہ خوب جانتا ہے کہ انسانیت اس سے کیا مانگتی ہے ، اس کی قوم اس سے کس شے کی طلبگار ہے ، اس کی اپنی ہستی اس سے کیا چاہتی ہے - وہ اپنے موضوع شاعری سے خوب واقف ہوتا ہے جو انہیں جذبات و خیالات تک محدود نہیں ہوتا جو اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں - شاعر اپنے گردو پیش سے پوری طرح متاثر ہوتا ہے ، اپنے ماحول کے تغیر و تبدل کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے ، پیکار زندگی میں اس کے ہم قوموں کی نبرد آزمائیاں اس کی رجز خوانی کی محتاج ہوتی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان کی جادہ پیمائیاں اس کی حدی خوانی کی طلبگار- پھر وہ ان سب

سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے - وہ ایک ایسا مطرب ہے جو محفل میں رہ کر محفل کے لیے گاتا ہے اور پھر تحسین و ستائش سے بے پروا اور اس کا نغمہ گو اسی کے دل سے نکلتا ہے مگر شورش محفل سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور ساری محفل کے لیے " رہزن تمکین و ہوش "-

ہر سچا شاعر دنیا میں ایک خاص پیغام لے کر آتا ہے - اسی وجہ سے کہے گئے ہیں " شاعری جز ویست از پیغمبری " - اس پیغام سروش کا مفہوم وہ خاص تعلیم ہے جس کی تبلیغ شاعر اپنے کلام سے کرتا ہے جو اس کے تمام کلام میں جاری و ساری معلوم ہوتی ہے - شاعر اپنی قوم کا رہبر ہے لیکن اس کا کام صرف منزل مقصود کو بتا دینا اور اپنے دلکش ترانوں سے لوگوں میں جوش رہروی پیدا کرنا ہے - یہیں اس کی رہبری اور اس کی جد و جہد ختم ہو جاتی ہے - اس کے آگے پند و موعظت کا درجہ ہے جہاں شعریت کا فقدان ہو جاتا ہے جو شاعر کی حیثیت سے اگر فروتر نہیں تو بالکل جدا تو ضرور ہے - بہر حال ہر سچا شاعر دنیا میں ایک خاص پیغام لے کر آتا ہے - اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ اور ماحول کے نقطۂ نظر سے اس کا پیغام بے معنی اور بے محل نہ ہو - مثلاً اگر قوم کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہو ' قومی زندگی پر ایک سکتہ کی حالت یا جمود کی کیفیت طاری ہو اس وقت اگر کوئی شاعر بجائے درس عمل دینے کے ' بجائے قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کے جگانے اور قوم کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے کے عیش و مسرت کے ترانے گاے تو ہم اسے کبھی سچا شاعر نہیں کہہ سکتے - اس کے پہلو میں فطرت نے ایک حساس قلب نہیں ودیعت کیا ' اس کی شاعری انسانیت کے لیے ایک سبز باغ ہے جس کے پھولوں کے پس پردہ کانٹے ہیں جس کے پھلوں کی شیرینی اپنے اندر نہیں

معلوم کتنی تلخیاں رکھتی ہے —

ماحول

چکبست جس ماحول میں پیدا ہوے سیاسی ' اقتصادی اور مذہبی ہر حیثیت سے بہت شور انگیز تھا۔ جس زمانے میں انھوں نے ہوش سنبھالا ' اسے ہندوستان کا زمانۂ احیا کہنا بے جا نہ ہو گا ۔ سنہ ۱۹۰۸ ع سے آزادی کی جد و جہد صحیح معنوں میں شروع ہوجاتی ہے۔ قومی لیڈر میدان عمل میں اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف کار نظر آتے ہیں ۔ سنہ ۱۴ ع میں یورپ میں جنگ عظیم چھڑجاتی ہے اور اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج مترتب ہونے لگتے ہیں۔ سنہ ۱۹ ع سے ترک موالات کی تحریک زور پکڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ قومیت کا احساس اپنے ارتقائی منازل نہایت سرعت کے ساتھ طے کرتا ہے ۔ پان اسلامزم اور خلافت کی تحریک افراد کو علحدہ "ربط ملت" پر مائل کرتی ہے۔ معاشی ارتقا کے ساتھ سرمایہ و محنت کا تنازع شروع ہو جاتا ہے ۔ ڈیمقراطیت لوگوں کے خیالات میں جاری و ساری ہو جاتی ہے ۔ کانگریس اور مسلم لیگ قایم ہوجاتے ہیں۔ ملک کی اقتصادی اور اجتماعی حالت میں بڑی تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ پردہ کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کے متعلق مباحث چھڑ جاتے ہیں۔ ایک کافی تعداد ہندوستانی خوانین کی بر افگندہ نقاب ہو کر ملک کی فلاح و بہبودی کے لیے مردوں کے دوش بدوش مصروف کار ہو جاتی ہے۔ تعلیم نسوان کی نوعیت کے متعلق مخالف اور موافق جماعتیں قائم ہوجاتی ہیں ۔ جدید طرز معاشرت کے نقطۂ نظر سے ہیئت اجتماعی کی تہذیب کی کوشش کی جاتی ہے۔ آزادی رائے ایک حد تک حاصل ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں میں گئو رکشا کے لیے پوری سرگرمی دکھائی جاتی ہے ۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ افراد کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے ۔

فنون لطیفہ میں دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے - روحانیت و اصلیت کی طرف طبیعت کا رجحان ہوتا ہے - فطرت کی پرستش شروع ہو جاتی ہے - فن نقد کی ترقی کے ساتھہ علم و ادب کا معیار بلند ہو جاتا ہے —

ہندوستان کے سیاسی، اقتصادی اور علمی انقلاب کے ساتھہ اردو شاعری کی دنیا میں بھی بہت کچھہ تبدیلی واقع ہوتی ہے - آزاد کی کوششیں، کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں، بارور ثابت ہوتی ہیں - لوگ قدیم طرز شاعری سے اُکتا جاتے ہیں - پرانے فرسودہ مضامین میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی - زمانے اور ماحول کا اقتضا کچھہ اور ثابت ہوتا ہے جو قدیم طرز شاعری سے پورا نہیں ہو سکتا - حالی اور اسمعیل میرٹھی آزاد کی صدا پر لبیک کہتے ہیں اور اردو شاعری کا رخ ایک نئی شاہراہ کی طرف پھر جاتا ہے - غزل گوئی اردو شاعری کی مرادف نہیں رہ جاتی - طرح طرح کے موضوع پر نظمیں لکھی جاتی ہیں - اور نظموں کی تراکیب موضوع کے حسب حال بنائی جاتی ہیں - مفید اور بکار آمد مضامین کی طرف توجہ کی جاتی ہے - انگریزی نظموں کے ترجمے کئے جاتے ہیں - سادگی بیان کا لحاظ رکھا جاتا ہے - مناظر فطرت سے دلچسپی دکھائی جاتی ہے - جدت خیال اور مضمون آفرینی پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے - سطحی خیالات اور حسن و عشق کے پرانے توہمات سے لوگ گریز کرتے ہیں - فلسفہ و تصوف زیادہ مستقل اور منظم طریقے سے شاعری میں داخل ہو جاتے ہیں - رکیک و سخیف اور مبتذل مضامین چھوڑ دیے جاتے ہیں - غرض کہ وہ باتیں ظہور میں آتی ہیں جن کو جدید شاعری کی ایک شاندار ابتدا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے —

چکبست دنیا میں ایک حساس قلب، ایک دردمند دل لیکر آئے تھے انکی طبیعت زود اثر تھی - انکی ذکاوت حس بڑھی ہوئی تھی - ان پر ان

تمام انقلابات کا گہرا اثر پڑا جس کا انعکاس ان کے کلام میں موجود ہے۔
اُن کا موضوع شاعری ان کے زمانے اور ماحول کے اقتضا کے بموجب ہے۔ انکی
شاعری ان تمام قوتوں اور تحریکوں کی آئینه دار ہے جو ملک کے
هیجان و انتشار اور سوسائٹی کی تہذیب و ترتیب کا باعث هوئیں - جن
کا مقصد، جن کا منتہا، جن کا نصب العین قومیت و حریت کا حصول تھا۔
انہوں نے دیکھا که قدیم طرز شاعری ان کے خیالات و جذبات کا متحمل نہیں
هوسکتا اور نه پبلک کو اس سے دلچسپی پیدا هوگی جو نئے طرز شاعری سے
پیدا هو رهی هے مگر پرانی روش سے قطعی گریز کرنا نا ممکن تھا لہذا انہوں نے
قدیم و جدید طرز کو ملا کر ایک نیا طرز اپنے موضوع کے حسب
حال بنا لیا -

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے هیں عروس شعر کو هم قید سے آزاد کرتے هیں

هم آگے چل کر دیکھیں گے که بحیثیت شاعر انہوں نے اپنے ملک کو کیا
پیغام پہنچایا - اپنے زمانے اور ماحول سے کس حد تک متاثر هوے اور ملک
و قوم کی کیا خدمت کرسکے -

چکبست اور شعراے متقدمین

چکبست اُن شعرا میں سے تھے جنہیں " تلمیذ الرحمان "
کہا جاتا هے اور یوں بھی شاعری کی دنیا میں استادی
اور شاگردی کی رسم بے معنی هے کیونکه یہاں تو سب کچھه خداداد هے جو
بزور بازو حاصل نہیں هوسکتا - البته چکبست نے اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعه
ضرور کیا هے اور ان سے استفادہ کیا هے - جن میں سے غالب، آتش اور سب سے
زیادہ انیس کا رنگ نمایاں هے - زبان کی سادگی و صفائی، روز مرہ کا استعمال،
بندش الفاظ اور کلام میں کہیں کہیں قناعت و استغنا کی شان آتش کی
یاد دلاتی هے -

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنو کا نام ہے

کلفت دنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

مرد قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس پانوں پھیلاکر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں

چھٹکی ہوئی ہے گور غریباں پہ چاندنی ہے بیکسوں کو فکر چراغ مزار کیا

بہار گل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا جدھر اُٹھتی نظر کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا

اسکے علاوہ وہ نظم ملاحظہ ہو جس کا مطلع یہ ہے۔

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

علوے تخیل، فلسفیانہ زاویۂ نگاہ، فارسی کی لطیف تراکیب اکثر غالب کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

مٹانا تھا اسے بھی جذبۂ شوق فنا تجھکو
نشان قبر مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن میں
جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوے گلشن میں
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا
چاک ہوکر کفن غنچہ بنا جامۂ گل
کھل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا

کہیں کہیں دونو کے خیالات ایک ہی سمت پرواز کرتے ہیں۔

چکبست - کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے
وجود گل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا

غالب - ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہاں زانوے تامل در قفاے خندہ ہے

چکبست - عقل کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہے
دل کو مدت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

غالب - ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگئی رسم و رہ عام بہت ہے

چکبست - درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہوگئے

غالب - رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اس کے علاوہ چکبست نے کچھہ غزلیں غالب کی غزلوں پر لکھی ہیں -

سب سے زیادہ نمایاں رنگ میر انیس کا ہے جو چکبست کے تمام کلام پر چھایا ہوا ہے اور جہانتک کہ طرز بیان کا تعلق ہے چکبست انہیں کے مقلد ہیں - " راماین کا ایک سین " اور " جلوہ صبح " میں یہ رنگ زیادہ گہرا ہے چنانچہ پہلے انہیں کو پیش کیا جاتا ہے -

" راماین کا ایک سین " پڑھکر انیس کے مراثی کا وہ سماں پیش نظر ہو جاتا ہے جب شہداے کربلا رن کی رخصت لیتے ہیں - کلام میں وہی ترنم آمیز روانی ' تاثرات کا مد و جزر اور اس کے ساتھہ کلام کا اتار چڑھاؤ ' الفاظ کی وہی نشست اور وہی ترتیب ' جذبات کا تعمق اور وہ جملہ صفات جو انیس کے یہاں اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں اس نظم میں بھی پائی جاتی ہیں -

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال

دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے

گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ! نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ!

جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا

ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا

اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا

درد دل غریب جو حرف بیاں ہوا

خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

روکر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں

سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں

جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیجدوں!!

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر

رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا!!

پھول پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

چکبست کی نظم "جلوۂ صبح" انیس و دبیر کے صبح کے مناظر کی یاد دلاتی ہے۔ انیس کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ وہی فارسی کی خوبصورت تراکیب اور ترشے ہوئے الفاظ ان کے یہاں بھی ہیں۔ ان کا

تخیل صرف آفتاب و ماہتاب، روشنی و تاریکی میں الجھہ کر نہیں رہ جاتا، بلکہ صبح کے پر کیف و بو قلموں مناظر پر پوری طرح چھا جاتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انیس کو دبیر سے ممتاز کرتی ہے۔ چکبست نے دونوں باکمالوں کے طرز بیان کو یہاں ملایا ہے۔ شوکت الفاظ، مضمون آفرینی اور منظر نگاری تینوں کا اجتماع کیا ہے۔ مگر پھر بھی انیس کا رنگ اتنا غالب ہے کہ جگھہ جگھہ سے جھلکتا ہے —

چکبست :- جب رنگ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور
دبیر :- گویا کہ رنگ آئینہ سے دور ہو گیا
چکبست :- ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
انیس :- چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں
چکبست :- مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
انیس :- مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
چکبست :- ہنگام سحر باد سحر چلتی تھی پیہم
انیس :- چلنا نسیم صبح کے جھونکوں کا دمبدم
چکبست :- ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
انیس :- شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
چکبست :- ہر شاخ و شجر میں شجر طور کا نقشا
انیس :- سر سبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
چکبست :- تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
انیس :- سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

غرض کہ یہ بھی اسی خرمن کے بکھرے ہوئے دانے ہیں۔ ان امثلہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہو گی کہ چکبست انیس کے کلام سے کس حد تک متاثر

ہوے ہیں اور کہاں تک ان کی تقلید کی ہے - چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں -
چکبست اپنی بعض نظموں میں تمہید ویسی ہی لکھتے ہیں جیسی میر انیس
اپنے مراثی میں - " موقع عبرت " کی تمہید ملاحظہ ہو :—

ہاں نور ازل جلوۂ گفتار دکھادے　　　ہاں شمع زباں مطلع انوار دکھادے
ہاں طبع رواں قلزم رخسار دکھادے　　　ہاں رنگ سخن گلشن بیخار دکھادے
گلزار معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آئے

ہو حسن بیاں میں چمنستاں کا تجمل　　　ہر نکتہ رنگیں نظر آئے صفت گل
ہر معنیٔ پیچیدہ بنے طرۂ سنبل　　　عاشق ہوں سخن پر جو سنیں صورت بلبل
جو شعر ہو طوبیٰ کا وہ ثانی نظر آئے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آئے

اور میر انیس ایک مرثیہ کی تمہید یوں شروع کرتے ہیں :—

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملادوں　　　قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملادوں
ذرہ کی چمک مہر منور سے ملادوں　　　کانٹے کو نزاکت میں گل تر سے ملادوں
گلدستۂ معنی کو نئے رنگ سے باندھوں
ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اس کے علاوہ چکبست کی نظم " قوم کے سور ماؤں کو الوداع " میں
انیس کے رزمیہ کی شان پائی جاتی ہے :—

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں　　　کچھ نئی شان سے جانباز کُھن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوے شمشیر وکفن جاتے ہیں　　　تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

ظاہر ہے کہ چکبست نے تمہید کا یہ طریقہ اور رزمیہ کا یہ انداز انیس ہی کی تقلید میں اختیار کیا ہے —

زبان اور طرز بیان

خواجہ آتش اور میر انیس کے اثر سے ان کے کلام میں صفائی، سادگی اور ایک ترنم آمیز روانی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی بندش الفاظ بہت چست ہے۔ وہ اس معاملے میں آتش کے ہم نوا ہیں جن کے شعر کا حوالہ انہوں نے دیباچہ گلزار نسیم میں دیا ہے :—

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شوکت الفاظ جس کی تعریف وہ دیباچۂ گلزار نسیم میں کرتے ہیں ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ان کے الفاظ سادے اور شیریں ہوتے ہیں۔ فارسی کی وہی تراکیب جو نا مانوس نہیں چکبست کے کلام میں ملیں گی۔ فصاحت اُن کے کلام کا خاص جز ہے۔ وہ ہر موقع پر فصیح لفظ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً راماین کے ایک سین کے دو مصرع ملاحظہ ہوں :—

ع :— کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں

ع :— داماں داشت دامن مادر سے کم نہیں

مگر چکبست نے کہیں کہیں غریب الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسدس میں اکثر قوافی بھرتی کے لانے پڑتے ہیں اور قافیہ کی قید بلا سے فصاحت کا قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ چکبست بھی چند جگہوں پر اپنی چادر سے باہر پانوں نکالنے پر مجبور ہوجاتے ہیں —

ع :— کیا کہوں رنگ جوانی میں جو اس راغ کے تھے

ع :— جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر

ع :-　　وہ بیہوش ہوں کہ اک گوشہ ہے صحرائے عدم میرا

چکبست عموماً کلام کی اصلی ترتیب قائم رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اس کی مثالیں دینا غیر ضروری ہے۔ ان کے مراثی ' قومی نظمیں ' رامائن کا ایک سین ' قریب قریب تمام نظمیں اس صفت کی نمایاں طور پر مظہر ہیں۔ سوائے چند مقامات کے جہاں کلام میں تعقید پائی جاتی ہے۔ مثلاً " فریاد قوم " میں کہتے ہیں :-

ع :-　　جگہہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سر کی

بہت بھدے قسم کی تعقید ہے مگر چونکہ اکبر سے قافیہ ملانا تھا جس کا ذکر دوسرے مصرع میں لانا ضروری تھا اس لیے مجبوری تھی —

چکبست نے اپنے کلام میں روز مرہ اور محاورہ کا بھی التزام کیا ہے۔ اس کی مثالیں اکثر ملیں گی :-

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید　　اندھا کئے ہوے ہے زر و مال کی امید

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کردو　　فقیر قوم کے آے ہیں جھولیاں بھر دو

ذرا اثر نہ ہوا قوم کے جیبوں پر　　وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پر

دیکھنا ہیں حسن کے جلوے تو میخانے میں آ　　تیرے کعبہ میں تو بس واعظ خدا کا نام ہے

چکبست کبھی کبھی ایسے ہندی الفاظ بھی لاتے ہیں جو نا مانوس و غریب نہیں ہوتے :-

ع :　　ست جسے کہتے ہیں وہ آگ ہے دمساز ان کی

ع :　　قوم غافل نہیں ماتا تری غمخواری سے

ع :　　تو گرفتار سہی ہے تری شکتی آزاد

ع :　　زمیں ہند کی اگلے کی سورمبیر اپنے

چکبست کے کلام میں کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی

ہیں۔ مگر ایک شاعر کے کلام میں زبان کی غلطیوں کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہے۔ اردو تنقید کا وہ زمانہ قریب گذر گیا جب صرف زیر و زبر کی غلطیاں نکالنا اور زبان کی خوبیوں کی تعریف کرنا ایک نقاد کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اور نہ وہ شاعری اب رہ گئی ہے جو سوائے زبان کے ہیر پھیر کے کوئی غیر فانی عنصر اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ موجودہ شاعری کا موضوع اس کی زبان سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اب سب سے زیادہ قابل غور شاعر کے تخیلات ہیں۔ اس کی وہ قوت ہے جس سے وہ لوگوں کے جذبات پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس وہ کارنامے ہیں جو اسے پیغمبر کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں —

چکبست کا کلام سخافت و ابتذال سے بالکل مبرا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کی متانت و ثقاہت پائی جاتی ہے جو غالباً ان کے موضوع شاعری کی ممنون احسان ہے۔ ان کے کلام میں فصاحت کے ساتھ بلاغت بھی پائی جاتی ہے جس کا مفہوم اقتضائے حال کے بموجب ایراد کلام ہے مثلاً جب رام چندر جی ماں سے رخصت لینے کے لیے جاتے ہیں تو وہ بے قراری ظاہر کرتی ہیں اور اپنی بدنصیبی کا گلہ کرتی ہیں؛ اس وقت رام چندر جی انھیں جس انداز سے تلقین صبر کرتے ہیں بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انسانی نفسیات سے خوب واقف ہے۔ مصیبت پڑنے پر انسان اس کی تاویل یوں کر لیتا ہے کہ یہ مصلحت خداوندی ہے' شائد اسی میں کوئی صورت بہتری کی نکل آئے۔ تلقین صبر بھی اکثر یونہیں کرتے ہیں۔ یہ فطرت انسانی ہے۔ پھر جس طرح خزاں کے ساتھ بہار اور بہار کے ساتھ خزاں ہونا ضروری ہے اسی طرح رنج و خوشی بھی لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ پہلے

رام چندر جی بھی کہتے ہیں :—

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی		کچھہ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

پھر صبر کرنے اور صبر دلانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک وهی شخص دنیا میں مصیبت زدہ نہیں بلکہ سیکڑوں اس سے بھی زیادہ آفت رسیدہ ہیں اور سب اس کو برداشت کرتے ہیں - چنانچہ چکبست رام چندر جی کی زبان سے یہ بھی کہلواتے ہیں —

تم هی نہیں هو کشتۂ نیرنگ روزگار		ماتم‌کدہ میں دهر کے لاکھوں ہیں‌سوگوار

مصیبت سے پہلے گھبرانا نہیں چاهئے کیوں کہ صبر تو خود بخود آجاتا ہے - نہیں معلوم کتنی تکالیف اور مصیبتیں انسان پر پڑتی ہیں مگر یہ ایسا سخت جان ہے کہ رو پیٹ کر جھیل جاتا ہے - رام چندر جی بھی یہی کہتے ہیں :—

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار		کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار

صبر اور تلقین صبر کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ مصیبت سے نجات ملنے کے بعد کی کیفیت پر غور کرے اور اسی ڈھارس اور اُمید میں مصیبت کا زمانہ گذار دے کہ اس کے بعد جو راحت ملے گی اس کا نعم البدل ہوگی - یہ بھی فطرت انسانی کا ایک خاص نکتہ ہے - چنانچہ کہتے ہیں :—

اور آپ کوتوکچھہ بھی‌نہیں رنج کا مقام		بعد سفر وطن میں هم آئیں گے شاد کام

هوتے ہیں‌بات کرنے میں چودہ برس‌تمام		قائم اُمید هی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

رام چندر جی یہ سب کچھہ کہتے ہیں مگر اس خیال سے کہ ماں کو جدائی کے غم کے ساتھہ اس بات کا بھی انتشار ہوگا کہ معلوم نہیں مجھہ پر صحرا میں کیا گذرے' جنگل کی زندگی کی تعریف کرتے ہیں اور

بتاتے ہیں کہ خدا ہر حال میں بندوں کی خبر رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس تعریف کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں کہ :—

ع: داماں دشت دامن مادر سے کم نہیں

چکبست نے اس تقریر کا جو اثر ماں کے اوپر دکھایا ہے کس قدر اقتضاے حال کے موافق ہے۔ کہتے ہیں :—

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر ہنس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر

مصرع ثانی میں "لڑکے" کی جگہ "بیٹے" کا لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا مگر یہاں جو بلاغت لفظ "لڑکے" نے پیدا کی ہے وہ لفظ "بیٹے" سے ناممکن تھی :—

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیاں

یہ شعر کس قدر بلیغ ہے۔ ماں یہ سب جانتی ہے مگر مامتا کی آنچ بری ہوتی ہے اس لئے ملول و رنجیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے کی ناصحانہ تقریر کو "داستاں" سے تعبیر کرتی ہے ۔ دوسرے مصرع کی بلاغت محتاج بیان نہیں ۔ فطرت انسانی کا ادا اور صورت حال کا اقتضا یہی تھا اور شاعر نے اسے نظر انداز نہیں کیا ۔ "لاکھوں برس کی عمر ہو" میں ایک خاص لہجہ ہے ۔ ایک خاص بزرگی کی شان ہے —

"فریاد قوم" میں ہندوؤں میں جذبۂ عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، افریقہ میں قوم کی بے آبروی پر غیرت دلاتے ہیں ، ان کی غفلت پر ملامت کرتے ہیں اور ان کو کام کرنے کے لیے ابھارتے ہیں اور آخر میں یہ کہتے ہیں —

مگر وہ کیا ہیں کسی کی بھی گر نہو امداد
اثر دکھائے کی جادو کا قوم کی فریاد
اٹھیں گے خاک کے تودوں سے دستگیر اپنے
زمین ہند کی اگلے گی سور بیر اپنے

تمام لعن طعن کے بعد ہندوؤں کی امداد کی طرف سے یہ استغنا اور یہ دکھانا کہ قوم انکی محتاج نہیں بلکہ زمین ہند اپنے ہیرو کو دوبارہ پیدا کرے گی کس قدر بلیغ ہے —

صنائع و بدائع تشبیہات واستعارات چکبست کے کلام میں صنائع و بدائع بھی ہیں مگر جہاں کہیں ہیں بالکل غیر اختیاری طور پر اور تصنع سے پاک - تشبیہات و استعارات شاعری کی جان ہیں اور ان کے کلام میں ان کی بہت لطیف مثالیں ملتی ہیں - انہوں نے صرف پرانی فرسودہ تشبیہات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں جدت پیدا کی ہے اور بعض تو بالکل نئے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں - مثلاً سیر دھرہ دوں میں فرماتے ہیں -

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ کھڑے ہیں کوہ وشجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں یہ سنتری انہیں جھک کے سلام کرتے ہیں

" سیر دھرہ دوں " میں پہاڑوں کے متعلق لکھتے ہیں —

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا یہ بل زمین کی تیوری پہ آگیا کیسا

مسز بسنت کی مدح میں کہتے ہیں - ع :

ترے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن

آصف الدولہ کے امام باڑہ کی تعریف میں لکھتے ہیں :

بے خودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیوں کر
کسی استاد مصور کا ہے یہ جلوۂ خواب

جدید رنگ شاعری کتنا نمایاں ہے۔ یہ سب انگریزی ادب کا اثر ہے۔ پھر کہتے ہیں۔ ع :

ایسے عالم میں وہ کُہرے سے اُبھرنا اس کا
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

تشبیہ جتنی بعید و غریب ہو اتنی ہی بلیغ ہوتی ہے۔ اس قسم کی اکثر تشبیہات چکبست کے کلام میں موجود ہیں۔ جو تشبیہات محسوسات کی ہوتی ہیں اور متحرک کیفیات سے متعلق ہوتی ہیں ان کی تعریف خاص طور پر مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں کی ہے۔ چکبست کے یہاں بھی اس قسم کی تشبیہات پائی جاتی ہیں —

نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا — سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا
یاں چاندنی دکھاتی ہے امید کی جھلک — دریا کی لہر دل ہے کسی بے قرار کا

اس کے علاوہ اور بہت سی تشبیہات ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں جن میں سے چند یہاں بغیر کسی انتخاب کے پیش کی جاتی ہیں —

عالم یہ ہے خوشی میں دل داغدار کا — پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
دل میں اس طرح سے ارماں ہیں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی
آنکھ کہتی ہے یہ بادل ہیں کالے کالے — بال کھولے ہوے ہیں سانولی صورت والے
دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
فروغِ حسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں — شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسار نازک سے

چکبست کے ابتدائی کلام میں بعض تشبیہات بہت طول طویل ملتی ہیں مثلاً مہادیو گووند رانا ڈے کے مرنے سے جو افتاد قوم پر پڑی ہے اس کی تشبیہ کئی بندوں میں دیتے ہیں جو رومانیت سے مملو ہیں۔ پہلا بند یہ ہے —

کشتی ہو جیسے کوئی تلاطم میں مبتلا　　اور جوش میں ہو موجہ و گرداب جابجا
ہو ابر و باد و برق سے طوفان اک بپا　　تاریک شب کی سر پہ ہو چھائی ہوئی بلا
برپا ہو شور رعد موافق ہوا نہ ہو
اور ساحل مراد کا کوسوں پتا نہ ہو

حسن التعلیل :-

کیا کونپلیں دکھاتی ہے عالم اُبھار کا　　آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا
طلوع صبح کیا ہے مرثیہ ہے رونق شب کا　　ازاے رنگ رخ مہتاب کا نور سحر ہوکر
سبزہ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر　　سر اٹھانے کی جگہہ گلشن ایجاد نہیں
شب کو بہار پردۂ شبنم میں رو گئی　　انجام سوچ کر چمن روزگار کا
حسن کی دولت سے تھے گلہاے نورس بےخبر　　دیکھکر رنگ چمن کانٹے نگہباں ہوگئے
پردۂ خاک سے دل جام بکف نکلا ہے　　مے کی تاثیر سے کچھ کم نہیں تاثیر بہار

مراعات النظیر

چکبست کے کلام میں رعایات لفظی کی بڑی مثالیں ہیں مگر یہ صنعت ان کے کلام میں بالکل ثانوی حیثیت رکھتی ہے - وہ الفاظ کے چکر میں پڑکر معانی کو گرفت سے نہیں جانے دیتے —

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پر فن میں
کہ زیور ہو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں

سدھاری منزل ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تن خاکی کو شاید روح نے گرد سفر جانا

ہے تڑپتا کون دل جینے سے کس کا سیر ہے
بال کس نے لاش پر کھولے یہ کیا اندھیر ہے

اس کے علاوہ " مرقع عبرت " کی تمہید ملاحظہ ہو —

ایہام
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

طباق
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

تضاد
نیند میں ہو کا سماں عالم ہشیاری کا
خواب دیکھیں گے یہاں قوم کی بیداری کا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوے گلشن میں

جلادی دل کو مورے قلب دشمن کی سیاہی نے
کدورت واں بڑھی اور یاں کھلے جوہر صفائی کے

تلمیح
چکبست نے ہندوستان کے عہد ماضی کی اساطیر کی طرف مراجعت کی ہے۔ یہ بھی ان کی ایک امتیازی صفت ہے۔ انھوں نے صرف پرانی فرسودہ تلمیحات پر اکتفا نہیں کیا۔ لیلی و مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے عہد ماضی کی روایات اور تواریخ کے خاص خاص افراد کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے —

جہاں میں بھیشم وار جن کا نام توپے کا
متے کی قوم یہ بیڑا تھام توپے کا

روح پرتاپ کی جنت میں نہ شرمندہ ہو
قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو

سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو

سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو

منظر نگاری
چکبست کی صرف تین نظمیں ایسی ہیں جن میں صحیح معنوں میں منظر نگاری کی گئی ہے " جلوہ صبح " " کشمیر" اور " سیر دھرہ دوں "۔ " جلوہ صبح " میں جیسا کہ لکھا جا چکا ہے انھوں

نے انیس کی تقلید کی ہے۔ ان کا تخیل صرف آفتاب و ماہتاب کی روشنی و تاریکی میں الجھہ کر نہیں رہ جاتا بلکہ صبح کے تمام بوقلموں مناظر پر پوری طرح چھا جاتا ہے۔ اس نظم کی منظر نگاری بالکل تخیلی ہے۔ اس کے عناصر قریب قریب وہی ہیں جو انیس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مناظر میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ یہ مختلف دلفریب و رنگین صبحوں کے ارتسامات ہیں جن کو شاعر نے اپنے تخیل سے یکجا کیا ہے۔ اس نظم کی رنگینی اس لطافت کی محتاج ہے جسے ایک چابکدست مصور ہی کا موے قلم پیدا کرسکتا ہے۔ اقبال کی ایک نظم " کنار راوی " یوں شروع ہوتی ہے —

(ع) سکوت شام میں محو سرود ہے راوی

صرف ایک مصرع ہے لیکن اس میں تاثرات کی ایک دنیا مضمر ہے۔ الفاظ اور ان کی نشست کس قدر ترنم آمیز ہے۔ محاکات کتنی مکمل ہے، شام کا دھندھلکا چھا رہا ہے، شفق کا رنگ پھیکا پڑ چکا ہے، کچھہ ستارے آسمان پر جھلملا رہے ہیں، گرد و پیش ایک مرعوب کرلینے والی خاموشی میں ملفوف ہے۔ دریاے راوی نہایت نرم روی سے بہہ رہی ہے اور سطح کی ننھی ننھی لہروں کا تصادم کچھہ مبہم سا ترنم پیدا کر رہا ہے۔ شاعر اس منظر کو خاموشی سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے —

(ع) سکوت شام میں محو سرود ہے راوی

تمام الفاظ اس قدر پر ایہام ہیں کہ وہ پڑھنے والے کے تخیل کو مجبور کرتے ہیں کہ اس منظر کو پیش کرے۔ یہی کیفیت محاکات کی اصلی شان ہے جو " جلوہ صبح " میں مفقود ہے جس میں پڑھنے والے کی توجہ تمام تر زور تخیل کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خود مناظر کی طرف مبذول نہیں ہوتی —

دوسری نظم "کشمیر" میں جو "مرقع عبرت" کا ایک حصہ ہے انھوں نے زیادہ کامیاب منظر نگاری کی ہے۔ مقامی رنگ نے اس نظم میں جان ڈال دی ہے۔ اور انفرادیت پیدا کردی ہے جو ایک منظر کو دوسرے سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ اس نظم میں محاکات نسبتاً زیادہ مکمل ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی:—

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا   چشموں سے پہاڑوں کے وہ اُڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا   ڈل کا وہ سر شام ادھر کروٹیں لینا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا منارہ بھی چمکتا نظر آنا

جزئیات کا بیان منظر میں کس قدر اصلیت پیدا کردیتا ہے۔ شاعر کے تخیل کی پرواز اس کو مناظر کے حدود سے باہر نہیں لے جاتی۔ تصنع کے نہ ہونے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منظر کا عکس لے لیا ہے—

پھر کہتے ہیں:—

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے   بکھرے ہوے وہ دامن کہسار پہ لالے
اُڑتے ہوے بالاے ہوا برف کے جھالے   دیکھے جوکوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے لکوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں

یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری مصوری کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ تصویر کتنی متحرک ہے اور کتنی دلکش۔ اس بند میں شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی ہے جس کی مثال ایک رنگین شیشے کی ہے جو چشم تماشا کے سامنے منظر کو اپنے رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے بلکہ سادہ الفاظ ہیں جن کی مثال ایک بالکل شفاف اور بیرنگ شیشے

کی ہے جو منظر کو ہو بہو اپنے اصلی رنگ میں دکھاتا ہے—

اس نظم میں رومانیت کی بھی جھلک ہے جو تیسری نظم "سیر دیرہ دون" میں مکمل طور پر پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں:—

نکلے نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے   آتی ہے جو آواز ترنم لب جو سے

ہم دیکھ چکے ہیں کہ چکبست کی نظم "جلوۂ صبح" زور تخیل، شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ دوسری نظم "کشمیر" میں یہ عناصر نسبتاً کم ہیں اور سادگی بیان و محاکات اسی قدر زیادہ جس کے ساتھ مقامی رنگ اور اس کے پہلو بہ پہلو انفرادیت مل کر اس کی منظر نگاری کو زیادہ مکمل بنا دیتے ہیں۔ رومانیت کی ابتدا "کشمیر" میں پائی جاتی ہے۔ خارجی رنگ دونوں میں ہے مگر "جلوۂ صبح" میں زیادہ گہرا ہے اور "کشمیر" میں نسبتاً کم۔ تیسری نظم "سیر دیرہ دون" میں تخیل، محاکات، داخلی رنگ، مقامی رنگ، انفرادیت اور رومانیت مل کر چکبست کو ان کی منظر نگاری کے معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ اس نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ شاعر جن ارتسامات کو پیش کرتا ہے اُس کے ساتھ اس کا اپنا تاثر و تکیف بالکل مدغم ہو جاتا ہے۔ اسی امتزاج کا نتیجہ وہ شعریت ہے جو اس نظم کی امتیازی صفت ہے۔ ان مصرعوں کی شعریت ملاحظہ ہو:—

ع: یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون

ع: بجائے خاک کے اُڑتا ہے رنگ سبزہ کا

ع: ٹھیر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

لطیف تشبیہات و استعارات اس نظم میں عجیب گل کاری کرتے ہیں:—

ازل میں تھی جو فضا اُس کی یادگار ہے یہ نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلووں میں صف بستہ
ق
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں یہ سنتری اُنھیں پہلے سلام کرتے ہیں
بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھاگیا کیسا یہ بل زمین کی تیوری پر آگیا کیسا
نگاہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

جدت یہ رنگ شاعری کتنا نمایاں ہے:—

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سہاتی ہے بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

شاعر اپنے کو فطرت کے اس اچھوتے خلوتکدے میں اس "حریم خاص میں" علایق دنیوی سے ماوراء اور لوازمات انسانی سے دور پاتا ہے:—

بس ایک عالم ہو، چار سمت طاری ہے نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

دوسرا مصرع گرے کے مشہور عالم مرثیہ کا یہ مصرعہ یاد دلاتا ہے—

Far from the madding crowds ignoble strife.

یہ وہ جگہ ہے جہاں مطربۂ فطرت ہنگامۂ دنیا سے دور اپنے خاموش ترانے بلند کرتی ہے۔ وہ ترانے جو سامعہ نواز نہیں بلکہ دلنواز ہیں۔ یہاں کا سکوت موسیقی سے معمور ہے وہ موسیقی جو ساز سے نا آشنا مگر سوز سے بیگانہ نہیں:—

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

شاعر کی روح فطرت کے اس نغمۂ سرمدی کو سنتی ہے اور اس کی ہم نوا ہو جانا چاہتی ہے—

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور نے ہو کر
ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں لے ہو کر

ورڈس ورتھہ کی طرح چکبست بھی فطرت کو انسان سے جدا نہیں تصور کرتے۔ سب ایک ھی "ھستی بیدار" کے کرشمے ھیں جو کائنات کے مظاھر و آثار' فطرت کے مناظر اور انسان و حیوان میں جاری و ساری ھیں —

درخت و کوہ ھیں کیا ذات پاک انساں کیا
طیور کیا ھیں ھوا کیا ھے ابر و باراں کیا
یہ دل کے ٹکڑے ھیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ھیں کوئی غیر نہیں

آبشار سے اپنی ھستی کا موازنہ یوں کرتے ھیں —

ھے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ھے
جو روح ھم میں ھے اس میں وھی روانی ھے

اقبال نے اپنی نظم " جگنو " میں اسی خیال کو اس بہتر پیرایہ میں بیان کیا ھے —

حسن ازل کی پیدا ھر چیز میں جھلک ھے انساں میں وہ سخن ھے غنچے میں وہ چٹک ھے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ھیں ورنہ نغمہ ھے بوے بلبل بو پھول کی چہک ھے
کثرت میں ھوگیا ھے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ھے وہ پھول میں مہک ھے

یہ اختلاف پھر کیوں ھنگاموں کا محل ھو
ھر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیء ازل ھو

غرض کہ چکبست کی یہ نظم منظر نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ھے۔ اور جس شعر پر اس منظر کو ختم کیا ھے وہ ان کے کیف و بیخودی کی انتہا ھے اور اس نظم کی شعریت پر مہر صداقت —

اجل جو آے تو اس کوھسار کے نیچے بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

فلسفۂ زندگی

میتھو آرنلڈ نے شاعری کو تنقید حیات قرار دیا ہے۔ شاعر حیات اور مظاہر حیات کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اپنے کلام میں پیش کرتا ہے اور اسے ترتیب دے کر ہم اس کا فلسفۂ حیات اخذ کرتے ہیں۔ شاعر اور فلسفی میں دل و دماغ کا فرق ہوتا ہے۔ شاعر جو چیز جذباتی وجدان سے حاصل کرتا ہے فلسفی اسے عقلی وجدان سے، مگر شاعر کا نظریہ زود اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام پر بہت جلد تسلط حاصل کرلیتا ہے۔ بر خلاف اس کے فلسفی کا نظریہ خاص پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق یکسر فہم و ادراک، تفکر و تدبر سے ہوتا ہے۔ فلسفی سمجھتا ہے اور سمجھاتا ہے مگر شاعر محسوس کرتا ہے اور دوسروں کو محسوس کراتا ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ جو سمجھ میں آے محسوس نہ ہو مگر ایسا زیادہ ہوتا ہے کہ محسوس ہو اور سمجھ سے باہر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اکثر ان رموز حیات کی بھی عقدہ کشائی کرتا ہے جو فلسفی کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔

متقدمین شعراے اردو نے شاعری کے اس پہلو کو تقریباً نظر انداز کردیا۔ وہ عموماً غزل اور قصیدے میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے خیالات میں اتنا تناقص ہے کہ ان سے کوئی فلسفۂ حیات مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی غزل میں اکثر دو متضاد خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چونکہ چکبست نے غزلیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس لیے پرانی روش کے زیر اثر ربط فکر نہ قائم رکھ سکے۔ دوسرے اس صنف سخن میں غزل مسلسل کے سوا ارتباط خیال ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلیات میں ان کا تفلسف باہم کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ مگر چونکہ چکبست قدیم و جدید روش کے نقطۂ اتصال پر تھے اس لیے ادب انگریزی

اور جدید طرز شاعری کے اثر سے ان کے خیالات میں نسبتاً زیادہ تطابق ہے جس سے ان کا فلسفۂ حیات اخذ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں لاحق ہوتی - یہی نظریہ مع اپنے تمام لواحق کے ان کے سارے کلام کو متاثر کرتا ہے —

چکبست کی تعلیم اخلاق ان کے فلسفۂ زندگی سے اس قدر پیوستہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا - محض آسانیء تفہیم کے لیے عنوان جدا کر کے تفریق کرلی گئی ہے —

ان کا ایک مشہور شعر ہے —

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ شعر ان کے ابتدائی کلام کا ہے - اس کو ان کے فلسفۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں جو چکبست کا مذہب ہے - زندگی اور موت کو صرف عناصر کے ترتیب و انتشار سے تعبیر کرنا ایک ماہر حیاتیات کا کام تو ہو سکتا ہے مگر ایک شاعر کا نہیں - اس کا نظریہ کچھ اور ہے وہ زندگی اور موت کو کہیں زیادہ اہم نگاہوں سے دیکھتا ہے —

زندگی تلخی ایام کا افسانہ ہے زہر بھرنے کے لیے عمر کا پیمانہ ہے

چکبست کے فلسفۂ حیات میں ایک خاص چیز ان کا مسئلۂ تقدیر ہے - قدیم شعرائے اردو نے مسئلۂ تقدیر کو جس صورت میں پیش کیا ہے چکبست نے اسے بالکل الٹ دیا - یہیں آکر ان کی رجائیت جسے افسردگی کہنا زیادہ بہتر ہوگا غالب آجاتی ہے - وہ انسان کو فاعل مختار قرار دیتے ہیں اور زندگی کو ایک سلسلہ سمجھتے ہیں اعمال اور ان کے نتائج کا - تقدیر اور گردش لیل و نہار محض اعتباری چیزیں ہیں —

اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

یہ خود انسان کے اپنے افعال ہیں جو اس کی بربادی کا باعث بنتے ہیں ورنہ فطرت کو کسی سے پرخاش نہیں - اس کے لیے سب یکساں ہیں - لہذا گردش لیل و نہار کا گلہ بیکار ہے کہ یہ اپنی کمزوری کے اعتراف کا ایک بے جا طریقہ ہے - اگر انسان میں ہمت ہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے —

نہ دشمن ہے زمیں میری نہ دشمن آسماں میرا — تہ و بالا کیا ہے گردش اعمال نے مجھ کو

ہم کوستے ہیں گردش لیل و نہار کو — خود ہی مٹا کے جوہر ایمان و آبرو

بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے — اہل ہمت منزل مقصود تک آ بھی گئے

چکبست کی شاعری تمام تر درس عمل ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اعمال پر اتنا زور دیتے ہیں اور تقدیر کو بے معنی قرار دیتے ہیں - ورنہ ظاہر ہے کہ حالات اور مواقع بھی بہت کچھ انسان کی کامیابی و ناکامی کے باعث ہوتے ہیں - پھر تناسخ کا ماننے والا کبھی جبری نہیں ہو سکتا - کیونکہ جن حالات کی ناموافقت سے ہم اپنی ناکامی کو منسوب کریں گے ان کو وہ گذشتہ زندگی کے اعمال قبیحہ کے نتائج قرار دے گا' اور چکبست بھی تناسخ کے قائل ہیں —

فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا — عروس جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے

اسیری کے لیے نیا قالب بسائےگی — نکل کر اپنے قالب سے ہم روح کو آزاد کرتے ہیں

چکبست کا فلسفۂ محبت ان کے فلسفۂ حیات کا ایک خاص جز ہے - قدیم شعرائے اردو اکثر محبت کی برائی کرتے ہیں اور اگر تعریف بھی کرتے ہیں تو یوں کہ عشق کی دو قسمیں بتاتے ہیں ایک عشق مجازی اور ایک عشق حقیقی - عشق حقیقی کو قابل احترام جذبہ قرار دیتے ہیں اور عشق مجازی کو ایک آفت ناگہانی بلکہ " سیلاب بلا " سے تعبیر کرتے ہیں -

چکبست نے محبت کو صرف ایک جذبہ قرار دیا ہے اور اسے انسانی صفات کا جوہر بتایا ہے —

دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے　　　خاک کے پتلے اسی جوہر سے انسان ہو گئے

وہ بھی مغربی شعرا کی طرح محبت کو حیات انسانی کی ابتدا اور انتہا قرار دیتے ہیں —

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا　　　نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

موت انسان کو فنا نہیں کر سکتی اور یہی ایک جذبہ محبت کا انسان کے بقاے دوام کا باعث ہو سکتا ہے —

مرد میدان محبت زندۂ جاوید ہیں　　　موت آ جانے سے تو انسان مر جاتا نہیں

چکبست نیرنگیٔ عالم اور بے ثباتیٔ عالم سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور یہاں جو ان کے مزاج میں ایک قسم کی قنوطیت ہے جو غالباً شعراے متقدمین کا اثر ہے اپنی جھلک دکھاے بغیر نہیں رہتی -

زندگی کا چکر بڑی عجیب چکر ہے - ایک کی موت دوسرے کی زندگی ہے - خزاں کی رخصت بہار کی آمد آمد ہے - اور بہار کا خاتمہ خزاں کی تمہید - دریا کی بقا قطرے کے فنا ہو جانے میں ہے اور غنچوں کی موت بھی کھا کیا گل کہلاتی ہے —

کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے
وجود گل جسے سمجھے ہیں سب وہ ہے عدم میرا

دیکھنا نیرنگ سازیٔ طلسم نو بہار
پیرہن کلیوں کے پھولوں کے گریباں ہو گئے

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات محض ایک تماشا گاہ ہے جہاں فطرت ایک لاعبانہ انداز سے اپنا دست تطاول دراز کرتی رہتی ہے تو

انسان کے وجود کی کیا ضرورت تھی جس میں رنج و غم اور تکالیف کے محسوس کرنے کی اتنی قوت ہے —

اگر کون و مکاں اک شعبدہ ہے اس کی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لیے آیا قدم میرا

یہ وہی پرانا سوال آفرینش انسان کی علت غائی کا ہے اور چکبست یہاں صرف سوال کرکے چھوڑ دیتے ہیں۔ زندگی کی خواہش راز ہستی ہے ورنہ موت آسان ہے اور رنج و غم کا مزا تلخ —

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

حیات بعدالممات کے متعلق کہتے ہیں :-

سنتے ہیں روح گھری رہتی ہے ارمانوں سے
مر کے بھی چین کی صورت دل نا شاد نہیں

ذوق کا مشہور شعر ہے -

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جب وہ اپنی افسردگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں -

ختم ہوتا نہیں کیوں ہستیء ناشاد کا راگ پا بہ گل جسم سہی روح تو مجبور نہیں

جب ان کی قنوطیت ان کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ رنج و غم ابتہاج و مسرت محض اپنے احساسات کا نام ہے -

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی اس گلشن جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

مگر ان کی قنوطیت صرف اپنے خیالات تک محدود رہتی ہے، وہ اس کی تعلیم نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ نتیجہ ہے جذبات کے موسمی اضمحلال

کا جس سے کسی کو مفر نہیں - جب کام کا وقت آتا ہے ، تعلیم اخلاق اور درس عمل دینا ہوتا ہے تو ان کی رجائیت عود کر آتی ہے اور خیالات کا یہ تشائم بالکل دور ہو جاتا ہے - ان کی قنوطیت بے وجہ نہیں ہے یہ لازمی تھا کہ ان کے زمانے کی سیاسی فضا اور ان کی مرثیہ گوئی ان کے خیالات پر یہ رنگ بھی چڑھادے جسے ہم آگے چل کر زیادہ واضح کریں گے —

اخلاقیات

لکھا جا چکا ہے کہ پند و موعظت ، رشد و ہدایت شاعر کا فرض نہیں ؛ مگر ہر ملک کے شعرا نے زمانہ اور ماحول کے اقتضا کے بموجب اس اصول میں تبدیلی کی ہے - پھر نصیحت کے بھی کئی طریقے ہیں مثلاً غالب کا شعر ہے —

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　نہ کہو گر برا کرے کوئی

کس قدر بے کیف شعر ہے اگر اسے شعر کہا جا سکتا ہے - معمولی سے معمولی فہم و ادراک کا آدمی بھی اسے جانتا ہے - صرف عمل کرنے نہ کرنے کی بات ہے اور " نہ کہو " " نہ سنو " ایسے خوشگوار الفاظ نہیں کہ وہ لوگوں کو ادھر مائل کر سکیں - دنیا کے بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبر اس کی تلقین کر چکے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتنوں نے اس پر عمل کیا اور کتنے کریں گے - اب اگر غالب کے ان دو مصرعوں کا کسی پر کوئی خاص اثر پڑ سکے تو اسے شاعری کا سب سے بڑا معجزہ قرار دینا چاہئیے - واعظ اور شاعر میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ واعظ اپنی نصیحت کھلم کھلا کرتا ہے اور شاعر شعریت کے پس پردہ - یہ صفت شاعر کی ذات سے اتنی وابستہ ہے کہ اس کے عدم وجود میں وہ کم از کم شاعر نہیں کہا جا سکتا - چکبست اسی شعریت کے پردہ میں اخلاقی تعلیم دیتے

ہیں۔ ان کے کلام میں یہ پردہ کہیں کہیں سے چاک ہو جاتا ہے ' مگر اس کا کیا علاج کہ جس ماحول میں وہ پیدا ہوے اخلاق کے اعتبار سے اصلاح کا محتاج تھا - جس کے بغیر قومی ترقی ناممکن تھی۔ بڑے بڑے مصلحین قوم سوسائٹی کی اخلاقی حالت درست کرنے میں منہمک تھے - پھر ایک شاعر جو قوم کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہے ان سب باتوں سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے - اس کے علاوہ داخلی شاعری لازمی طور پر شاعر کی فطرت کو بے نقاب کر دیتی ہے - پروفیسر ڈیوڈ میسن انگریزی شاعر شیلی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ شیشے کے مکان میں رہتا تھا پتھر کے مکان میں نہیں - یعنی اس کی شاعری ایک شفاف شیشہ ہے جس کے ذریعے سے ہم اس کی فطرت کو عریاں دیکھتے ہیں۔ یہیں وہ موقع ہوتا ہے جہاں شاعر بلا کسی پند و نصیحت کے بالکل غیر محسوس طریقے پر اخلاق کی تعلیم دیتا ہے - اور اس تعلیم کی نوعیت منحصر ہوتی ہے خود اس کی فطرت و افتاد طبیعت پر - مثال کے لیے غالب ہی کا شعر لیجئے -

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

حضرت نیاز فتحپوری " شہاب کی سرگذشت " میں لکھتے ہیں " کس قدر مرتفع سطح پر پہنچ کر غالب نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے - عام شعرا کے کلام سے یہ ایسا ہی ممتاز ہے جیسے رات کو آسمان کی بلندی میں چکور کی آواز زمین کے دوسرے طیور کی نغمہ سرائی سے ' جواہر طرف کلہ ' محسوس چیز ہے لیکن اس پر اعتماد نظر' حسن کی رسوائی ہے - ' اوج طالع لعل و گہر ' غیر محسوس ہے لیکن ' ذہنیات ' کی زندگی اسی سے وابستہ ہے "- یا فانی کا ایک شعر لیجئے اور شاعر کے وسعت ظرف اور حوصلے کی داد دیجئے —

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

چکبست کی شاعری میں داخلی رنگ بہت گہرا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر ان کی فطرت اور طبیعت کا صحیح مرقع ہوتا ہے - اور چونکہ خود ان کا اخلاقی معیار بہت بلند تھا اس لیے ان کی شاعری بہترین تعلیم اخلاق بن جاتی ہے —

چکبست کا مذہب " انسانیت " ہے - وہ انسان کے لیے انسانیت کو مقدم سمجھتے ہیں - " پاس انسان " " اور " خدمت انسان " ہر شخص کا فرض قرار دیتے ہیں - تہذیب و تمدن کا سارا نظام اسی پر قائم ہے - J.S.Mill کا خیال تھا کہ خدا کو بے دلیل پہچاننے کا زمانہ گزر چکا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ Social Feeling کو اس کا قائم مقام بنایا جاے - چکبست ایک حد تک اس کے ہمخیال ہیں - ان کا بھی خیال ہے کہ بجاے " خوف خدا " کے اگر ہمارے دل میں " پاس انسان " ہے تو ہم بھی وہی کر سکتے ہیں جو ایک خدا سے ڈرنے والا - چنانچہ کہتے ہیں —

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اس کو خوف خدا کہیں گے

پھر کہتے ہیں

یا خوف خدا یا خوف سقر ہیں دو ہی یہاں تیرے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی

چکبست کے خیال سے ہر وہ مسلک جو انسانیت کو زائل کرنے کی طرف مائل ہے باطل ہے - وہی شریعت قابل تسلیم ہے جو ہمارے دل میں انسان کی محبت پیدا کرے - انسانیت اصل مذہب ہے اور مذہب کے فروعات میں اختلاف و افتراق بے معنی —

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجت
بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملت
بس قابل تسلیم اسی کی ہے شریعت
جس دل میں ہو انسان کے لیے درد محبت
تہذیب پسندیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی ملت یہی اخلاق یہی ہے

پھر دنیا میں رہ کر دنیوی فرایض سے بے نیاز ہو جانا ' مذہب کی پیروی اتنی کرنا کہ زندہ در گور ہو جانا اور اپنے کو وقف عقبیٰ کردینا انتہاے خودی ہے جب کہ انسانیت ' مظلوم انسانیت ان کی مدد کی محتاج ہے ' ان کی ہمدردی کی طالب ہے - چکبست ایسے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں —

انسان کی محبت کو سمجھتے ہیں یہ آزار
ہمدردیٔ قومی سے انھیں آئے نہ کیوں عار
رہتے ہیں سدا فکر میں عقبیٰ کی گرفتار
دنیاے کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار
یوں جادۂ تسلیم و رضا مل نہیں سکتا
ان میں وہ خودی ہے کہ خدا مل نہیں سکتا

پھر کہتے ہیں

آشنا ہوں کان کیا انسان کی فریاد سے
شیخ کو ملتی نہیں فرصت خدا کی یاد سے

خدمت انسان کی جو وقعت چکبست کی نگاہوں میں تھی ذیل کے شعر سے معلوم ہوگی :

خدمت انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینے پہ الفت کی جلا کرتے رہے

یہی جذبات ان کے جذبۂ وفا کو بہت استوار بنا دیتے ہیں ۔ وہ "تمنائے وفا میں" مرنے کو اپنی آبرو سمجھتے ہیں اور راہ وفا میں ہمیشہ ثابت قدم رہتے ہیں یہاں تک دشمنوں کی بیوفائی بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کر سکتی بلکہ ان کے لیے درس وفا بن جاتی ہے —

بروں سے بھی یہاں برتاو رکھتے ہیں بھلائی کے
بنایا با وفا اس دل کو صدقے بے وفائی کے
جلا دی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے
کدورت واں بڑھی اور یاں کھلے جوہر صفائی کے

دشمن کی ذات سے وفا کی توقع رکھنا سراب سے آب کی تمنا رکھنا اور یخ سے شرار طلب کرنا ہے کیونکہ اس کی بے وفائی فطری ہے ۔ ہاں مگر دوستوں کا " دشمن ارباب وفا ہو جانا " غضب ہے ۔ اس کی بیوفائی دل توڑ دینے والی ہوتی ہے اور یارائے ضبط کا سخت ترین امتحان ۔ مگر چکبست یہاں بھی کامیاب رہتے ہیں —

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بے وفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

حسن ظن ہو تو ایسا ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ دوستی کا حق اگر کسی کو ہوسکتا ہے تو ایسے ہی شخص کو ہوسکتا ہے —

ان کی علوے ہمت ان کی رجائیت کا آئینہ ہے ۔ وہ مصیبت سے نہیں گھبراتے کہ یہیں انسان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے براوننگ سچ

کہتا ہے کہ انسان کامیابی کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ کیا اور اس کی کامیابی کیا۔ سوال تو صرف "جوہر مردانہ" کا ہے جس کا اندازہ مصیبت ہی پڑنے پر ہوتا ہے —

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا

وہ حوادث زندگی کا مقابلہ نہایت پا مردی سے کرنے کو تیار ہیں۔ ان کا جوش عمل ایک سیلاب ہے جو ان عارضی رکاوٹوں سے نہیں تھم سکتا —

نہ بدلی ہے نہ بدلے کی ترنگ اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

دوسروں کی نگاہوں میں گر جانا معمولی بات ہے کہ اس کا مداوا ممکن ہے مگر اپنی آنکھوں میں پست ہوجانا کمال بزدلی ہے اور لا علاج۔ شکست کوئی غیر معمولی چیز نہیں کہ اس کے بغیر فتح کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا مگر اعتراف شکست کامیابی کی امید کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیتا ہے۔ امکان کی دنیا بہت وسیع ہے اور ایک ذرا سی ہمت ہو کار:

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

درماندگی دل کا علاج ناممکن ہے ورنہ ہر پھول گلشن بہ داماں اور ہر قطرہ بحر بے کراں ہو سکتا ہے۔ شعر —

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

مقصد زندگی نا معلوم ' غایت آفرینش معدوم اور نظام کائنات محض

ایک تماشا - یہ سب درست ہے - لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہماری ہستی کا منشا بے حسی اور مردہ دلی ہرگز نہیں جو خود زندگی کے منافی ہے - شوق عمل تقاضاے مردانگی ہے - یہاں آکر چکبست کی رجائیت اور قنوطیت کا بے مثل امتزاج ہوتا ہے اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا عنصر غالب ہے —

زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

چکبست کے اشعار میں ان کی تمکنت اور خود داری نمایاں طور پر جھلکتی ہے - دل ضبط سے ناشاد رہے رہے مگر لب شرمندۂ فریاد نہ ہو - اگر ضبط کی طاقت نہ ہو تو فریاد کی جرأت بھی نہ ہو ' دست سوال دراز کرنا کیا معنی - اگر جذبۂ شوق کامل ہے تو مطلوب خود آجائے گا - مثل مشہور ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے مگر چکبست کنویں کو اپنے پاس بلا کر پیاس بجھاتے ہیں —

دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے
جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں کہ دریا کو بلا لیتے ہیں

وہ اپنے درد و غم میں کسی کو شریک کرکے اس کے ممنون احسان نہیں ہوسکتے - ان کی خود داری بھلا اس بار گراں کی کب متحمل ہوسکتی ہے —

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بار الم میرا

چشم تماشا سے دور پردہ شب میں شبنم کی گوہر باریاں نمود و نمائش

سے کتنی بے نیاز ہوتی ہیں - گریباں صبح چاک ہوتا ہے اور سورج کی پہلی کرن پھولوں کے دامن موتیوں سے ڈھکے ہوے پاتی ہے - اسی طرح ایک سچے شاعر کا فیض " محتاج نمائش " نہیں - وہ فطرتاً عزلت پسند ہوتا ہے اور شہرت سے کنارہ کش - شہرت تو اسے خود ڈھونڈھ لیتی ہے - چکبست کہتے ہیں —

ان کی رباعی کا ایک شعر ہے —

کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
اک دن خود ڈھونڈھ لے گی شہرت مجھکو

منزل عیش مجھے گوشۂ گمنامی ہے دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں

دنیائے محبت کے رسم وآئین جداگانہ ہیں - وہاں کوشش خود اپنا حاصل ہے اور اس سے زیادہ ہوس لا حاصل - جستجو خود منزل مقصود ہے اور اس سے زیادہ کی تلاش گمراہی - شجر محبت خود اپنا ثمر ہے - اس شعر کی رجائیت ملاحظہ ہو

چمن زار محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

ان کے کلام میں قناعت کی جھلک اور استغنا کی بھی شان ہے - اس کے متعلق اشعار " چکبست اور شعرائے متقدمین " کی تحت میں دیے جا چکے ہیں —

تصوف چکبست کے فلسفۂ حیات اور اخلاقیات کے سلسلہ میں کچھہ ان کے تصوف پر لکھنا ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ میں یہ پژمردہ پھول بھی ہے - انھوں نے ایک پوری نظم " جلوۂ معرفت " کے عنوان سے لکھی جس میں فلسفۂ ویدہ کا اتمام کیا ہے - وہی برق تجلی جو کبھی بالائے طور لہراتی تھی ساحل ہند پر بھی چمک جاتی

ہے ۔ صہبا کدۂ عرفان سے اہل دل توحید کے نعرے بلند کرتے ہیں - وید میں کثرت فی الوحدت کی تلقین کی جاتی ہے ۔ ذرہ و خورشید ایک اسی رشتۂ نور میں منسلک ہیں ۔ جوشش شباب و روانیٔ آب کا عنوان وہی ہے - رگ گل میں خون جگر؛ نوک خار میں خلش نشتر' حسن میں تمکنت ' دیوانے میں جوش وحشت ' شمع میں شعلۂ دلگداز' پروانے میں محبت کا سوز و ساز' گلزار میں رنگ و بو' کہسار میں آب جو ' قلب مجذوب میں شوق فراواں ' دل شاعر میں درد پنہاں بن کر وہی سما یا ہے ۔

تکاپوے جنوں سواد لامکاں پر ختم ہوتی ہے اور منزل مقصود پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ جسے ابتدا سمجھے تھے وہی انتہا ہے ۔ خودی حرف غلط' خدا لفظ بے معنی اور جلوۂ جانانہ کی ضیا پاشیوں میں امتیاز من و تو فراموش - چکبست کہتے ہیں —

کہتے ہیں خودی کس کو خدا نام ہے کس کا
دنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

درد کا شعر ہے -

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرے
جس کی خاطر تجھے تکاپو ہے

غالب کے نقطۂ نگاہ میں " جلوہ یکتائی معشوق " کائنات کی حقیقت اور خود بینی حسن تکوین آب و گل کی علت ہے - چکبست کے خیال سے دنیا کسی کے حسن سحر طراز کا طلسم ہے اور " نقشبندیٔ کون و مکاں " اسی کی فسوں کاریوں کی رہین منت —

کس کے فسون حسن کا دنیا طلسم ہے		ہیں لوح آسماں پہ یہ نقش و نگار کیا
جادو کسی کے حسن کا چلتا ہے رات دن		بے کار نقشبندی کون و مکاں نہیں

نزاع کفر و ایمان راز ہستی سے نا واقفیت ہے اور زندگی ایک ایسا خواب جس کی تعبیر نہیں —

یہ حیات عالم خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے

وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم راز جہاں نہیں

میر کا شعر ہے ۔ اختصار ملاحظہ ہو ـ

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ہم جسے ذات سمجھتے ہیں محض مجموعہ صفات ہے ۔ اصل ذات کا ادراک ہم کو نہیں ہوتا —

جو ظہور عالم ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے

ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسم وہم و گماں نہیں

مصحفی کہتے ہیں ـ

سیر جہاں سے ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں
اک دھندھ سا پیش نظر ہے بھی اور نہیں
دیکھے ٹک آنکھہ کھول کے غافل جو تو تو پھر
ہستی تیری برنگ شرر ہے بھی اور نہیں

چکبست کو نہ رنگ مائل کرتا ہے اور نہ بو فریفتہ کرتی ہے ۔ یہ محض صفات ہیں جو محسوسات میں سے ہیں ۔ ان کو اصل ذات کی جستجو ہے جو ان سب کی مبداء ہے اور جو حدود چمن میں نہیں ہے —

ہے رنگ آنکھہ کو محسوس اور دماغ کو بو
وہ شے جو اصل میں گل ہے کہیں چمن میں نہیں

چکبست کا مسلک بھی وہی ہے جو بہ مے سجادہ رنگین کن کی

تلقین کرتا ہے —

مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا رند مشرب ہوں
وہی ایماں ہے جو کچھ کہے پیر مغاں میرا

یہی نہیں بلکہ وہ اپنے پیر مغاں اور اس کے حلقۂ ارادت کو جنت میں بھی نہیں بھولتے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں —

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبت پیر مغاں کے ہیں

چکبست بحیثیت سوشل ریفارمر چکبست کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی سوسائٹی مغربی تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے لگی تھی اور اس اعتبار سے بہت کچھ تغیر پیدا کر چکی تھی - اس معاملے میں دو جماعتیں تھیں ایک تو ان قدیم خیال حضرات کی جو مغرب کی کورانہ تقلید کو فرض سمجھتے تھے اور ہر چیز کو تہذیب جدید کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے میانہ روی کو بہتر قرار دیا - لیکن حد اعتدال کے تعین میں ان میں بھی آپس میں اختلاف ہو گیا - چکبست نے بھی اعتدال پسند کیا - مگر ان کی حد اعتدال اکبر الہ آبادی کی حد اعتدال سے نسبتاً بڑھی ہوئی ہے - پھر بھی جب ان جماعتوں کی تفریق کی جائے گی تو اعتدال پسند لوگوں کے زمرہ میں چکبست کا بھی شمار ہوگا اور اکبر کا بھی —

بہرحال چکبست اعتدال پسند ہیں - وہ یورپ کی کورانہ تقلید کے قائل نہیں - وہ صرف اس تقلید کو روا رکھتے ہیں جو ملک کی فلاح و بہبودی کا باعث ہو سکے - ان کی نظم " دردِ دل " کے دو بند ملاحظہ ہوں —

جن اکبر سے جو یورپ کے ہوے ہیں ممتاز
ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر اُنہیں ناز
بیریا ران طریقت سے ہے غیروں سے ہے ساز
وہ بلائی ہوئی چتون وہ انیلے انداز!
لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرفداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

ان کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھہ سروکار
ظاہری شان و نمائش پہ دل و جاں ہیں نثار
ہیں وہ سینے میں کہاں غیرت قومی کے شرار
جن سے مغرب میں ہوے خاک کے پتلے بیدار
سیر یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

ان بندوں میں طنز خوب ہے - خصوصاً پہلے بند کی ٹیپ کا مصرع ثانی - بے ساختگی ہے مگر منہ پھٹ نہیں ' شوخی ہے مگر سنجیدگی لیے ہوے - چکبست کی طنز اکبر کی طنز سے جدا ہے - اکبر کی طنز زیادہ مضحکہ خیز اور ہجو آمیز ہے - چکبست کی طنز زیادہ لطیف و سنجیدہ ہے - اکبر الہ آبادی خنجر سے کام لیتے ہیں چکبست نشتر سے —

مغرب کی جو بات قابل تقلید ہے اس کی کسی کو پروا نہیں - اصلاح و آزادی کے لیے یورپ کی تقلید ضروری سمجھی جاتی ہے مگر کوئی اپنے کو اس کا اہل نہیں بناتا —

آزادی و اصلاح کے جب آتے ہیں افکار تقلید ہو یورپ کی یہی رہتی ہے گفتار
موجود مگر ان میں وہ جوہر نہیں زنہار مغرب میں جو تہذیب و ترقی کے ہیں اسرار

وہ حب وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو ولولے رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

اکبر الہ آبادی عموماً نقائص کو بتلا کر خاموش ہو جاتے ہیں ' وہ صرف ہنس پڑتے ہیں - یہ اصول اچھا ہے کیونکہ پند و موعظت سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے - مگر چکبست صرف تنقیص پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ راہ راست پر بھی بلاتے ہیں - اور عموماً شعریت کو ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے ورنہ کلام پھیکا اور بے کیف ہو جاتا ہے - جس کی مثالیں ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ ہیں —

عورتوں کی آزادی کے معاملے میں بھی وہ اعتدال پسند ہیں - ان کی ایک پوری نظم '' پھول مالا '' ہے جس میں وہ قوم کی لڑکیوں سے تخاطب کرتے ہوے بتاتے ہیں کہ آزادی کا صحیح معیار کیا ہے - اس نظم میں انہوں نے بتایا ہے کہ وہی آزادی محمود ہے جو قومیت کے منافی نہ ہو - بالکل مغربی عورتوں کا طرز و انداز ان کی ظاہری نمود نمایش کبھی ایک ہندوستانی عورت کے لیے مستحسن نہیں کہی جا سکتی —

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوے وفا کچھہ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رنگ و روغن تمہیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

یہ مد نظر رکھتے ہوے کہ یورپ کی نمود و نمائش کو وہ در خور ستائش نہیں قرار دیتے سمجھہ میں نہیں آتا کہ یورپ کے رنگ و روغن

سے ان کا کیا مطلب ہے جس کی مبارکباد وہ اس قدر فیاضی سے دیتے ہیں اور قوم کے نقش سے ان کا کیا مفہوم ہے جس کے قائم رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا یورپ کے رنگ و روغن کے ساتھ بقائے نقش قومی ممکن بھی ہے یا نہیں اور آیا اس کے داغدار ہوجانے کا تو احتمال نہیں؟ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور چکبست کی شاعری نے ان کی اچھی پردہ داری کی ہے —

وہ عورتوں کی آزادی کو اسی حد تک پسند کرتے ہیں جہاں تک کہ شرم و حیا کی پابندی اجازت دے سکتی ہے —

رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

وہ انھیں وفا کی تعلیم دیتے ہیں، بچوں کی تربیت پر متوجہ کرتے ہیں اور قدیم خیال بزرگوں کے احترام کی تلقین کرتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں —

ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

ایک روشن خیال ہندو کی طرح چکبست بھی بیوہ عورتوں کی شادی کے موافق ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کے فرقے میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی۔ اس کے خیر مقدم میں چکبست نے اپنی نظم "برق اصلاح" لکھی۔ اور ان کے اس شوق اصلاح کی خوب داد دی۔ انھوں نے بتایا کہ جبر کرنا اخلاق کی شان نہیں۔ ہندوستان کی اس جہالت کی وجہ سے نہیں معلوم کتنے بے گناہوں کا شباب بلکہ سرمایۂ حیات مٹی میں مل گیا —

آج اس ظلم کی بنیاد هلی جاتی هے
خاک میں صحبت دیرینہ ملی جاتی هے
رحم کا راج هے اب سنگ دلی جاتی هے
یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی هے
مرد قوموں کو سبق یوں هی سکھا دیتے هیں
دل میں جو ٹھانتے هیں کرکے دکھا دیتے هیں

چکبست انسان کی آزادی کے لیے مذهب کی غیر ضروری بیڑیوں کو توڑ دینا پسند کرتے هیں کیونکہ اس قسم کی تحدید و امتناع سے ارتقاے قومی کا سد باب هوتا هے —

حالت زخم سے جب حالت نا سور هوئی
فکر مرهم دل پر درد کو منظور هوئی
جور مذهب کی بلا قوم سے کافور هوئی
شکر هے گاے کی گردن سے چھری دور هوئی
غم نہیں دل کو یہاں دین کی بربادی کا
بت سلامت رهے انسان کی آزادی کا

چکبست هندو مسلم اتفاق کے زبردست حامی هیں - وہ خوب سمجھتے هیں کہ بغیر اتحاد کے قومیت کا کوئی مفہوم نہیں اور آپس کے تنازع قومیت کی جڑ کاٹتے هیں - اغیار هنستے هیں اور وطن کی تضحیک هوتی هے —

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے هیں
وطن کی آبرو اهل وطن برباد کرتے هیں

هندوؤں اور مسلمانوں کے تفرقے کی نوعیت کچھ ایسی هو گئی هے

کہ ان کا طے ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ خصوصاً جب طرفین خود مصالحت پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے ۔ چنانچہ بہت مایوسی کے ساتھہ کہتے ہیں کہ

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھہ کر رنگ مسلماں دیکھہ کر
اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھہ روز تک کعبہ کلیسا ہونہیں سکتا

تعصب کا کانٹا دل میں ایسا پیوست ہوگیا ہے کہ

جدا سینے سے دل ہو دست و بازو قوم کے شل ہوں
مگر دل سے جدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا

ہندوستان کی جو حالت ہندو مسلم نا اتفاقی سے ہوگئی ہے اس کی اس سے بہتر کیا تصویر ہوسکتی ہے —

گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے
اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

پھر جو لوگ اس تعصب کو مٹانا چاہتے ہیں ان کو متعصب قرار دیتے ہیں لہذا جب چارہ گر کو قاتل سمجھیں گے تو زخم کا اندمال معلوم

جسے ہے فکر مرہم کی اسے قاتل سمجھتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

مگر جب معاملات کے روشن رخ پر آتے ہیں تو خود بھی فکر مرہم کرتے ہیں ۔ وہ نغمۂ ناقوس اور آوازہ اذاں کو آزادی کی لے میں ملادینا چاہتے ہیں ۔ وہ قہلائے آزادی کے رشتے میں قوم کے اجزائے پریشاں کو وابستہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اغیار سچ کہتے ہیں کہ رنگ وطن یکساں نہیں

ہے اور خاک ہند کا دامن " قوس قزح " بنا ہوا ہے - لیکن اگر سب آزادی کے طلب گار بن جائیں اور غلامی کا بادل ہٹ جائے تو پھر یہ تمام رنگ اس ایک نور میں مبدل ہو جائیں جو ان سب کا منبع و مرجع ہے جس سے یہ پھوٹ نکلے تھے —

رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں !
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

چکبست نے ایک نظم شراب کی برائی میں بہ عنوان " آب انگور " لکھی ہے - اور شعریت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے - مگر شراب نے جو حیثیت اردو شاعری میں حاصل کرلی ہے خواہ وہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے نظم بے کیف سی معلوم ہوتی ہے - خدا بھلا کرے مولف کا کہ اس نظم کے بعد ہی " برسات " کی نظم رکھی ہے - جس کا مطلع یہ ہے —

ہے دلاتی یاد مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ کر گھٹا برسات کی

چونکہ سنا ہے کہ شراب معرفت کے لیے کسی موسم کی تخصیص نہیں اور صرف وہی شراب ہے جو بلا موسم پی جاتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس " مے نوشی " سے ہمارے رند پارسا کا کیا مفہوم ہے - بہر حال اس کے پڑھنے سے پہلی نظم کا تنغض رفع ہو جاتا ہے —

چکبست کا زمانہ ہندوستان کے معاشی و اقتصادی ارتقا کا زمانہ تھا پرانے اخلاقیات کے اصول بہت کچھہ اپنا مفہوم بدل چکے تھے - قناعت کا مفہوم سستی اور کاہلی ہوگیا - (ع) تکیہ خدا پر کیجئے دروازہ بھیڑیے - دولت کی برائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس کا حاصل کرنا بے سود سمجھنے لگے اور اہل دولت کو بری نظروں سے دیکھنے لگے - چنانچہ چکبست نے ایک نظم دولت کی تعریف میں سپرد قلم کی ہے جو بالکل جدید نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ دولت بذات خود اچھی بری نہیں - یہ اس کا مصرف ہے جو اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے - اب اگر ہم اچھائی کے متلاشی ہیں تو یہ کیا ضرور کہ ترک دولت کریں اور تکالیف اُٹھائیں اور کیوں نہ اسے حاصل کرکے اچھے کاموں میں صرف کریں اور فائدہ اٹھائیں - لاریب کہ دولت کی ہوس ضرورت سے زیادہ بڑھ کر مخرب اخلاق ہو جاتی ہے مگر یہ انسان کا قصور ہے نہ کہ دولت کا —

زر آپ نہیں دشمن اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

پھر دولت کو ہم مذہبی کاموں میں لگا سکتے ہیں، اس سے ہم غربا کی مدد کرسکتے ہیں - دولت حاصل کرکے دوسروں کی پرورش کرنا قناعت کرکے اپنا پیٹ پال لینے سے بہتر ہے - دولت و ثروت حاصل کرکے غریبوں پر چشم عنایت رکھنا - قناعت کرکے جاہ و ثروت پر ٹھوکر مار دینے سے بہتر ہے - اسی حالت کی ایک تشبیہ دیتے ہیں - شعریت ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے —

یا باغ میں کھلتا ہے دم صبح گل تر
کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسر

پہنتا ہے عروسان جہاں کے ایسے زیور
دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اثر
لیکن نہ کسی وضع پہ اس رنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

حب وطن اور حب قومی

اردو شعرا میں چکبست سے زیادہ حب وطن اور حب قومی کسی کے کلام میں نہیں ملے گا - اس لیے انھیں اردو کا بڑا قومی شاعر کہنا بے جا نہ ہوگا - ان کی شاعری یکسر " ترانۂ ہندی " ہے - ان کا نغمہ بھی ہندی ہے اور لے بھی - ان کا سارا کلام ان کے جذبۂ وطنیت وقومیت سے متاثر ہے —

" خاک ہند " میں کہتے ہیں —

شیدائے بوستاں کو سرو چمن مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

مادر ہند کی عظمت مسلم ہے - اس کے لیے فیض قدرت کا ابدی سر چشمہ کھلا ہوا ہے - اس کی جبیں حسن ازل کے نور سے تابندہ ہے - ہر صبح آفتاب عالمتاب کی اشعۂ اولین ہمالہ کی چوٹیوں کو سنہرے موباف میں گوندھتی ہیں - اس وقت جب کہ سارے جہان پر ابر وحشت طاری تھا اور جہل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی یہ سر زمین چشم و چراغ عالم تھی- اس وقت جب کہ محفل یونان بھی محتاج شمع تھی اس وادیء کہن میں

مہر دانش ضو افشانی کررہا تھا - هندوستان کی یہ گذشتہ عظمت ' اس کی تہذیب دیرینہ ' اس کے رنگا رنگ مناظر ' اس کے عہد ماضی کے مذهبی پیشوا ' اس کے جلیل‌القدر تاجدار ' جن کا گانا وہ اپنی نظم " خاک هند " میں گاتے هیں ان کے ایسے باعث فخر بھی هیں اور باعث عبرت بھی —

سمجھ سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں هیں
ٹوٹے هوے کھنڈر هیں یا ان کی هڈیاں هیں

وہ دیکھتے هیں کہ گلشن هند کے برگ و ثمر اب بھی تروتازہ هیں - طاوس جنگلوں میں مصروف رقص هیں ' برق میں وهی تڑپ اور رعد میں وهی گرج هے ' فغاں ناقوس اب تک پر جوش اور کیفیت اذان فردوس گوش هے ' مگر دل کے حوصلے پست هیں اور سینوں میں صرف ایک ٹوٹی هوئی همت باقی هے - چنانچہ کہتے هیں —

گل شمع انجمن هے گو انجمن وهی هے
حب وطن نہیں هے خاک وطن وهی هے

ان کا درد مند دل هندوستان کی یہ حالت نہیں دیکھہ سکتا - وہ بے تاب هو جاتے هیں - جذبات کا تراکم و تلاطم اور انسان کا دل جس کی حقیقت ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہیں ! جام چھلک جاتا هے - روح کے اس گریۂ معصوم میں ایک توازن پیدا هوجاتا هے - یہی موسیقی هے جو اس بند میں الفاظ کا جامہ پہنے هوے هے —

برسوں سے هورها هے بر هم سماں همارا
دنیا سے مٹ رها هے نام و نشاں همارا
کچھہ کم نہیں اجل سے خواب گراں همارا
اک لاش بے کفن هے هندوستاں همارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

روح کے انتہائی حزن و ملال کی کیفیت میں جذبات کی اس سوگوار فضا میں کلام کی روانی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے دھندھلکے میں چشمہ آب بہہ رہا ہے۔ پھر ان کی رجائیت ان کی افسردگی پر غالب آتی ہے اور ایک ایسے جوش تمنا کے ساتھ جو مایوسی کے رد عمل کا لازمی نتیجہ ہے پکار اٹھتے ہیں —

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چمن میں گلچیں بھی ہے اور عندلیب بھی۔ گلچیں کی دراز دستی صرف دامن گل تک ہے۔ مگر بلبل کی نگاہ میں تو اس کے خس و خاشاک بھی قابل قدر ہیں کہ انھیں سے اس کے آشیاں کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہیں دیوانہ و ہشیار کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ چکبست کہتے ہیں —

ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
ہم پوجتے ہیں باغ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

قوم کی محبت میں چکبست مست و سرشار ہیں۔ دیوانے ہیں اور ایسے

کہ اپنی دیوانگی کو صد ہزار دانش کے عوض دینا پسند نہ کریں گے۔ یہ نسخہ ان کے ہاتھ ایسا لگا جس سے وہ نہ صرف دوسروں کے دل تسخیر کر لیتے ہیں بلکہ خود ان کی روح اس سے کسب فیضان کرتی ہے۔ وہ قوم کے دکھ درد سے اتنا متاثر ہیں کہ اپنا رنج و غم فراموش کر بیٹھتے ہیں —

دل کئے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے
قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

وہ ہندوستان کی غلامی کو دیکھتے ہیں، ان کا دل کڑھتا ہے۔ پھر ہندوستانی اس غلامی کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ انھیں یاد بھی نہیں آتا کہ وہ کبھی آزاد بھی تھے —

یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

طائر چمن کو قفس کے آب و دانہ سے کیا انس ہو سکتا ہے۔ مگر بے بال و پری میں اس کا بھی تو ڈر ہے کہ "چھوڑ نہ دے صیاد کہیں"۔ یہ اپنی بے بسی کی انتہا ہے کہ ہم اغیار کے دست نگر بھی ہیں اور ممنون احسان بھی، اسیر بھی ہیں اور بار کش منت صیاد بھی —

آب و دانہ سے قفس کے کچھ ہمیں الفت نہیں
بے پرو بالی سے اپنی عاشق صیاد ہیں

غلامی اب بہر صورت مجبوری ہے اور اکثر قوموں پر یہ وقت پڑا ہے۔ مگر سب سے زیادہ مایوس کن ذہنیت کی غلامی ہے، کیونکہ غلامی کے احساس کے مٹ جانے سے آزادی کے تمام امکانات محو ہو جاتے ہیں —

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پر فن میں
که زیور هو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں

لوگوں کی یہ حالت کہ بچوں سے لے کر بڈھوں تک ہر شخص غلط کاریوں میں مبتلا ہے - فکر مداوا کون کرے - مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید آپس کا تعصب ' تعلیم کی کمی ' عسرت و افلاس ' غرض ہر وہ خرابی جو ایک قوم کے لیے " دیباچۂ زوال " ہوسکتی ہے موجود - چکبست اسے محسوس کرتے ہیں اور کس مایوسی سے کہتے ہیں —

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی
پر اب عروج وہ علم و کمال و فن میں نہیں
رگوں میں خون ہے وہی دل وہی جگر ہے وہی
وہی زبان ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں
وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس
خدا ے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں
وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے
وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں

اور پھر کس قدر بیزار ہو کر کہتے ہیں —

غرور و جہل نے ہندوستان کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

ایسی ناگفتہ بہ حالت میں مصلحین کا رنگ اور بھی دگرگوں ہے - حمیت قومی سے دلوں کو مس نہیں - زور بیاں اور طرز بیاں سے لوگوں کے دل لبھانا چاہتے ہیں - اس سے ان کی شہرت تو ضرور بڑھ جاتی ہے مگر قوم کے مفاد کی کوئی صورت نہیں نکلتی - لیکن ان کا مقصد تو محض

اپنا نام و نمود ہے جو حاصل ہے - چکبست یہ دیکھتے ہیں اور کس حسرت سے کہتے ہیں —

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

چکبست ہندوستان کے لیے آزادی کے خواہاں ہیں - کوئی آرزو ہے تو یہ اور ارمان ہے تو یہ اور وہ بھی یوں جیسے گنگا کی موجوں میں تاروں کا عکس جھلملاتا ہے - پھر بے تابی کا یہ عالم ہے —

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

وہ اس آزادی کے حصول کے لیے جو ان کے نقطۂ نگاہ سے ہر ہندوستانی کی زندگی کا تنہا نصب‌العین ہونا چاہئے سب کچھہ کرنے کے لیے تیار ہیں - مادر ہند کی تصویر سینہ پر آویزاں ' بیڑیاں پیر میں اور کفنی گلے میں - یہ اس چکبست کی تصویر ہے جو آزادی کا عاشق ہے جس کی فریاد و فغاں پر مہر خاموشی لگادی گئی ہے ' جو آزادی کے جنون میں کانٹوں کے فرش کو پھولوں کا بستر سمجھتا ہے اور شور سلاسل کو نغمۂ آزادی میں مدغم کر لیتا ہے —

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی
اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادر ہند کی تصویر ہو سینہ پہ بنی
بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی
ہو یہ صورت سے عیاں عاشق آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا
فرش پھولوں کا ہمیں کانٹوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا
قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا
سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

آزادی کے جذبات اور ولولے کبھی پابند نہیں کیے جاسکتے - دنیا کی کوئی قوت ان سے وہ نہیں چھین سکتی جو ان کا فطری حق ہے - یہ وہ چیزیں ہیں جن کی وسعت ' جن کی پہنائی ' جن کی پرواز کبھی حلقۂ زنجیر میں محدود نہیں ہوسکتی —

پاک ہے جوش سخن خوف کی تدبیروں سے
ولولے روح کے آزاد ہیں زنجیروں سے
زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے
دلی اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

ہمارا پا بہ زنجیر ہونا تو علامت ہے ہماری آزادی کی - جب تک ضمیر آزاد ہے ' طوق و سلاسل کا کوئی مفہوم نہیں —

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آزادی کی کیا نوعیت ہے جس کے لیے چکبست اس قدر عریاں طور پر بے تاب نظر آتے ہیں ؟ یا دوسرے لفظوں میں

آزادی کے متعلق ان کا سیاسی مطمح نظر کیا تھا ؟ ان کی ایک نظم جو لکھنؤ میں دسمبر سنہ ۲۲ ع کی کانگریس کے اجلاس میں گائی گئی تھی ان کے نظریے کی حامل ہے۔ اس کا آخری بند یہ ہے —

اس خاک دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے
طوفان بے کسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دور حسرت دنیا سے جا رہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آرہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اس اجمال کی تفصیل ان کے کلام میں نہیں ملتی ۔ وہ ڈومینین اسٹیٹس کے قائل ہیں - کیوں قائل ہیں اور کن اصول کے ماتحت اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ نہیں بتاتے اور بحیثیت ایک شاعر کے ان کا یہ فرض بھی نہیں - اسقدر فرق بروک کو ٹنی سن کا نظریۂ آزادی اسی وجہ سے نہیں پسند آیا کہ وہ نہ صرف عوام کے جذبات کے منافی تھا بلکہ جن اصول کے ماتحت ٹنی سن اس کی تکمیل چاہتا تھا حد درجہ غیر شاعرانہ تھے اور نتیجہ کے رو نما ہونے کا امکان صرف مستقبل بعید میں ہو سکتا تھا - چکبست کا نظریہ اتنا مایوس کن نہیں - وہ اپنی شاعرانہ پیش بینی سے کام لے کر ایک خاص ملہمانہ انداز سے فرماتے ہیں —

لیکن یہ دور حسرت دنیا سے جارہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آرہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

بس یہی ایک شاعر کا فرض ہے - وہ منزل مقصود کے طرف اشارہ کرتا ہے اور اپنے نغموں سے جوش رہروی پیدا کرتا ہے - جادۂ پیمائی کے اصول نہیں بتاتا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ جس طرف وہ اشارہ کر رہا ہے وہی منزل مقصود کیوں ہے - یہ تفصیل کچھہ نثر ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ "صبح امید" کے رسالوں میں اس کے متعلق چکبست کے کچھہ رشحات قلم مل جائیں - یہاں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت ایک شاعر کے انھوں نے اپنے نظریۂ آزادی کو کس صورت میں پیش کیا ہے - میری ناچیز راے میں تو چکبست اگر اپنے کلام میں آزادی کی تعین نہ کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح ان کی نظمیں پوری قوم کو جس میں کہ ہر خیال کے لوگ شامل ہوتے زیادہ مستقل طریقے سے متاثر کرتیں - چکبست نے اپنے اس نظریۂ آزادی کو ایک جگہ یوں پیش کیا ہے -

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں —

مجھہ کو مل جاے چہکنے کے لیے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

اس میں "کون کہتا ہے" کا ٹکڑا کس قدر پر معنی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے - اور دوسری طرف سے جو عذر پیش ہوا ہے اس کے جواب میں اپنے حق کا مطالبہ کرتے ہوے یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم کو تمھارے حصے سے کوئی سروکار نہیں - پھر صیاد چمن میں طائر کی نواسنجیاں سننے کے لیے تو رہتا نہیں - اس کا کام تو

دام تزویز بچھانا ھے - اس کی طرف سے یہ بے نیازی یا تو انتہائے مجبوری ھے یا ایک مرتبہ کچھہ کھو کر سیکھہ لینے پر اعتماد —

چکبست کو قوم کے ان رھنماؤں سے جو واقعی قوم کے لیے اپنا دل دکھاتے ھیں سچی ھمدردی ھے ۔ وہ ان کے ایثار و محبت کی دل کھول کر داد دیتے ھیں اور دوسروں کے لیے ان کی مثال قائم کرتے ھیں - ان کی نظم " مسز بسنت کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا " ان کی اس دلی ھمدردی کا بین ثبوت ھے —

لہلہاتا ھے محبت کا تری دل میں چمن
ماں کے دامن سے ھے بڑھ کر ھمیں تیرا دامن
تری تصویر سے ھیں قوم کی آنکھیں روشن
تیرے بالوں کی سپیدی ھے کہ ھے صبح وطن
دل پر درد کی تصویر ھے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ھے پہنے ھوے مورت تیری

وہ غریب الوطن ھندوستانیوں کو بھی نہیں بھولتے اور ان کے مصائب و آلام کا حال سن کر تڑپ جاتے ھیں - اھل وطن کو ان کی امداد پر مائل کرتے ھیں اور ان کی غفلت پر نفرین ' کبھی التجا کرتے ھیں ' کبھی لعنت و ملامت ' کبھی خوشامد ھے ' کبھی قہر و عتاب اور واقعہ یہ ھے کہ ان کی نظم " فریاد قوم " " لہو کے رنگ میں ڈوبی ھوئی " ھے - وہ " افسانہ " نہیں ھے بلکہ " مرثیہ " ھے ایک قوم کا جس میں آثار زندگی مٹ چکے ھیں۔ افریقہ میں ھندوستانیوں پر مظالم ھوتے ھیں اور فلک جفا جو کے لیے کوئی " طرز ستم " باقی نہیں رہ جاتا ھے - چکبست اس سے پوری طرح متاثر ھوتے ھیں اور کہتے ھیں —

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد و قوم کے دم ساز
ہوا کے ساتھہ یہ آتی ہے دکھہ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
"ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا"

چکبست کی قومی نظمیں ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جذبات کی بہترین مظہر ہیں اور ضرورت بھی اسی کی تھی کیونکہ اگر ہندوستان کو کسی طبقہ سے امید ہو سکتی تھی تو وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی کا طبقہ تھا اور ہندوستان کا مستقبل بہت کچھہ اسی کے ہاتھہ میں تھا۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر ایک مردہ دل آدمی بھی ایک خاص طرح کی زندگی اور قوت عمل محسوس کرتا ہے - چکبست خود بھی مست شباب ہیں مگر اس مستی میں بھی پاؤں کو لغزش نہیں ہوتی۔ خیالات بھکتے ہیں اور ان کی پرواز عالم بالا ہی کی طرف رہتی ہے - چنانچہ کہتے ہیں -

مست کر دیتی ہے ایسا یہ شراب سر جوش
نظر آتی ہے مئے حسن سے دنیا مدہوش
سیر جنت میں رہا کرتے ہیں چشم و لب و گوش
مجھہ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش
ہر گھڑی عالم بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انساں کو دنیا کی خبر رہتی ہے

پھر اسی ترنگ میں کہتے ہیں -

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے   لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

کوئی چیز برق کی سرعت کے ساتھہ جسم کی رگ رگ میں دوڑ جاتی ھے —

مسزبسنت کی نظم میں کہتے ھیں —

حکم حاکم کا ھے فریاد زبانی رک جاے
دل کی بہتی ھوئی گنگا کی روانی رک جاے
قوم کہتی ھے ھوا بند ھو پانی رک جاے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جاے
ھوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ھے
کچھہ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ھے

ان کے نزدیک حاصل شباب حب وطن ھے اور جوانی کا بہترین معیار حب‌وطن کا جوش —

جذبۂ قوم سے خالی نہ ھو سودائے شباب
وہ جوانی ھے جو اس شوق میں برباد رھے

قوم کے سورماؤں کو یوں الوداع کہتے ھیں

ساحل ھند سے جرار وطن جاتے ھیں
کچھہ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ھیں
رن میں باندھے ھوے شمشیر و کفن جاتے ھیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ھیں
سامنے ان کے ظفر بڑھکے پا چلتی ھے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ھے

چکبست اپنی آتش نوائیوں سے ھمارے دلوں میں آگ لگا دینا چاھتے ھیں۔ ان کے نغمے سلا دینے والے نہیں ھیں بلکہ خواب سے بیدار کر دینے والے ھیں۔ ان کی وطنی اور قومی شاعری ایک بانگ جرس ھے جو ھر گُم کردۂ منزل کو

اپنی جانب بلاتی ہے - ایک فوجی باجہ ہے جو تھکے ماندے سپاہیوں میں شوق رہ نوردی پیدا کرتا ہے - وہ ترانہ ہے ایک مضطرب اور بے چین روح کا جو سکون و جمود سے گھبرا کر ہیجان و تلاطم کی متلاشی ہو اور افسانہ ہے ایک درد مند دل کا جو قوم کی غفلت شعاریوں سے بیزار ہوکر چیخ اٹھتا ہے —

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

مراثی شعرائے متقدمین کے یہاں مرثیہ ایک مذہبی چیز ہوکر رہ گیا - اور اس کا اطلاق زیادہ تر واقعۂ کربلا کے متعلق مراثی پر ہونے لگا - اس میں شک نہیں کہ ہمارے مرثیہ گو شعرا نے اس قسم کے مراثی کو ان کے معراج کمال پر پہونچا دیا - اور اس کو اتنی ترقی دی جس کی نظیر کسی زبان کی شاعری میں نہیں مل سکتی - اور واقعہ ہے کہ ان کا جو احسان اردو شاعری پر ہے اس کا اعتراف زبان قلم سے ممکن نہیں - مگر مرثیہ کے حدود تو اور زیادہ وسیع ہیں جس میں کہ قومی اور شخصی مراثی بھی شامل ہیں - قومی مراثی کی جستجو شعرائے متقدمین کے یہاں بے کار ہے - اس لیے کہ وہ قومیت کے مفہوم ہی سے نا آشنا تھے - ہاں شخصی مراثی کی دو چار مثالیں شاید تفحص و کاوش کے بعد مل جائیں - مثلاً ایک تو غالب کا مرثیہ ہے جو عارف کی موت پر لکھا گیا تھا - جس کا ایک شعر یہ ہے —

کیوں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارت

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ایک مرثیہ مومن نے اپنی محبوبہ کی موت پر لکھا ہے۔ اس مرثیہ میں مضمون آفرینی ' مبالغہ اور رعایات لفظی کی بہتات سے گمان ہوتا ہے کہ یہ محض تخیلی نظم ہے —

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جان کو کیا ہوا

دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھہ سے

کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا

پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا

اس دست رشک پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا

شبنم کو پھر ہے جانب خورشید التفات

شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا

دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی

برہم ہے حال کاکل پیچاں کر کیا ہوا

لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی

کچھہ زخم بے مزا ہیں نمکداں کو کیا ہوا

بوے قباے یوسف گل ہے نسیم میں

اس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا

گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو

اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

دعوی ہے شوخیوں کا غزالان دشت کو
اس خوش نظر کی جنبش مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر
اس روے غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا

مگر تخیل اور صنایع و بدایع کے ساتھ جذبات و احساسات بھی ہیں جو بیک وقت پر درد اور تیز ہیں —

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب
نعش اس کی جاے ہے سر بازار ہاے ہاے

اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ نظم واقعہ پر مبنی ہو۔ بہر حال اس میں کچھ خوبیاں ضرور ہیں جو مرثیہ کا رنگ قائم رکھتی ہیں —

اردو شاعری کے دور جدید میں سب سے پہلے مرثیہ لکھنے والے' میرا مطلب قومی و شخصی مرثیے سے ہے' حالی تھے۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور مرثیہ غالب کی موت پر لکھا گیا ہے۔ اس میں کلام کی سادگی اور بےساختگی قابل داد ہے —

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے دہر تو نے کی جس سے بیوفائی کی

یہ انسان کی فطرت ہے کہ کسی کے مرنے سے اس کی اپنی فضا میں جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اس پر خاص طور سے آنسو بہاتا ہے اور یہیں سے اس غمناک واقعہ کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے۔ اپنے ذاتی رنج و غم کا اظہار کرنے سے مرثیہ کی شان بڑھ جاتی ہے۔ ملٹن اور گرے کے مراثی پر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں اپنے نقصان اور اپنے رنج و غم کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ مگر حالی کے مرثیہ میں یہ باتیں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں —

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل کس سے داد سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

کس قدر بے چارگی کا اظہار کیا ہے - اور کس قدر سچے جذبات ہیں۔ کلام کا درد ملاحظہ ہو —

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں

غالب کے عیوب ایسی خوبی سے پیش کئے ہیں کہ محاسن بن گئے ہیں اور تصنع نہیں معلوم ہوتا —

بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

تمام مرثیہ میں صرف چند اشعار نکلیں گے جن میں تصنع سے کام لیا گیا ہو مثلاً —

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

مگر بحیثیت مجموعی یہ مرثیہ بے نظیر ہے —

حالی کے بعد اور شعرا نے بھی اس میدان میں قدم بڑھایا - مگر چکبست ان سب میں سبقت لے گئے - اُن کی کامیابی یقینی تھی - ایک تو جس رنگ شاعری کو انہوں نے اختیار کیا تھا مرثیہ گوئی کے لیے موزوں تھا - مرثیہ میں بیان سادہ زبان صاف اور شیریں ہونی چاہئے - کلام میں روانی اور ترنم چاہئے - مبالغہ و اغراق سے کلام پاک ہو - واقعیت اور اصلیت کو زیادہ دخل ہو - جذبہ نگاری مرثیہ کے لیے ضروری ہے - تخیل میں آورد نمایاں نہ ہو - استعارات و تشبیہات بہت لطیف و

سنجیدہ ہوں ورنہ تصنع معلوم ہوگا - شاعر کے جذبات سچے ہوں تاکہ بناوٹ نہ معلوم ہو - کلام میں سوز و گداز ہو - یہ سب صفات چکبست کی شاعری میں پائی جاتی ہیں - دنیا کے سب سے بڑے مرثیہ گو کی تقلید کر کے ان کی زبان اور ان کا طرز بیان خاص طور پر مرثیہ گوئی کے لیے موزوں ہو گیا - علاوہ بریں وہ فطرت کی طرف سے ایک بے چین ہو جانے والا دل لائے تھے جو رقیق سے رقیق جذبات کی پرورش کر سکتا تھا - قومیت کی تبلیغ ان کی شاعری کا نصب العین تھا - قومی لیڈران سے جو ہمدردی ان کو تھی بیان کی جا چکی ہے - واقعیت اور اصلیت کو انھوں نے اپنی تمام شاعری میں ملحوظ خاطر رکھا - پھر ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ کون اس میں کامیاب ہو سکتا تھا - اقبال کی بھی کچھ نظمیں ہیں جن کو مرثیہ کہا جا سکتا ہے - مگر واقعہ یوں ہے کہ اقبال کی شاعری مرثیہ گوئی کے لیے موزوں نہیں ہے - کلام کا سوز و گداز زور تخیل کا ساتھ نہیں دیتا - بڑی بڑی تراکیب فارسی اور تابناک الفاظ نوحہ خوانی کے لیے موزوں نہیں ہیں - تخیل کی رنگینی مرثیت کی شان کے منافی ہے - یہی وجہ ہے کہ اکثر جذبات کے بیان میں تصنع معلوم ہونے لگتا ہے - اقبال کی نظم "گورستان شاہی" انگریزی شاعر گرے کے مشہور عالم مرثیہ کو دیکھ کر لکھی گئی ہے - مگر انھیں وجوہات سے دونوں میں بعدالمشرقین ہے —

چکبست کے مراثی میں انفرادیت خاص چیز ہے جو واقعیت اور اصلیت کی جان ہے - ہر مرثیہ دوسرے سے ممتاز ہے" ہر ایک کے جذبات جدا گانہ ہیں، طرز بیان مختلف ہے - ہر مرثیہ میں سیرت نگاری مختلف ہے -

پنڈت بشن نرائن در کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے -

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے　　　حسن اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے

گوکھلے کے اوصاف یوں بیان کئے جاتے ہیں —

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

بال گنگا دھر تلک کی تعریف کرتے ہیں -

جان نثار ازلی شہر دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوے رن کا وارث
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

ایک کی سیرت دوسرے سے جدا ہے اور خاص خاص صفتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں - پھر ساتھہ ہی ساتھہ لب و لہجہ اور طرز بیان مختلف ہوجاتے ہیں - الفاظ کا انتخاب موقع و محل کے موافق ہوتا ہے - جیسا کہ اوپر لکھی ہوئی مثالیں بتاتی ہیں —

حسن بیان چکبست کے تخیل کو جذبات و احساسات کی دنیا سے آگے نہیں بڑھنے دیتا بلکہ وہ اس کی مدد سے دوسروں کے جذبات بر انگیختہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں —

بال گنگا دھر تلک کے مرثیہ میں کہتے ہیں -

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھہ سے تلوار گری جاتی ہے

گوپال کرشن گوکھلے کے مرثیہ میں کہتے ہیں —

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بابو گنگا پرشاد کے مرثیہ میں کہتے ہیں:

پیڑ سر سبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے
ڈوبتی کرنوں سے فواروں میں اک تاب بھی ہے
گل نو خیز بھی ہیں سبزۂ شاداب بھی ہے
شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے
تو کہاں ہے کہ جو اس باغ کا شیدائی ہے!
تجھ سے ملنے کے لئے فصل بہار آئی ہے!

جب زمانے میں ترے اوج کی نوبت آئی
زندگی ختم ہوئی موت کی ساعت آئی
کام کچھ بھی نہ جوانی کی ریاضت آئی
صبح پیری نہیں آئی کہ قیامت آئی
روشنی جس کی تھی ہر سو وہ ستارا ڈوبا
مٹ گئی شام اودھ قوم کا تارا ڈوبا

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن
اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوز وطن
اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوان کہن
چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے
قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

الفاظ کا انتخاب مختلف مراثی میں کتنا مختلف ہے۔ زبان کتنی

صاف ہے۔ کلام میں کیسی روانی ہے اور الفاظ کی اصلی ترتیب کیسی قایم رہتی ہے۔ اوپر لکھے ہوے بندوں کی ٹیپ میں کس قدر زور ہے۔ انہیں یاد آتے ہیں۔ آخری شعر کی رومانیت قابل تحسین ہے جدید شاعری کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ جذبات ابھارنے کا طریقہ بھی کتنے نفسیاتی پہلولئے ہوے ہے—

جہاں چکبست اپنے ذاتی جذبات کا اظہار کرتے ہیں کلام میں بہت سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے —

دو قدم لاش تری دوش پہ ہم دھر نہ سکے
آخری فرض محبت کا ادا کر نہ سکے

"نشتر یاس" میں کہتے ہیں —

دعائیں دیتے تھے جس گود میں کھلا کے تجھے
اسی میں آج سلایا کفن پنہا کے تجھے
گنہ گار ہوے لکھنؤ میں لا کے تجھے
خاموش بیٹھے ہیں اب خاک میں ملا کے تجھے

دعا کا غم نہ دوا کی ہے جستجو باقی
جو دل میں ہے تو ہے مرنے کی آرزو باقی

کتنے سچے اور مطابق فطرت جذبات ہیں - یہ بند بلاغت کا اچھا نمونہ ہے۔ کسی عزیز کے مرنے کے بعد عزاداروں کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا صحیح مرقع ہے۔ دوا و دعا کی کد و کاش ختم، وہی اضمحلال و افسردگی؛ وہی سو گوار خاموشی جو جذبات کے تلاطم کے بعد طاری ہوتی ہے اور وہی بے بسی کی آخری تمنا یعنے مر رہنے کی آرزو —

چکبست کی مرثیہ گوی بھی ایک حد تک ان کے قنوطیت کی ضامن ہے۔ وہ جب اپنے احبا و اعزا کی موت سے متاثر ہوکر بزم ہستی کو دیکھتے ہیں تو ان کا زاویۂ نگاہ اس قومی شاعر سے بالکل جدا ہوتا ہے

جو پیغام عمل دیکر زندگی کو سعی پیہم کا ایک لا متنا ھی سلسلہ بنا دینا چاھتا ہے —

اجل کی درازدستیاں عام ھیں اور ھر جگہ اس کا ھاتھہ یکساں پڑتا ہے - اس لئے ھم بھول جاتے ھیں ورنہ کسی کا مرجانا کیا کوئی معمولی بات تھی - آج اسی بنیاد پر مذھب و فلسفہ کی شاندار عمارتیں کھڑی ھوئی ھیں - مگر کیا انھوں نے یہ مسئلہ حل کردیا ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ کے حسن اعتقاد کی داد ملنی چاھئے اور اگر نفی میں ہے تو چکبست کے اس بند سے اپنے جذبات و خیالات کا تطابق کیجئے اور بتائیے کہ وہ انسان کی نفسیات کا کس حد تک آئینہ دار ہے -

کیا وہ ناداں ھیں جو کہتے ھیں زروے اعتبار
مصلحت رھتی ہے رنج و درد میں بھی اشکار
ہے فسانہ یہ حدیث صبر و تسکین و قرار
خواب ھستی کی نہیں تعبیر ایسی زینہار
میں نظام دھر میں کچھہ مصلحت پاتا نہیں
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہیں

یہ سچے شکوک ھیں اور ان کی طفلانہ معصومیت حقیقتاً اس عاجزی و بیچارگی کا احساس ہے جو راز ھستی کی جستجو کا منتہا ہے - اپنی نظم " ماتم یاس " میں کہتے ھیں —

تیری ھستی تھی اگر دیباچۂ اندوہ و غم
عالم فانی میں تو نے کس لیے رکھا قدم
ان پہ حسرت ہے جو یوں دیتے ھیں غمگینوں کو دم
خواب ہے دنیا یہاں کیسی خوشی کیسا الم

انتظام دھر میں آخر ھے یہ تدبیر کیا
خواب ھے دنیا تو ھے اس خواب کی تعبیر کیا

مگر چکبست روح کو ان مایوس خیالات کی تاریکی میں چھوڑ دینا نہیں پسند کرتے - وہ تہ میں ڈوب جاتے ھیں اور جب تھاہ نہیں ملتی تو اُبھر بھی آتے ھیں - وہ اعتراف شکست نہیں کرتے - گوھر مقصود نہیں ملتا نہ سہی اس کی آرزو تو ھمیشہ دل میں رھے گی - یہی تسکین کیا کم ھے ' خواہ اسے انسانی کوششوں کی ٹریجڈی کہیے یا کمیڈی —

چشم ظاھر بیں کو اب دیدار تیرا ھے محال
ھے مگر آراستہ تجھ سے مری بزم خیال
یہ وہ عالم ھے جسے مانا ھے سب نے لازوال
ھو مخل یاں اپنی صحبت میں فلک کی کیا مجال
ھاں فنا کردوں گا میں نیرنگیٔ تقدیر کو
آئینہ میں دل کے رکھوں گا تری تصویر کو

چکبست بحیثیت غزل گو

ان کی غزلیات کی زبان و طرز بیان کا رنگ وھی ھے جو ان کے کلام کا بحیثیت مجموعی ھے - ان کی غزلیات میں کوئی ربط خیال نہیں ھے - یوں بھی سوائے غزل مسلسل کے جس کی مثالیں نسبتاً بہت کم ھیں ھماری غزلیات کا ھر شعر مختلف کیفیات کا ترجمان ھوتا ھے - ایک شعر میں ھجر کی تکلیفیں بیان کی جاتی ھیں اور دوسرے میں وصل کی لذتیں - اور سمجھ میں نہیں آتا کہ دو مختلف و متضاد کیفیات کا احساس و ادراک شاعر کو بیک وقت کیسے ھوجاتا ھے - مگر یہ تنوع چکبست کے یہاں اور بڑھ جاتا ھے - ان کے یہاں نہ صرف مختلف کیفیات بیان کی جاتی ھیں بلکہ ھر شعر کا موضوع جداگانہ ھوتا ھے - ایک ھی غزل

میں وہ آزادی کا راگ گاتے ہیں ' موجودہ نظام حکومت پر تعریضیں کرتے ہیں ' حب وطن کی تلقین کرتے ہیں' نوجوانوں کو درس عمل دیتے ہیں' مغربی تہذیب پر چوٹیں کرتے ہیں ' فلسفہ زندگی بتاتے ہیں ' اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں ' تصوف کے نکات سمجھاتے ہیں' شہداے قوم کی تعریفیں کرتے ہیں' ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کی غزل اشعار متفرق کا ایک مجموعہ ہے جو آپس میں کوئی ربط خیال نہیں رکھتے اور جو صرف قافیہ و ردیف کی شیرازہ بندی سے باہمدگر پیوستہ ہیں —

ان کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں تسلسل بیان ' ربط فکر ' اور خیالات کی مرکزیت پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ترتیب و تشکیل بھی غزل ہی کے اصول پر ہوئی ہے - مگر چونکہ موضوع تغزل سے قطعی نا آشنا ہے اس لیے ان کو غزل یا غزل مسلسل نہیں کہا جا سکتا - ایسی نظموں کے انداز بیان میں بے شک تغزل پایا جاتا ہے ' مگر وہ صرف ایک پردہ ہے جس کی آڑ میں چکبست اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں - ان نظموں میں ان کا محل نظر کوئی خاص سیاسی واقعہ یا سوسائٹی کی کوئی خاص حالت ہے - مثلاً وہ نظم جو مسزبسنت کی رہائی پر لکھی گئی ہے یا وہ جو پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ پر لکھی گئی ہے یا وہ قطعہ جو ہندوستان کی اس وقت کی حالت پر روشنی ڈالتا ہے ع کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی ۔ اور پھر وہ جو ہندو مسلم نا اتفاقی پر لکھی گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

چونکہ غزل کا دائرہ موجودہ زمانے میں بہت وسیع کر لیا گیا ہے

کیونکہ یہی صنف سخن اب تک مقبول عام اور پسندیدۂ انام ہے اور شعرا عموماً اسی میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور اپنے تمام خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس لیے چکبست کی بقیہ غزلیات کو غزل قرار دینا مجبوری ہے۔ بحیثیت مجموعی چکبست کے یہاں صحیح تغزل کا عنصر بہت کم ہے اور جہاں کہیں ہے بہت مشتبہ حالت میں، کیونکہ اکثر وہ اس کے پردے میں نظام حکومت پر تعریضیں کرتے ہیں —

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمان وفا کیجئے ظلم مگر وہ بھی کوئی یاد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کردیں مگر یقین ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

فغان درد دل پر بھی گماں ہے بد زبانی کا
ستمگر سن نہیں سکتا ہے شائد داستاں اپنی
کہیں تو کیا کہیں یا چپ رہیں مظلوم حیراں میں
بیان کرتے ہیں وہ اپنی زباں سے خوبیاں اپنی

ڈر گیا نالۂ شبگیر سے میرے صیاد شام کو قید کیا صبح کو آزاد کیا

فکر مینا کیوں ہے ساقی کیوں تلاش جام ہے
تو لگا دے منہ سے خم پینا ہمارا کام ہے

چکبست کے یہاں گو تغزل بہت کم ہے مگر پھر بھی ان کی غزلیات کے اکثر اشعار اپنے رنگ میں بہت خوب ہوتے ہیں۔ جذبہ نگاری جوش بیان حسن تخیل اور محاکات کی اچھی اچھی مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں

انسانی زندگی شیرازہ ہے ان ارمانوں کا جن کی پرورش نہیں معلوم کن کن امیدوں سے گہوارۂ دل میں کی جاتی ہے ۔ پھر ایک نا کام آرزو کا دم توڑنا جو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ (بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے) کتنا حسرت ناک منظر ہے ۔ نزع کی ہچکیوں کے پیہم جھٹکوں کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح ان ارمانوں سے دامن چھڑانا چاہتی ہے اور کامیاب نہیں ہوتی —

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

ولولوں کے وفور و جوش کا وہ وقت جب کہ وہ منتہاے عروج پر پہنچ کر مائل بہ زوال ہوتے ہیں کتنا درد ناک ہوتا ہے ۔ اس خیال سے کہ اب یہ ہیجان و تلاطم ایک بھیانک سناٹے میں مبدل ہو جاے گا ' وہ سناٹا جو سمندر پر طوفان کے گذر جانے کے بعد طاری ہوتا ہے —

نظر کے سامنے ہے شام نا کامی کا سناٹا
جوانی ولولوں کی ڈھل رہی ہے دوپہر ہوکر

جوانی کی امنگیں ردائے خواب میں ملفوف مست و بے خبر ہیں ' صرف حسن کا فرشتہ انھیں جگا سکتا ہے اور جگاتا ہے

فرشتہ حسن کا بیدار کرنے ان کو آیا ہے
جوانی کی امنگیں سو رہی تھیں بے خبر ہوکر

ایک نو گرفتار کیا جانے کہ آشیاں سے دور پابند قفس ہوکر ایک سوگوار سکون حاصل کرلینا بھی غنیمت ہے کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب شکستہ پری قفس کی آڑ ڈھونڈھتی ہے اور نا کام رہتی ہے ۔ اسے تو ایک بے بال و پر ہی خوب سمجھ سکتا ہے کہ بے بسی کی انتہا تو وہاں ہوتی ہے جہاں

آشیاں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور قفس سے جدا ہو جانا بھی محرومیٔ قسمت کی دلیل بن جاتا ہے —

قفس کی آڑ سے محروم ہیں ہم آشیاں کیسا
پڑے ہیں دور صحن باغ سے بے بال و پر ہو کر

کسی کو اپنی دکھ بھری داستاں سنانی ہے۔ امیدیں، آرزوئیں، شکوے، شکایت سب بیک وقت ہجوم کرتے ہیں مگر چونکہ سننے والے کو پہلے ہی سے اپنا جواب معلوم ہے جو نفی میں ہے اور ایک لفظ میں، اس لیے تفصیل کی اجازت نہیں ہے۔ ادھر وفور شوق تاب گویائی چھین لیتا ہے، تمام جذبات کھینچ کر آنکھوں میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور ایک نگاہ یاس ساری داستان مختصر کر جاتی ہے اور پھر وہ سب کچھ کہہ جاتی ہے جو زبان سے کبھی نہیں ہو سکتا —

تفسیر حال زار ہے بس ایک نگاہ یاس ہو داستان درد کا اور اختصار کیا

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں -
حسن تخیل -

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم ابھار کا آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا

رخ ہے ساقی کے طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے رہنما آج مری لغزش مستانہ ہے

عالم یاس میں کہتا ہے یہ دریا سے حباب غیر سیراب ہیں خالی مرا پیمانہ ہے

صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے پھول کرنوں سے یہ کہتے ہیں تمہارا کام ہے

اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار سبزہ و گل صحن زنداں میں نمایاں ہو گئے

حسن کی دولت سے تھے گلہائے نورس بیخبر
دیکھ کر رنگ چمن کانٹے نگہباں ہو گئے

جوش بیان جو بقول ملٹن شاعری کی تین صنعتوں میں سے ایک ہے،

جام تک خم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہو گئے
مے کے قطرے کیا تھے جب تک خم میں تھے ساغر میں تھے
میرے ہونٹوں تک پہنچنا تھا کہ طوفاں ہو گئے
جن کی شورش کے لیے آغوش دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ ان آنکھوں میں پنہاں ہو گئے

محاکات - تخیلی اور بہاریہ —

شجر سکتے میں ہیں خاموش بلبل ہیں نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں
پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوے
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا
آے ہیں پھول باغ میں ساغر لیے ہوے
برسے شراب ہے یہ اشارہ بہار کا
منظور ہے کہ آمد گل کا پیام دیں
کلیاں بلا رہی ہیں نسیم بہار کو
اترے ہیں صحن باغ میں پھولوں کے قافلے
نذریں دکھا رہے ہیں عروس بہار کو
عکس مہ قطرہ شبنم میں ہے شبنم گل پر
پردۂ شب میں چمک اٹھی ہے تقدیر بہار

جذبہ نگاری —

ہواے تازہ دل کو خود بخود بیچین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

صحن چمن سے دور اسے باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں
ہجوم بے کسی ہے شام تنہائی ہے اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کر دے یہ سماں میرا
چمن کو چھوڑ دوں یہ بد نصیبی کا اشارہ ہے
وہی مرجھا گئی جس شاخ پر تھا آشیاں میرا

چکبست کا پیغام

چکبست کا پیغام آزادی تھا۔ وہ ہر جگہ آزادی کا راگ گاتے رہے۔ ان کے نغمات کے موضوع مختلف ہیں مگر لے سب کی یکساں ہے۔ یہ لے آزادی کی تھی۔ حب وطن، ساسۂ قومی، اتحاد باہمی، ارتقاے علمی، تعلیم نسواں، تربیت اطفال غرضکہ وہ تمام تعلیمات جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے مختصر سے کلام میں کی ہے ایک مرکز پر مجتمع ہوتی ہیں۔ یہ مرکز آزادی کا تھا۔ ان کے خیالات کا منتہا، ان کی تمناؤں کا مرکز، ان کی امیدوں کا مرجع آزادی تھی اور اسی کا حصول ان کی تعلیمات کا لب لباب ہے۔ جس ملک کی آب و گل سے ان کا خمیر بنا اس کی نجات اسی میں تھی، جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی اسی کا مقتضی تھا، جس قوم کے وہ رہبر بنے اسی کی جویا تھی۔

چکبست کا کلام ان کے ماحول سے اتنا متاثر ہے کہ ان کو اردو شاعری کا ٹنی سن (Tennyson) کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کی کچھ نظمیں کسی خاص سیاسی واقعہ کے تحت میں وقتی جذبات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں جو کسی روز نامہ کے سر ورق کو تو زینت دے سکتی ہیں مگر صفحۂ روزگار پر کوئی ہلکا سا نقش بھی نہیں چھوڑ سکتیں۔ جس طرح ٹنی سن Tennyson کی ایسی نظمیں گوشۂ گمنامی میں پڑگئی ہیں اسی طرح چکبست کی بھی یہ

نظمیں جو اپنے اندر کوئی غیر فانی عنصر نہیں رکھتیں بقاے دوام سے محروم رہیں گی جب کہ موجودہ زمانے ہی میں ان کی قدر کم ہو چلی ہے اور وہ بے کیف معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخی حیثیت سے اُن کی اہمیت مسلم رہے گی ۔ اِن کا بقیہ کلام البتہ پائدار ہے اور اس کی بنیاد دیں استوار —

امتداد زمانہ کے ساتھ خیالات میں تغیر ہو گا ۔ معیار میں تبدیلی ہو گی ۔ اصول میں ارتقا ہو گا اور وہ سب کچھ ہو گا جسے انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایک مستقبل بعید میں جب ہندوستان آزاد ہوچکا ہو گا اور شراب نو کے سرور میں " دیر و حرم کی ناچاقی " مٹ چکی ہوگی ۔ ہندوستانی سب ایک ہوں گے ۔ آپس کا تفرقہ و امتیاز قصۂ ماضی ہو جاے گا ۔ ان کے مرفو بات کچھ اور ہوں گے ' ان کے معتقدات کچھ اور ۔ ان کی تہذیب نئی ہوگی اور ان کا نظام تمدن جدید ۔ مگر کیا وہ اس وقت اس شاعر گوشہ نشین کو بالکل فراموش کردیں گے جس نے ان کے عہد غلامی میں ان کو آزادی کا نغمہ سنایا ' جس کے " صور حب قومی " نے ان کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کیا ' جس کی دعوت عمل نے ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا جس نے ان کی مصیبتوں پر اپنا دل دکھایا اور جس نے ان کی بیچارگی پر آنسو بہاے ۔ کون کہہ سکتا ہے —

خطبات گارساں دتاسی

سترھواں خطبہ

مترجمۂ

(جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ

(پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات !

میرے ہر سال کے خطبے میں بعض باتوں کا اعادہ بار بار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا موضوع بڑی حد تک محدود ہے یعنی ہندوستانی زبان کی دونوں شاخوں (اردو اور ہندی) کی جو ترقی ہو رہی ہے اس کا ذکر۔ سب سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس نا قابل تلافی نقصان کے بارے میں کچھ کہوں جو ہندوستانی ادبیات کو میجر اے آر فلر (A. R. Fuller) کی بے وقت موت کی وجہ سے برداشت کرنا پڑا - مرحوم چھٹی پر انگلستان آئے ہوئے تھے تا کہ اپنے بچوں کو دیکھ لیں اور واپسی پر اپنی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں - ان کا پیرس آنے کا بھی مصمم ارادہ تھا۔ اس شہر سے انہیں دلی اُنس تھا - آپ ابھی ہندوستان واپس ہی پہنچے تھے کہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں ۲۰ اگست کو دیہات میں جانا پڑا - آپ ایک نوجوان افسر کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں جا رہے تھے - راستے میں شہر راولپنڈی کے نزدیک ایک نالہ پڑا جو برسات کے موسم میں خوب بھر جاتا ہے اور اس میں پانی نہایت تیزی کے ساتھ

بہتا ہے - جب گاڑی بیچ نالے میں پہنچی تو اس کے پہئے
چٹانوں میں اڑ گئے - میجر فلر اور ان کے ساتھی دونوں گاڑی پر
سے اتر پڑے تاکہ پہیوں کو ہٹانے میں مدد دیں - پانی اس زور
کا تھا کہ وہ دونوں زیادہ دیر تک نہ ٹھیر سکے - پانی دونوں کو دور بہا لے
گیا - چند گھنٹوں کے بعد ان دونوں کی نعشیں دور کسی مقام پر ملیں —

اس حادثے کے وقت میجر فلر کی عمر اڑتیس سال کی تھی - پچھلے
سال اسی قسم کا ایک حادثہ کلکتہ کے ایک پادری کو پیش آیا جس کا
انجام وہی ہوا جو میجر فلر کا ہوا - ان پادری صاحب کی تبدیلی کلکتے
کے متوفی پادری کی خدمت پر ہوئی تھی - کلکتہ پہنچ کر وہ ایک
کشتی پر سوار ہو رہے تھے کہ پاؤں پھسلا اور وہ دریا میں گر کر ڈوب گئے —

اسی زمانے میں جب کہ میجر فلر کا انتقال ہوا مسٹر ای آی ہاورڈ
نے داعی اجل کو لبیک کہا - آپ صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات تھے - انتقال
کے وقت آپ کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی - آپ ریل پر چڑھتے وقت گرے
اور گرنے سے جو صدمہ پہنچا اس سے جانبر نہ ہوسکے —

میجر فلر نے پنجاب میں صیغۂ تعلیم کی تنظیم کی - آپ نے جو سالانہ
رپورٹیں لکھی ہیں اور ان کے علاوہ جو جو رسائل انگریزی اور اردو میں خود
شائع کیے یا دوسروں سے لکھوائے ، ان سے میں نے اپنے پچھلے خطبوں میں بہت
کچھ استفادہ کیا ہے اور تعلیمی مسائل پر معلومات حاصل کی ہیں —

اس سال میرے مستشرق دوستوں میں جارج سیسل رینوارڈ (George
Cecil Renouard) کا بھی انتقال ہوگیا - آپ کی عمر چھیانوے سال کی تھی،
آپ کا تعلق بہت عرصے تک قسطنطنیہ کے انگریزی سفارت خانے سے رہا

پھر پینتالیس سال تک کیلنٹ میں Swascombe کے مہتمم رہے - آپ کو مشرقی السنه میں ترکی سے خاص مناسبت تھی - آپ بہت بڑے ہمدرد انسان تھے - جو لوگ آپ سے ملتے انھیں آپ سے اُنس پیدا ہو جاتا تھا —

" پیرس والی مناجات " کے یہ الفاظ سچ ہیں کہ " موت بر حق ہے - ہر چند کہ اس سے انسان کے دل کو ملال ہوتا ہے لیکن مستقبل کی ابدی زندگی کا خیال ' جس کا وعدہ کیا گیا ہے ہمارے لیے باعث تسکین ہوتا ہے - ... جب ہم مرتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زندگی ختم ہوگئی بلکہ وہ اپنا روپ بدل کر پھر ظہور پذیر ہوتی ہے - جب اس خاکدان تیرہ کی عمارت گر پڑتی ہے تو اس کے ساتھ آسمانوں پر ہم اپنے لیے ابدی مکان تعمیر کر لیتے ہیں " —

میجر فلر اور دوسرے احباب نے مجھے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں اور انگریزی اور ہندوستانی اخبارات سے میں نے جو مسالا جمع کیا ہے اسے میں اپنے اس خطبے میں آپ صاحبوں کے رو برو پیش کروں گا - اس سے آپ کو اُس ادبی اور معاشری تحریک کے متعلق معلومات حاصل ہوں گی جو آج کل ہندوستان میں جاری ہے —

مسٹر ایف ایچ جیون[5] (F.H.Jeune) نے اپنی کتاب میں جس کا نام " ہندوستان میں اسلامی اقتدار " ہے سچ کہا ہے کہ " ہندوؤں کی معاشری ساخت ایسی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کو ہندوستان میں جلد کامیابی حاصل ہوجاتی ہے - لیکن باوجود اپنی شکست کے وہ اپنے اداروں کو قایم رکھنے کی سعی کرتے ہیں - ان کے یہ ادارے حضرت مسیح کی بعثت سے پہلے سے قایم ہیں اور انھیں دوسری اقوام عالم سے ممتاز کرتے ہیں - ان

اداروں کی بدولت وہ دوسروں میں ضم ہونے سے بچ گئے " - ہمیں پوری امید ہے کہ ہندوؤں کو اہل یورپ سے جو ملنے کا موقع ملا ہے اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ توہمات جو اب تک ان میں چلے آرہے ہیں مٹ جائیں گے - اہل یورپ کے ساتھہ میل جول بڑھنے سے بظاہر اچھے نتائج پیدا ہورہے ہیں —

میں پچھلی کسی صحبت میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکوں کی نسبت ذکر کر چکا ہوں - ایک اصلاحی انجمن " وید سماج " ہے اس کے دو خاص اصول ہیں —

(۱) میں ہمیشہ ایسے پرماتما کو پوجوں کا جو اعلی اور برتر ہے ' خالق ہے ' زندگی کو قایم رکھنے والا ہے اور اس کو برباد کرنے والا بھی ہے - بغیر اس کی مہربانی کے انسان نجات نہیں حاصل کرسکتا - وہ قادر مطلق ہے اور علیم و بصیر ہے - اس کی کوئی صورت نہیں نہ اس کا کوئی مثل ہے - میں اس کے علاوہ اپنا سر نیاز کسی اور کے آگے نہیں جھکاؤں گا —

(۲) میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ اپنی عبادت میں بھی وحدانیت کے اصول پر حتی‌الوسع عمل پیرا رہوں - میں اپنی عبادت سے ان توہمات کو خارج کروں کا جو فی‌الوقت ہندو دھرم کا جزو بن گئے ہیں * —

یہ انجمن اسی طرز کی ہے جیسے " برہمو سماج " کی انجمن - اس کے اصول کی تدوین کیشب چندرسین نے لاہور میں کی ہے - تیئیس فروری کو لاہور میں اس انجمن کا جلسہ ہوا جس میں چار سو آدمیوں نے شرکت

---

* اس کے متعلق تفصیل " Colonial Church Chronicle " میں ملے گی —

کی جن میں انگریز اور ھندوستانی دونوں شامل تھے - پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بہادر نے بھی شرکت کی - اس جلسہ میں بابو کیشب چندرسین نے ھندوؤں کے مذھبی نشاۃ ثانیہ پر نہایت دلاویز پیرایہ میں تقریر کی - چنانچہ بابو صاحب نے بتایا کہ اس تحریک کی بڑی خصوصیت یہ ھے کہ بت پرستی ترک کی جا رھی ھے اور ایک خدا کی پوجا لوگوں میں رواج پکڑ رھی ھے - ایسا خدا جس کے علاوہ کسی اور کی پوجا جائز نہیں —

اس ھندو فلسفی کی تقریر کو لوگوں نے کان دھر کے سنا اور دلچسپی کا اظہار کیا - پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے مقرر کی تعریف و توصیف کی اور یہ توقع ظاھر کی کہ جن اصول کو اس نے پیش کیا ھے وہ مقبول ھوں گے - ساتھ ھی یہ بھی کہا کہ چونکہ مقرر نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں کی ھے اس لیے عوام کے لیے بہتر ھو گا اگر اس کا ھندوستانی زبان میں ترجمہ کرا کے تقسیم کیا جائے تا کہ ھر کس و ناکس ان زرین خیالات سے مستفید ھوسکے - (اخبار عالم - میرٹھ - سات مارچ سنہ ۱۸۶۷ ع) —

پنجاب میں ابھی حال میں ایک مذھبی انجمن قایم ھوئی ھے - اس کی کارروائیاں خفیہ ھوا کرتی ھیں - اس میں صرف ھندو اور سکھ موحدین شرکت کرتے ھیں - اس انجمن کے ارکان ان تمام رسوم سے احتراز کرتے ھیں جن میں بت پرستی کا شائبہ پایا جاتا ھے - (انڈین میل - فروری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

عیسائی مشنری ان انجمنوں کے مقاصد سے پوری ھمدردی رکھتے ھیں اس لیے کہ ان کے اصول میں مختلف مذاھب کی تعلیمات کا امتزاج ھوتا ھے - ان انجمنوں کی کامیابی سے خود ان کے خیالات و عقاید کی نشر و اشاعت میں مدد ملے گی - ھم تہ دل سے Rev. M. Kirk کے اس خیال کی تائید کرتے

ہیں، جس کا اظہار انہوں نے پچھلی جنوری بمبئی کے گرجا میں کیا تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو چاہئیے کہ وہ اپنی مذہبی اصلاح کے لیے ایک ایسی انجمن قایم کریں جو موحدین پر مشتمل ہو اور اس میں مسلمان بھی شرکت کریں - برہمنوں کو اگر دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل ہو تو اس لیے ہو کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے نیکی میں بڑھے ہوے ہیں - اگر کوئی شودر ذات کا آدمی اچھے اخلاق رکھتا ہو تو اس کو بھی برہمنوں میں شمار کرنا چاہئیے - پارسیوں کا یہ عقیدہ بالکل ٹھیک ہے کہ دنیا میں آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں، اچھے اور برے - اچھوں کو اپنی بھلائی کا اجر ملے گا اور بروں کو اپنی برائی کے نتائج بھگتنا پڑیں گے - موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا: " قدیم زمانے میں ہندو لوگ زندگی کا کمال حاصل کرنا چاہتے تھے - اب اس زمانے میں بھی آپ اپنے حسن عمل سے کمال حاصل کر سکتے ہیں - لیکن وہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب کہ ہندو اور مسلمان، یورپی اور ہندی کے تمام تر امتیازات مٹ جائیں اور لوگ اپنے تئیں بھائی بھائی سمجھنے لگیں - صداقت کی راہ میں اور اپنے عقاید کی خاطر وہ جو مشکلات اس دنیا میں برداشت کریں گے خدا انہیں ان کا اجر دے گا "

(یکم مئی ۱۸۶۷ء Colonial Church Chronicle) —

ہندوستان میں انگریزی حکومت اصلاحی تحریکوں کی حتی المقدور امداد کرتی ہے اور ان قدیم رسم و رواج کی مخالفت کرتی ہے جن سے لوگوں کو اذیت پہنچے - چنانچہ بڑودے میں یہی ہوا - بعض کٹر مذہبی لوگ چونکہ قانوناً بیوہ عورتوں کو جلا نہیں سکتے تھے اس لیے وہ ان کے سر منڈوانا چاہتے تھے - لیکن حکومت نے انھیں ایسا کرنے سے جبراً باز رکھا - لیکن بعض اوقات حکومت کو ایسے توہمات سے چشم پوشی برتنی پڑتی ہے جو

لوگوں کے لیے باعث زحمت ہوتے ہیں - بعض تعلیم یافتہ ہندوؤں نے جن پر یورپی اثر غالب معلوم ہوتا ہے حکومت سے درخواست کی ہے کہ دریائے گنگا میں نعشیں پھینکنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے - لیکن حکومت نے کٹر طبقے کی دل شکنی گوارا نہیں کی - لیکن بیوہ عورتوں کو جلانے کے متعلق حکومت ہر جگہ دخل اندازی کرتی ہے - اگر کہیں اس قسم کے واقعے کا اندیشہ ہو تو نزدیک کے تھانے میں رپورٹ کردینی چاہئے - پولیس اس کی روک تھام کے لیے موجود رہتی ہے - حکومت کی اس دخل اندازی کو قدیم طرز کے کٹر ہندو بری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن روشن خیال ہندوستانی جن کے دل میں مخلوق کا درد ہے وہ حکومت کے ساتھ ہیں - اس قبیح رسم کے متعلق افسوس نے اپنی کتاب " آرائش محفل " میں المناک تصویر کھینچی ہے - اس نے جو قصہ بیان کیا ہے وہ صوبۂ بنگال میں مقام چکدہ سے متعلق ہے —

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اب توہمات بہت کم ہو گئے ہیں - پچھلی مرتبہ ہردوار میں جو میلا منعقد ہوا اس میں ہندوستان کے طول و عرض سے دو لاکھ پچپن ہزار آٹھ سو لوگوں نے شرکت کی - یہ میلا بارہ اپریل کو منعقد ہوا تھا - اکتوبر کے مہینے میں درگا پوجا اور دسہرے کے تیوہار منائے گئے - ان میں بھی بڑی چہل پہل رہی —

ایک ہندوستانی اخبار میں ایک بوڑھے برہمن کا قصہ لکھا ہے جو دکن کی طرف سے جاترا کے لیے متھرا آیا تھا - اس شہر کو ہندو لوگ بہت عزیز رکھتے ہیں - اس لیے کہ وہ کرشن مہاراج کا جنم بھوم ہے جو وشنو کے اوتار تھے - اس برہمن کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی جس کی عمر صرف نو سال کی تھی - اس لڑکی نے ایک رات خواب دیکھا کہ کرشن مہاراج اس کو اپنے

عقد میں لانا چاہتے ھیں - بھلا اس خواب کی صداقت پر کسیے شبہ ھوسکتا تھا ؟ چنانچہ دوسرے دن لڑکی کا عقد کرشن مہاراج کے بت کے ساتھ کردیا گیا - متھرا کے ھندوؤں میں اس موقع پر خوب خوشیاں منائی گئیں - لوگ اس لڑکی کو دیوی خیال کرنے لگے - اب یہ لڑکی متھرا سے لکھنو چلی گئی ھے اور وھاں " گول دروازہ " میں مقیم ھے - ھر روز صبح کے وقت ھزار ھا ھندو اس لڑکی کے ھاں جمع ھوتے ھیں اور اس کی زبان سے " بھگوت گیتا " سنتے ھیں - ھر روز مٹھائیاں اور چاندی کے زیور اور برتن بطور تحفہ پیش کیے جاتے ھیں —

ھندوستان کے اکثر راجا مہاراجا ترقی کی تحریک کا ساتھ دے رھے ھیں - ان میں مہاراجا جے پور خاص کر قابل ذکر ھیں - موصوف نے اپنے ھاں آٹھ ارکان کی ایک کونسل قایم کی ھے تاکہ اس کے مشورے سے حکومت کا نظم و نسق انجام دیا جاے - ان مہاراجا کا یہ دعویٰ ھے کہ وہ رام چندر جی کی اولاد سے ھیں - چند پشت قبل سترھویں صدی کے آواخر میں اس خاندان میں راجا جے سنگھ گذرے ھیں جنھیں ریاضی اور فلکیات سے بہت دلچسپی تھی - اس وقت مہاراجا جے پور کو ھندوستانی تہذیب و تمدن کے علم برداروں میں شمار کرنا چاھئیے - موصوف کی راجدھانی ھندوستان کے اول درجے کے شہروں میں شمار ھونے کی مستحق ھے —

وجاھت علی نے " اخبار عالم " (۸ اگست سنہ ۱۸۶۷ ع) میں نواب رام پور کی بھی بہت تعریف و توصیف لکھی ھے - موصوف کا نام کلب علی خاں ھے - آپ کو علوم و فنون سے خاص دلچسپی ھے - آپ نے متعدد کالج قایم کراے ھیں اور آپ چاھتے ھیں کہ ھندوستان میں مشین کے رواج کو فروغ ھو - آپ اھل علم و فضل کو خطابوں سے نوازتے ھیں -

مہاراجہ میسور بھی ہندوستان کے ہوشمند والیاں ملک میں سے ہیں - ابھی حال میں آپ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانی اور فارسی عربی کتابوں کا ایک کتب خانہ قایم کریں - مہاراجہ کے سکریٹری نے ہندوستان کے طول و عرض میں مختلف کتب فروشوں اور مطابع کو لکھہ دیا ہے کہ وہ اپنے ہاں کی مطبوعات بھیج دیا کریں - ریاست کی طرف سے ان کی کتابوں کی قیمت ادا کردی جاے گی - (اخبار عالم ' تین جنوری سنہ ۱۸۶۷ ع)

ہندوستانی اخبارات میں کچھہ عرصے سے یہ خبر شایع ہورہی ہے کہ حال میں مہاراجا بھرت پور انگلستان آنے والے ہیں - سنا ہے کہ آپ کے اعلی عہدہ دار اور آپ کی رانی صاحبہ اس سفر کے خلاف ہیں اور اس کو محض بیکار تصور کرتے ہیں - انھیں در اصل یہ خدشہ ہے کہ کہیں مہاراجا مسیحی مذہب نہ قبول کرلیں - لیکن نوجوان مہاراجا کی تعلیم و تربیت مغربی فضا میں ہوئی ہے - انھیں ان تمام باتوں کی مطلق پروا نہیں ہوگی اور وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کرکے چھوڑیں گے - ان کی غیر موجودگی کے زمانے میں ایک کونسل ریاست کے فرائض حکومت انجام دے گی - (اخبار عالم سات فروری سنہ ۱۸۶۷ ع)

مہاراجہ اندور کا بھی قصد ہے کہ ولایت جائیں - چنانچہ انھوں نے برھمن علما کی ایک مجلس منعقد کی جس نے ان کے سفر کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگر مہاراجا کھانے پینے میں پورے طور پر مذہبی پابندی کریں تو ان کے یورپ جانے میں کچھہ مضائقہ نہیں ہے - اس کی وجہ سے وہ ذات باہر نہیں ہوں گے - ذاتی طور پر سفر سے انھیں تجربہ اور واقفیت حاصل ہوگی —

انگلستان میں یہ خبر مشہور ہے کہ مرشدآباد کے نواب ناظم وہاں آنے والے ہیں - کلکتہ میں ایک نہایت تعلیم یافتہ یورپین رہتا ہے جس

کا ارادہ ھے کہ اپنے ساتھہ بعض ان هندوستانیوں کو یورپ کے سفر کے لیے لائے جو بہت دنوں سے آنا چاھتے ھیں لیکن ساتھی نہ ھونے کے باعث اپنا ارادہ پورا نہیں کر سکے - یہ یوروپین هندوستانی زبان اچھی طرح بول اور لکھہ سکتا ھے - اس کے همراھیوں میں هندو اور مسلمان دونوں شامل ھیں - اودہ اخبار کے مدیر پنڈت نول کشور نے وعدہ کیا ھے کہ وہ یورپ کے سفر کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائیں گے —

هندوؤں اور مسلمانوں کی ادبی انجمنیں اپنی بس بھر پوری کوشش کر رھی ھیں کہ اپنے علوم و ادب کی نشرو اشاعت کا انتظام کریں اور ساتھہ ھی مغربی علوم و فنون کو بھی اپنے ھاں رواج دیں - ان میں لاھور اور علی گڑہ کی انجمنیں خاص کر مفید کام کررھی ھیں —

لاھور کی انجمن ڈاکٹر لٹینر (Dr. Leitner) کی سعی و جہد کی مرھون منت ھے - پچھلے دنوں اس انجمن کے کام کی رفتار ذرا سست ھوگئی تھی لیکن اب اس کی حالت سدھر گئی ھے - اپریل کے مہینے میں اس انجمن کا ایک عام جلسہ منعقد ھوا جس میں مولوی محمد حسین نے جو اس کے معتمد ھیں ' یہ اعلان کیا کہ آئندہ سے انجمن اس امر کی کوشش کرے گی کہ غربا کی ضروریات پورا کرنے میں بھی تھوڑی بہت مدد کرے - چنانچہ اس کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا گیا ھے جس میں سرکاری اسپتالوں میں مفلسوں کے ساتھہ جو برا برتاؤ کیا جاتا ھے اس کا تدارک کرنا ' افلاس کے باعث جو عورتیں عصمت فروشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ھوتی ھیں انھیں اس بے حیائی سے بچانا اور غریب غربا کے لیے دوا تقسیم کرنے کا انتظام کرنا ' خاص کر قابل ذکر باتیں ھیں —

پچھلے ستمبر میں اس انجمن کا ایک اور جلسہ منعقد ھوا جس میں

حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اعلی سرکاری ملازمتوں میں بھی جگہ ملنی چاہئیے - اس کے علاوہ ریلوے کے انتظام سے متعلق بعض شکایات حکومت کے گوش گذار کی گئیں - پانچ اکتوبر کے جلسے میں اردو زبان کی صرف و نحو کا رسالہ پیش کیا گیا جس میں عربی، فارسی اور ترکی صرف و نحو سے اردو کے صرف و نحو کا مقابلہ کیا گیا تھا - اس رسالے کے مصنف کا نام محمد مرزا ہے - موصوف نے انجمن سے درخواست کی کہ اس رسالے کی طباعت کا وہی انتظام کرے —

پنجاب یونیورسٹی کا جو کالج قایم کیا گیا ہے وہ ترقی پذیر ہے - اس کالج میں اردو، فارسی اور عربی کی ادبیات کی تعلیم دی جاتی ہے - اس صوبے میں ان زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بہت ضروری تھا - چنانچہ اب باقاعدہ ان زبانوں کے درس ہوتے ہیں - پنجاب کے ہر حصے سے نیز کابل تک کے طلبہ ان درسوں میں شرکت کرتے ہیں - (اخبار عالم - ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۶۷ ع) —

پچھلے مارچ کے مہینے میں علیگڈہ والی " انجمن اسلامی " کا جلسہ کلکتہ میں ہوا - اس میں تقریباً دو ہزار لوگوں نے شرکت کی - حاضرین میں ہندوستان کے بعض مشہور مسلمان رئیس شامل تھے - ان کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی تھے - وائسرائے گورنر جنرل اور بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے بھی جلسے میں شرکت کی - انجمن کی جانب سے بعض سائنٹفک تجربات دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا جو بہت پسند کیے گئے - علمی موضوعوں پر تقریریں بھی ہوئیں - وائسرائے بہادر نے انجمن کے معتمد مولوی عبد الطیف خان کی سرگرمی اور ان کے جوش عمل کی بہت تعریف کی —

اس موقع پر انجمن کی جانب سے وائسرائے کو ایک عرضداشت پیش

کی گئی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات نیز تعلیم بجاے انگریزی کے ہندوستانی یا بنگالی میں کردی جاے - طلبہ کو اس بات کا حق دینا چاہئیے کہ امتحان میں جواب چاہے انگریزی میں دیں یا اپنی ملکی زبان میں - سہولت اس میں ہوگی کہ ان طلبہ کے لیے جو ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں علحدہ انتظام کیا جاے - یہ درخواست بھی کی گئی ہے کہ صوبجات شمال و مغربی کے لیے ایک علحدہ یونیورسٹی قایم کی جاے جس میں ذریعۂ تعلیم ہندوستانی ہو - ڈاکٹر لیٹنر (Dr. Leitner) نے اس قسم کی تحریک پنجاب میں اٹھائی تھی لیکن حکومت نے اس کے ساتھہ خاص ہمدردی نہیں ظاہر کی - (Homeward Mail چودہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ ع) —

کشمیر کے مہاراجا نے حال میں اپنی ریاست کے اہل علم و فضل کو جمع کیا اور انھیں دعوت دی کہ ہر پندرھویں روز وہ مبادلۂ خیالات کی غرض سے یکجا ہوں اور بحث و مباحثہ میں مذہبی تعصب سے کام نہ لیں - یہ نہایت عمدہ خیال ہے اس لیے کہ اس علمی مجلس میں مختلف مذاہب کے لوگ شرکت کریں گے - ہندوستانی اخبارات میں خاص کر اس جلسہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کی صدارت مہاراجا کے وزیر کرپا رام جی نے کی - موصوف ہندوستانی کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں - جلسے میں فلکیات ، اقلیدس ، فلسفۂ ویدانت اور دھرم شاستر کے متعلق گفتگوئیں ہوئیں —

ہندوستانی اخبارات یک زبان ہوکر لکھتے ہیں کہ اگر صوبوں کے لفٹنٹ گورنر اور دوسرے والیان ریاست اسی طرح علمی شغف ظاہر کریں تو یقین ہے کہ جہالت کی تاریکی چند سال کے اندر دور ہو جاے گی -

لیکن بدقسمتی سے دوسرے والیان ملک دوسرے انداز کے لوگ ہیں - ان میں بیشتر ایسے ہیں جنہیں بس اپنی خوش وقتی سے سروکار ہے - ان کا زیادہ وقت رقص و سرود کی محفلوں، چوسر، پچیسی اور گنجفے کی نذر ہوتا ہے - وہ سنجیدہ مشاغل سے دور بھاگتے ہیں —

میں نے والیان ملک کے جن مشاغل کا ابھی ذکر کیا ہے ان میں ہندوستانی زبان ہی کے ذریعے خیالات ادا کئے جاتے ہیں - معاشری اور ادبی خیالات اسی کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں - انگریز لوگ جب دیسیوں سے گفتگو کرتے ہیں تو انہیں اسی زبان میں خطاب کرتے ہیں - میں آپ کے سامنے اپنے پچھلے خطبوں میں انگریزوں کی تقریروں کا ذکر کر چکا ہوں - پانڈی چری میں اس کے بالکل برعکس ایک ہندوستانی نے جو مسیحی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا لارڈ نیپیر (Napier) کے رو برو لاطینی زبان میں تقریر کی - نہ معلوم یہ عجیب و غریب خیال اس شخص کو کیونکر پیدا ہوا اور اس نے ہندوستانی، انگریزی اور فرانسیسی پر لاطینی کو ترجیح دی - غالباً وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لاطینی زبان سے واقفیت رکھتا ہے - یہ زبان ہر اُس طالب علم کے لیے لازمی ہے جو رومی کلیسا میں پادری کے عہدہ پر ممتاز ہونا چاہتا ہے —

حکومت ہند یورپین لوگوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کی اہمیت اور ضرورت کو روز بہ روز تسلیم کر رہی ہے - پچھلے جون میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ سول سروس کے ان امیدواروں کو ایک ایک ہزار روپے بطور انعام دیے جائیں گے جو اردو یا ہندی میں امتیاز کے ساتھ امتحان میں کامیاب ہوں گے - جو امیدوار ان زبانوں میں اعزازی ڈگری حاصل کریں گے انہیں دو دو ہزار روپیہ دیا جائے گا - ان انعامات کا مقصد یہ

هے که ان زبانوں کی همت افزائي کی جاے - فوجی لوگوں کو دو سال کی رخصت کا حق دیا گیا هے که وه جس حصهٔ ملک کی زبان سیکھنا چاهیں وهاں جاکر رهیں اور سیکھیں - خاص کر هندوستانی کے ایسے یه قاعده بنایا گیا هے ، اس لیے که زیاده تر اسی زبان کو سیکھنے کا شوق ظاهر کیا جاتا هے - چنانچه بائیس جولائی کو کوارٹر جنرل نے شمله سے ایک گشتی جاری کی هے جس میں نوجوان افسروں کو هندوستانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی گئی هے اور بتایا گیا هے که اس زبان کو جاننے کی بدولت وه مختلف خدمات کے لیے اپنی کار گذاری بڑھا سکتے هیں - (انڈین میل بیس ستمبر سنه ۱۸۶۷ ع)

لندن کے اخبار اورینیٹل سرکلر (Oriental Circular) نے هندوستانی کی اهمیت کو محسوس کرتے هوے اس زبان میں اپنے اشتہارات دینا شروع کیے هیں - سید عبدالله هند وستانی میں اشتہارات لکھنے کا کام انجام دیتے هیں - اس اخبار میں اور دوسری مشرقی زبانوں میں بھی اشتہار نکل رهے هیں - اگر فرانسیسی اهل صنعت بھی اس طرف اپنی توجه مبذول کریں تو نفع سے خالی نه هوگا —

میں نے اهل هند کی جن ترقیوں کا ذکر کیا هے اس کا یه منشا نهیں که وه مسیحی مذهب کی طرف بھی راغب هو رهے هیں - هاں یه ممکن هے که جب وه ترقی یافته هو جائیں گے تو عیسائی مذهب کی طرف خود بخود مائل هوں گے - ان میں جو ترقی رونما هے اس کا ایک لازمی نتیجه یه هوگا که ان میں روا داری پیدا هوجاے گی - چنانچه ابھی حال میں شمله کے راجا کی جانب سے ایک اعلان شائع هوا هے جس میں انجیل کی نشر و اشاعت کی اجازت دی گئی هے اور یه بھی واضح کیا گیا هے که اگر

رعایا میں سے کوئی عیسائیت قبول کرلے تو اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جاے گی —

ریاست ترانکور میں اگر چہ ایک ہندو فرماں روا حکومت کرتا ہے لیکن وہاں مذہبی آزادی پورے طور پر موجود ہے - چنانچہ ابھی حال میں جب اس ریاست کے مہاراجا کو " ستارۂ ہند " کا خطاب دیا گیا تو وزیر اعظم نے اپنے اعلان میں اس امر پر خوشي کا اظہار کیا کہ مشنری جماعت ان کے ملک کو فائدہ پہنچا رہی ہے (انڈین میل - بیس جون سنہ ۱۸۶۷ ع)

برطانوی حکومت اس باب میں بہت احتیاط برت رہی ہے اور مذہبی معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتی - حکومت نے دینی معاملات کو دنیاوی معاملات سے بالکل علحدہ رکھنے کا تہیہ کرلیا ہے جیسا کہ انجیل مقدس میں مذکور ہے : " آسمانی امور کا تعلق خدا سے ہے - خدا نے دنیاوی معاملات انسانوں کے سپرد کردئے ہیں " (Psalms C× 111,25)

کلکتہ کے نئے مہا پادری کا نام روبرٹ ملمین (Rev Robert Milman) ہے - ہمیں توقع ہے کہ آپ بھی اہل ہند کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کا ویسا ہی خیال رکھیں گے جس طرح ان کے پیش رو کو تھا - موصوف کے متعلق ہمیں جو حالات معلوم ہوے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نہایت ہمدرد شخص ہیں - آپ کی تعلیم آکسفورڈ میں ہوئی اس کے بعد آپ بکنگھم کے ضلع میں مذہبی خدمت پر مامور کیے گئے - آپ بیرونٹ سر ڈبلو جی ملمین (Baronet Sir W. G. Milman) کے صاحبزادے ہیں اور ایک اعلی خاندان کے چشم و چراغ ہیں - آپ کا تعلق ہائی چرچ (High Church) سے ہے جو اپنے عقاید میں کیتھو لک مذہب سے قریب تر ہے - بر خلاف اس کے لو چرچ

(Low Church) کے رسوم و عقاید خالص پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں - روبرٹ ملهین صاحب ایک جادو بیان مقرر ہیں - آپ اپنی تقاریر بغیر کسی تیاری کے کرتے ہیں - آپ کی متعدد تصانیف بھی ہیں * —

۵ فروری کو کنٹر بری کے آرچ بشپ نے آپ کے منصب نشینی کی رسم ادا کی - اس کے ساتھ دو اور بڑے پادری بھی اس رسم میں شریک تھے - اپریل میں باقاعدہ کلکتہ کے کلیسا سینٹ پال میں آپ نے اپنے منصب کی ذمہ داریاں قبول کیں - مئی کے مہینے سے برابر پینتیس پادری موصوف کے ساتھ مختلف دینی مسائل پر غور کر رہے ہیں - ان میں بعض مسائل دلچسپی سے خالی نہیں - مثلاً ایک مسئلہ زیر غور یہ بھی ہے کہ سارے ہندوستان کے لیے دعاؤں کا انتخاب شائع کیا جاے - یہ دعائیں ایسی زبان میں لکھی گئی ہیں جو نہایت سادہ اور موثر ہے - ہندوستانی لوگ ان دعاؤں کو سن کر متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ راجا رام موہن راے نے ان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے - راجہ رام موہن راے کے خیالات وہی ہیں جن کا اظہار ڈاکٹر واٹز نے اپنے اشعار میں کہا ہے :

" اے خداوند ! ایک جماعت کی جماعت تیرے سامنے سر نیاز جھکائے کھڑی ہے - یہ منظر بھی کیا عجیب و غریب ہے - کبھی وہ گانے لگتے ہیں اور کبھی پھر عبادت میں غرق ہوجاتے ہیں - ان کے کان آسمانی سر گوشیوں کو سنتے ہیں اور وہ اپنی راہ عمل پا لیتے ہیں " —

---

* (1) The Love of Atonement.
(2) The Voice of Harvest.
(3) The Convertion of Pomerania.

رابرٹ ملمین نے ہندوستان پہنچنے کے ساتھ ہی ہندوستانی زبان سیکھنی شروع کردی ہے - مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ اس قدر قلیل عرصے میں موصوف دیسیوں کے سامنے انہیں کی زبان میں وعظ کہتے ہیں - چنانچہ سترہ اکتوبر دہلی میں سینٹ ایٹین (St. Etienne) کلیسا کے افتتاحی جلسہ میں آپ نے اردو اور انگریزی دونوں میں تقریر کی - اس کلیسا کی عمارت نقش و نگار سے آراستہ ہے اور ان کے ذریعہ مذہبی تمثیلات ظاہر کی گئی ہیں - بعض جگہ انجیل مقدس کی عبارتیں کندہ کی گئی ہیں - (دہلی گزٹ ' انڈین میل ' ستائیس نومبر سنہ ۱۸۶۷ ع) —

بالعموم ہندوستانیوں میں جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ جاہل طبقے کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں - چنانچہ ان میں سے بعض کو کلیسائی عہدے بھی حاصل ہوے ہیں - مدراس کے مہاپادری نے پچھلی مرتبہ اپنے دورے میں پانچ ہزار دو سو باون دیسی لوگوں کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی تصدیق کی ہے - انہیں دیسی لوگوں میں سے نوکو پادری مقرر کیا اور گیارہ کو چھوٹا پادری - ابھی حال میں متھرا میں ایک ہندو نے جو اپنے ایک مدرسہ کو چلا رہا تھا عیسائی مذہب قبول کر لیا - چنانچہ اس کو بمبئی کے مہا پادری نے پادری کے عہدے پر مامور کر دیا ہے —

آگرہ کے کلیسا میں ہر اتوار کو دو مرتبہ ہندوستانی زبان میں عبادت اور مناجات کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں - پچھلے سال اسی گرجے میں آٹھ ہندوؤں نے مسیحی مذہب قبول کیا جن میں ایک برہمن تھا - اضلاع میں بھی گرجے قایم ہوگئے ہیں جہاں عیسائی لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں - اضلاع میں مسیحی مبلغین کو سخت مخالفت کا سامنا

کرنا پڑتا ہے - ابھی حال میں ہاتھرس میں بعض مبلغین کو بری طرح مار پیٹ کی - اور ان پر پتھر پھینکے —

مسیحی مبلغین کو نسبتاً ان نیم وحشی اقوام میں کامیابی ہورہی ہے جو حکومت ہند کے تحت بعض گوشوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں - چنانچہ بنگال کی سرحد اور ناگپور کے علاقے کے درمیان ایک جرمن مشنری نے چودہ ہزار نفوس کو مسیحی حلقے میں داخل کر لیا ہے - یہ لوگ عام طور پر " قلی " یا " ڈانگری " کہلاتے ہیں - یہ خبریں میں نے میرٹھ کے اردو اخبار " اخبار عالم " میں پڑھی ہے (تین جنوری) - اس اخبار کے مدیر ایک مسلمان ہیں - اس علاقے کے راجا نے مسیحی مبلغین کی راہ میں بہت کچھ روڑے اٹکاے اور ان لوگوں کو جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا ہر قسم کی تکالیف پہنچائیں لیکن اس کی ایک نہ چلی —

کرسچین ورنکلر ایجوکیشن سوسائٹی (Christian Vernacular Education Society) کے پیش نظر یہ اصول ہے کہ دیسی لوگوں کو انھیں کی زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کرے - چنانچہ اس انجمن کے چار مدارس ' کلکتہ ' امرتسر' احمد نگر اور ڈنڈیگل میں اپنا کام کر رہے ہیں - کچھ دنوں بعد یہی مدارس دیسی عیسائیوں کی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز بن جائیں گے - اس انجمن کی شاخوں کی تعداد ۷۸ ہے اور ان میں چار ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں - ان مدارس کے سب اساتذہ انجمن کی جانب سے مقرر کئے جاتے ہیں - انجمن کی طرف سے ایک بڑی تعداد مطبوعات کی شائع ہوچکی ہے - ہمارے خیال میں مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ہندوستان میں اب تک جس قدر مطبوعات شائع ہوئی ہیں ان میں سے ایک تہائی اس انجمن نے طبع اور شایع کرائی ہیں - اس انجمن کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ

بیس کرور نفوس جو ہندوستان میں بستے ہیں ان کی تعلیم و تلقین کا انتظام کرے - چنانچہ یہ انجمن اساتذہ کی ایک بڑی جماعت کو تیار کر رہی ہے - اس وقت بھی غیر مسیحی مدارس میں اس انجمن کے تربیت یافتہ اُستاد پڑھانے کا کام انجام دے رہے ہیں - صرف بنگال میں ۵۰ ہزار مدرسے ہیں - اگر اس انجمن کے نمائندے ہر مدرسے میں پہونچ گئے تو یہ اس کی عظیم الشان کامیابی ہو گی —

مسٹرسی ڈبلو ڈبلو الکزنڈر (C. W. W. Alexander) نے جو حلقۂ لاہور کے مہتمم تعلیمات ہیں ' عماد الدین کی اس کتاب کے متعلق مجھے پوری معلومات بہم پہونچائی تھیں جو موخر الذکر نے مسیحی مذہب کی حمایت میں لکھی ہے - عماد الدین نے کُھلم کُھلا عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے - عماد الدین کے بھائی کریم الدین کا رجحان بھی مسیحی مذہب کی طرف ہے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے عقائد کا بلا کسی جھجک کے اعلان کریں - عماد الدین نے اپنی تصنیف میں ' جس کی نسبت میں پچھلے سال بھی ذکر کر چکا ہوں ' اسلام پر اردو زبان میں اعتراضات پیش کئے ہیں - اس کتاب کا نام تحقیق الایمان رکھا ہے - مجرد اس خیال سے کہ عماد الدین اس قسم کی کتاب تصنیف کر رہے ہیں شہر لاہور میں ہل چل مچ گئی ہے - چنانچہ اردو کے سب مطابع اس کتاب کو چھاپنے سے انکار کر رہے ہیں - کاغذ فروخت کرنے والے تاجر اس کتاب کے لیے کاغذ دینے پر آمادہ نہیں - مسٹر الکزنڈر کے اثر کی وجہ سے ایک ہندو جو مالک مطبع ہے اس کتاب کی طباعت کے لیے تیار ہو گیا ہے لیکن اس کو یہ دشواری پیش آ رہی ہے کہ مسلمان خوش نویس اسے لکھنے سے انکار کر رہے ہیں - ہندوؤں میں خوش نویس ہیں نہیں جن سے لیتھو کی چھپائی کے لیے لکھا یا جائے -

با آخر یہ کتاب " مطبع آفتاب پنجاب " میں چھپ گئی ہے - اس مطبع کا مالک ایک ہندو شخص ہے - عمای دشواریوں کے باعث اس کی طباعت ٹائپ میں ہوئی ہے - عماد الدین چونکہ با اثر شخص ہے اس لیے اس کے عیسائی ہونے سے مسلمانوں میں ایک طرح کی بے چینی نمودار ہوگئی ہے - اس کی مثال اور اس سے زیادہ اس کی کتاب دوسرے مسلمانوں پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی - چنانچہ مسلمانوں میں بعض نے عمادالدین کی دیکھا دیکھی مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے - اب اس وقت اپنی کتاب کی طباعت کے بعد عمادالدین اسی قسم کی دوسری کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہیں جن میں مذہب اسلام پر اعتراضات کئے جائیں گے اور عیسائیت کی صداقت ثابت کی جائے گی - تحقیق الایمان ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے - اس کا ایک نسخہ مجھے مسٹر الگزنڈر نے از راہ کرم بھیج دیا ہے - اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جن مسائل پر بحث کی ہے ان پر کافی غور بھی کیا ہے - اس کتاب کی تمہید میں یہ بیان کیا گیا کہ بیس سال سے جس حقیقت کی تلاش تھی وہ بالآخر مسیحی مذہب میں ملی - اس کے بعد مصنف نے انجیل مقدس اور قرآن کا مقابلہ کیا ہے اور اول الذکر کی صداقت پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مسلمان بھی اصولاً اس کی سچائی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودونصاری نے اس کتاب مقدس میں تحریفات کی ہیں - اس کے بعد کے ابواب میں محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) اور حضرت مسیح کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں - مصنف کا خیال ہے کہ ان دونوں پیغمبروں کی زندگی اور ان کی سیرت میں بہت بڑا فرق ہے - کتاب کے آخری باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ ابن اللہ اور اللہ میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہتی - دونوں اصل میں ایک ہیں —

حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کے لیے جو مغربی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اس کا اثر بھی مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت میں بہت مدد دے رہا ہے —

ملکۂ معظم کی حکومت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے سرسٹا فرڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کو وزیر ہند کی خدمت پر مامور کیا ہے - آپ اپنی صلاحیت کار اور نیک دلی کے باعث مشہور ہیں - اس کے ساتھ سرولیم میور (مسٹر جان میور کے بھائی) جنھیں " ستارۂ ہند " اور Commander of the Royal Order کا خطاب ملا ہے ' قابل مبارک باد ہیں کہ انھیں علوم مشرقی کی خدمت کے صلے میں یہ اعزاز حاصل ہوئے —

گذشتہ سالوں کی طرح میجر فلر نے پنجاب کی تعلیمی ترقی کے متعلق مجھے اپنی رپورٹ بھیجی ہے - یہ رپورٹ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے - اس کے پڑھنے سے اس صوبے کی تعلیمی رفتار کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے - ضمنی طور پر مشنری اداروں کی رو داد بھی مل جاتی ہے کہ وہ کیونکر تعلیم کے ذریعہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے میں مشغول ہیں - اس کے ساتھ مقامی حالات کی رپورٹیں بھی منسلک ہیں - ان میں سے ایک رپورٹ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شملہ میں اس وقت ایک مدرسہ لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا رومن مشنری چلا رہے ہیں - ان دونوں مدرسوں کی عام حالت قابل اطمینان ہے —

میجر فلر کی رپورٹ کو یہاں میں پوری تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کرسکتا - صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت پنجاب کے تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ہندوستانی اور بالخصوص اردو سکھائی جاتی ہے - اس کے ساتھ فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی لازمی ہے -

فارسی اب تک ہندوستان کی علمی زبان تھی اس لیے اس کو اہمیت حاصل ہے - مذہبی حیثیت سے ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی سیکھنا ضروری ہے اس لیے ان دونوں زبانوں کے سکھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے - پشتو جو سرحدی افغانوں کی زبان ہے مخصوص مدارس میں سکھائی جاتی ہے - اس زبان کی ابتدائی کتابیں بھی سررشتۂ تعلیم کی جانب سے تیار کی گئی ہیں —

کلکتہ ' مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی امیدواروں کی ایک بڑی تعداد کو سندیں دے رہی ہیں - ہندوستان کی یونیورسٹیاں بھی انگلستان اور فرانس کی یونیورسٹیوں کی طرح امتحان کے ذریعہ امیدواروں کی قابلیت کی جانچ کرتی ہیں - ہندوستان میں اس کے جو نتائج پیدا ہورہے ہیں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے * - بہر حال یہ اب مسلم ہے کہ مغربی علوم کے لیے جو مدارس اور یونیورسٹیاں ہندوستان میں قایم کی جائیں ان میں ہندی علوم کی طرف سے بے رخی نہیں برتنی چاہئیے اور تعلیم کا ہرگز یہ منشا نہ ہونا چاہئیے کہ اہل ہند اپنے ماضی کو بھول جائیں اور اپنی قومیت کی بنیادوں کو منہدم کر ڈالیں - اس قسم کی کوشش اگر مغربی علوم کے ذریعہ کی گئی تو وہ نا کام رہے گی - در اصل کوشش اس امر کی ہونی چاہئیے کہ جدید علوم وفنون کی بدولت ہندی معاشرت کے مختلف عناصر میں امتزاج پیدا کیا جائے تاکہ انگلستان

---

* میجر ڈبلو نسو لیز (Nassau - Lees) نے اپنی کتاب Short Essays and Reviews on the educational policy of the Govt : of India میں اس موضوع پر نہایت دلچسپ تبصرے کیے ہیں —

کے زیر سایہ پوری قوم جسم واحد کی طرح زندگی بسر کرے - اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضرور نہیں کہ ہندوستانی اپنے تئیں مغربی رنگ میں رنگ لیں —

لکھنؤ میں کیننگ کالج روز بروز ترقی کر رہا ہے - اس وقت اس کالج میں تین تعلیمی جماعتیں ہیں —

(۱) ہندوستانی (اردو) کی جماعت

(۲) انگریزی کی جماعت

(۳) اعلیٰ جماعت

ہندوستانی کی جماعت میں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی بلکہ ہندوستان کی ملکی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے - اس جماعت میں ایک سو پینتالیس طلبہ ہیں - ان میں سات فارسی سیکھتے ہیں ' تیس سنسکرت اور ستر عربی کی تحصیل کرتے ہیں - انگریزی کی جماعت میں انگریزی کے ذریعہ درس دئے جاتے ہیں - لیکن ہندی ' عربی اور سنسکرت پڑھانے کا بھی اس جماعت کے طلبہ کے لیے انتظام کیا جاتا ہے - اعلیٰ جماعت میں کلکتہ یونیورسٹی کے لیے طلبہ تیار کیے جاتے ہیں - اگر چہ اس کالج کے قیام کو تین سال سے زیادہ نہیں گذرے لیکن صوبۂ شمال مغربی یا پنجاب کے بہترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ کالجوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے - صرف بنارس کالج جو تقریباً نصف صدی سے قایم ہے ' کیننگ کالج سے زیادہ ترقی یافتہ ہے - کیننگ کالج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انحصار زیادہ تر امرا کی مدد پر ہے - پچھلے سال طبقۂ امرا نے ستر ہزار روپیہ اس کالج کے لیے جمع کیا —

آپ صاحبوں کو سن کر تعجب ہوگا کہ امریکی طریقے کے مطابق سورت' کیرا اور احمدآباد میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ تعلیم دینے کے لیے مدارس

قایم کیے گئے ھیں- ان مدرسوں میں ھندوؤں اور مسلمانوں کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھہ تعلیم حاصل کرتی ھیں - شاید مسلمانوں کا نام سن کر آپ بہت متعجب ھوں گے اس واسطے کہ وہ اپنی عورتوں کو کبھی پردہ سے باھر نہیں لانا چاھتے —

برار کے ناظم تعلیمات ڈاکٹر سنکلیر (Sinclair) نے ابھی حال ھی میں اپنے صوبے میں دو ثانوی مدارس قایم کیے ھیں - اب اس صوبے میں ان مدارس کی تعداد ستاون ھو گئی ھے (اخبار عالم - تیس جنوری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

صوبۂ متوسط میں ایک مدرسہ رائے پور میں غریب مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے قایم کیا گیا ھے- اب ایک لیتھو پریس قایم کرنے کے متعلق گفت و شنید ھو رھی ھے - تاکہ ھندوستانی اخبار جاری کیا جائے - (ھوم ورڈ میل - بیس ستمبر سنہ ۱۸۶۷ ع) —

راجپوتانے میں جو ابتدائی مدارس قایم کیے گئے ھیں ان میں صرف ھندی اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی ھے - ھر گاؤں میں ایک پاٹ شالہ ھوتا ھے جو برھمن کے ماتحت ھوتا ھے - کبھی کبھی حکومت بھی اسے امداد دیتی ھے — اعلی تعلیم کا انتظام صرف بڑے بڑے شہروں میں ھے جہاں حکومت براہ راست انتظام کرتی ھے - ان پاٹ شالوں میں برھمن لوگ سنسکرت پڑھاتے ھیں ' کایستھہ فارسی اور اردو کی تعلیم دیتے ھیں - کایستھہ لوگ فارسی اردو پر اسی طرح قدرت رکھتے ھیں جیسے مسلمان - نوجوان راجپوت جب گھر سے باھر قدم رکھنے کے قابل ھو جاتا ھے تو سب سے پہلے اس کو تلسی داس کی رامائن اور مہا بھارت کا ھندی ترجمہ پڑھایا جاتا ھے - ان نظموں سے اس کو اپنی قوم کے بہادری کے کارنامے

معلوم ہوتے ہیں —

مجھے اب تک نظام کی ریاست کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں - بیرن چارل دوپین (Baron Charles Dupin) نے جو کیتھولک مذہب کے مبلغ ہیں، حیدرآباد میں سنہ ۱۸۶۶ء میں ایک فرانسیسی وضع کا مدرسہ قایم کیا ہے - اس مدرسے میں ہندوستانی (اردو) ، فارسی ، اور علوم کے مبادیات سکھائے جاتے ہیں * —

حکومت کے مدارس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں خانگی مدرسے برابر قایم ہو رہے ہیں - لیکن چونکہ ان مدارس کو حکومت کے مدارس کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کی تعداد میں روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے - صوبجات شمال مغربی میں خانگی مدارس بڑی تعداد میں موجود ہیں جہاں ہندوستانی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے - اس علاقے میں دستور ہے کہ جب لڑکا پانچ سال کا ہوتا ہے تو پہلے اس کے والدین نہلا دھلا کر اسے صاف کپڑے پہناتے ہیں اور پھر مدرس کے پاس لے جاتے ہیں - اس موقع پر اعزا اور دوست احباب مدعو کیے جاتے ہیں اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے - اگر بچے کے والدین مسلمان ہیں تو استاد سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے اور اگر والدین ہندو ہیں تو اسی قسم کی ایک مذہبی دعا پڑھی جاتی ہے - استاد بچے کو سب سے پہلے حروف

---

* مجھے پوری توقع ہے کہ سر رچرڈ ٹمپل جن کا کچھ عرصہ ہوا حیدر آباد میں ریزیڈنٹ کی خدمت پر تقرر ہوا ہے مجھے اس ریاست کے متعلق پوری معلومات مہیا کر دیں گے تا کہ اس امر کا پتہ چلے کہ اس ریاست کی تعلیمی ترقی کی کیا حالت ہے اور دکن میں ہندوستانی زبان کی کیا خدمت ہو رہی ہے —

تہجی سے آشنا کرتا ھے - پھر بعد میں سادہ الفاظ پڑھاتا ھے - جیسا کہ فرانس میں کیا جاتا ھے - سات سال کی عمر میں بچے کو لکھنا سکھایا جاتا ھے - استاد لکڑی کی تختی پر کھریا سے حروف اور الفاظ لکھتا ھے اور بچہ ان کی نیچے نقل کرتا ھے - چند ماہ بعد بچے کو خالق باری حفظ کرائی جاتی ھے - خالق باری سے فارسی الفاظ کے اردو معنے بچے کو یاد ھو جاتے ھیں - اس کے چند ماہ بعد کریما ' اور پند نامے کی باری آتی ھے - پھر آٹھ سال کی عمر سے استاد بچے کو صبح میں گلستاں اور شام میں بوستاں پڑھانا شروع کرتا ھے - سعدی کی یہ دونوں کتابیں ایران' ترکی اور ھندوستان میں بطور کلاسک پڑھی جاتی ھیں- اگر ضرورت ھوتی ھے تو استاد کبھی کبھی گوشمالی بھی کرتا ھے - اس کی اجازت خود والدین دیتے ھیں - چنانچہ مشہور ھے کہ عام طور پر والدین جب اپنے بچے کو کسی استاد کے حوالے کرتے ھیں تو کہدیتے ھیں کہ بچے کا " چمڑا تمھارا ' ھڈی ھماری " - بارہ سال کی عمر میں نظامی کا سکندر نامہ پڑھایا جاتا ھے اور اس کے ساتھ انشا کی مشق کرائی جاتی ھے - اس عمر میں عربی بھی شروع کردی جاتی ھے - لیکن اس کا منشا صرف یہ ھوتا ھے کہ فارسی اور اردو کی تحریروں میں جو عربی الفاظ استعمال ھوتے ھیں ان کے معنی سے واقفیت حاصل ھو —

جمعہ کا روز مسلمانوں میں متبرک مانا جاتا ھے - اسلامی مدارس میں اسی روز چھٹی دی جاتی ھے - بعض مدارس میں جمعرات کے دن نصف روز کی چھٹی رھتی ھے - تہوار کے موقع پر استاد بچوں کو کچھہ اشعار لکھہ کر دیتا ھے تاکہ وہ اپنے والدین کو جا کردیں - والدین استاد کو تحفے بھیجتے ھیں جو خوشی سے قبول کیے جاتے ھیں - استاد ویسے بچوں

سے بارہ آنہ ماہوار سے زیادہ فیس نہیں لیتا - بچہ جب اپنی تعلیم ختم کرکے مدرسہ سے نکلتا ہے تو اس کو فارسی ادب سے کافی واقفیت حاصل ہوجاتی ہے - اسے چند اشعار اور کہاوتیں یاد ہوتی ہیں اور تھوڑی بہت ریاضی بھی آجاتی ہے - لیکن جغرافیہ اور تاریخ میں وہ بالکل کورا ہوتا ہے - فلسفہ یا سائنس کے متعلق وہ ایک حرف نہیں جانتا - ہندو پاٹ شالوں کی بھی بالکل یہی حالت ہے - ان میں فارسی کی جگہ سنسکرت کی تعلیم ہوتی ہے —

میں نے ابھی جو حالات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں ان سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ حکومت ہندوستانی زبان کی کتابوں کی اشاعت میں سعی بلیغ کر رہی ہے اور ہر علم کے متعلق کتابیں لکھوا رہی ہے - مسلمان علاقوں میں اردو میں اور ہندوؤں کے علاقوں میں ہندی میں یہ کتابیں شائع کی جاتی ہیں —

اس سال تعلیم نسوان کی طرف بھی ہندوستان میں کافی توجہ کی گئی ہے - چنانچہ " مدراس ٹائمز " میں اس کے متعلق ایک ہندوستانی کا خط چھپا ہے جو نہایت معقول ہے - اس خط کا مضمون یہ ہے : ہندوستانیوں کا ہوشمند طبقہ اس بات کا خواہش مند ہے کہ ان کی مستورات تعلیم حاصل کریں لیکن وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہو - یہ بات انہیں عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا خیال پیش کیا جاے - جن معاملات کے متعلق ہندوستانی عورتوں کو واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے انہیں وہ اپنی زبان ہی میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں - بعض یورپین لوگوں کا یہ خیال قابل قبول نہیں ہے کہ اچھی تعلیم انگریزی ہی میں ہوسکتی ہے -

یہ محض ان لوگوں کا خیال خام ہے۔ اگر عورتوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی کوشش کی جاے گی تو خود تعلیم کا مسئلہ بہت مشکل ہوجاے گا ۔ اگر عورتوں کو مغربی تعلیم دی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگوں کی خاندانی زندگی کا خاتمہ ہو جاے گا اور ان کا ایک علحدہ ہی طبقہ قایم ہو جاے گا ۔

پچھلے سال پنجاب میں تین سو تینتیس لڑکیوں کے مدارس تھے۔یہ سب مدارس حکومت کی امداد سے چل رہے ہیں اور اس وقت ان میں چھہ ہزار آٹھہ سو چونتیس لڑکیاں تعلیم پارہی ہیں ۔ لڑکوں کے مدارس کی تعداد چھہ سو چھیانوے ہے ۔ ان میں سے بعض مشنری لوگوں کے ہیں اور بعض ذاتی طور پر قایم کیے گئے ہیں اور مقامی کمیٹیاں انھیں چلاتی ہیں ۔ ان سب مدارس میں بارہ ہزار سات سو ستائیس طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ ان مدارس میں سے ایک دہلی میں ہے جس کو خاندان مغلیہ کے افراد نے قایم کیا ہے ۔ اس خاندان کے افراد کی تعداد اچھی خاصی اب تک موجود ہے ۔ اس مدرسے میں گلستاں کا اردو ترجمہ کرایا جاتا ہے اور ہندوستان کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے * —

اودھ کے چیف کمشنر نے صوبجات شمال و مغربی کے ناظم تعلیمات

---

* میں کسی پچھلی صحبت میں ذکر کر چکا ہوں کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے خاص کتابیں تیار کی جارہی ہیں ۔ مجھے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں تین کتابوں کا اور ذکر ہے —

(۱) استری سکھش ۔

(۲) گیان دیپک

(۳) استری اپدیس ۔

کے خیال کے مطابق حکومت ہند سے درخواست کی ہے کہ لکھنو میں شریف خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا جائے - اس مدرسے کے اخراجات نصف مقامی روسا کے چندے سے پورے کیے جائیں گے اور نصف حکومت ہند دے گی —

ایک تجویز یہ ہے کہ دھلی میں عورتوں کی تعلیم کے لیے میڈیکل کالج قایم کیا جاے - چونکہ مرد ڈاکٹر زنانے میں نہیں جاسکتے اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ خود عورتوں کو طب کی تعلیم دی جاے تاکہ وہ زنانے میں علاج کر سکیں - یہ عورتیں انگریز عورتوں کے ماتحت ہر قسم کا کام اس کالج میں سیکھیں گی - جس ہندوستانی اخبار سے ہم کو یہ خبر ملی ہے اس کے مدیر نے اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوے خواہش ظاہر کی ہے کہ کیا اچھا ہو اگر اس کالج میں یونانی طب کی تعلیم کا انتظام کیا جاے - یونانی طب کو مسلمان اپنا مخصوص طریقۂ طب سمجھتے ہیں - عام طور پر ہندوستان میں یہ خیال بھی موجود ہے کہ یونانی طب اہل ہند کی طبائع کے لیے بمقابلہ یورپی طب کے زیادہ موزوں ہے - (اخبار عالم' بیس جنوری سنہ ۱۸۶۷ ع) —

ہندوستانی اخبارات عوام کی تعلیم میں بہت مدد دے رہے ہیں اور جہالت کی تاریکی کو رفع کررہے ہیں - جس قدر ان کی اشاعت بڑھ رہی ہے اسی قدر لوگوں کی معلومات عامہ میں اضافہ ہورہا ہے جو بغیر ان کے کسی اور طرح سے یہ معلومات نہیں حاصل کر سکتے تھے - یورپین لوگوں کے لیے بھی لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ اخبارات بہت مفید ہیں - جو یورپین ہندوستانی زبانوں کے متعلق تحقیق کرنا چاہتے ہیں انھیں ان اخباروں کے پڑھنے سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں - چنانچہ اسی خیال کا

اظہار " انڈین میل " * نے بھی کیا ہے - جدید انشا پردازوں کے مضامین " اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " میں شایع ہوتے ہیں - ہندوستانی معاشرت کے طبقۂ اعلی اور طبقۂ متوسط کے خیالات ان اخباروں میں پیش کیے جاتے ہیں - " انڈین میل " کے مضمون نگار نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ سول سروس کے امیدواروں کا امتحان اس جدید زبان میں ہونا چاہئے جو آج کل مروج ہے بجاے اس کے کہ ' اخوان الصفا ' اور سنگھاسن بتیسی کی زبان میں ان کی جانچ کی جاے - میں اب تک یہ پتا نہیں چلا سکا کہ " باغ و بہار " اور " پریم ساگر " کو نصاب میں سے کیوں خارج کر دیا گیا - میں ان دونوں کتابوں کو اوروں پر ترجیح دیتا ہوں - چنانچہ ان دونوں کو میں نے درسوں میں خاص اہمیت دی ہے —

اس سال ہندوستانی کے دس نئے اخبار جاری ہوے ہیں - ممکن ہے ان کے علاوہ بھی کوئی ہوں جن کی نسبت مجھے معلومات نہیں حاصل ہو سکیں - ان اخباروں کے مضامین کی ترتیب بالکل ان اخباروں کی طرح ہے جن کی نسبت میں ذکر کر چکا ہوں - ان میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے ہیں - اردو اخباروں کی فہرست یہ ہے :—

(۱) آئینۂ علم - یہ اخبار اسی سال یکم اکتوبر سے آگرہ سے جاری ہوا ہے -

(۲) اردو اخبار - یہ بھی آگرہ سے شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر بال گوبند ہیں جو متھرا کے باشندے ہیں —

(۳) اخبار مفید الانام - یہ اکتیس دسمبر سنہ ۱۸۶۱ ع سے جاری ہوا ہے - یہ رسالہ مہینے میں دو مرتبہ فتح گڑہ سے نکلتا ہے —

---

* سات مئی سنہ ۱۸۶۷ ع -

(۴) لطیف الاخبار- اس اخبار کے متعلق میں نے میرٹھ کے "اخبار عالم" میں ذکر پڑھا ہے —

(۵) طلسم حکمت - یہ ماہوار رسالہ میرٹھ سے نکلتا ہے —

(۶) سہیل پنجاب - اس کا ذکر میں نے اٹھائیس مئی سنہ ۱۸۶۷ ع کے ٹائمز میں پڑھا ہے —

(۷) بیوپاری سری امرتسر - اس اخبار کا نام ہندی میں ہے لیکن دراصل یہ اردو کا اخبار- اس میں ہر قسم کے تجارتی اشتہارات ہوتے ہیں —

ہندی کے جدید اخبارات یہ ہیں

(۸) برتنت بلاس - یہ اخبار جموں سے شائع ہوتا ہے - یہ مقام صوبۂ لاہور سے شمال میں کوہستانی علاقے میں واقع ہے —

(۹) گیان دیپک - یہ اخبار ستمبر ۱۸۶۶ ع سے سکندرہ سے نکلنا شروع ہوا ہے - سکندرہ آگرہ کے مضافات میں ہے اور یہاں بادشاہ اکبر کا مقبرہ ہے جو مغلوں کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے —

(۱۰) کوئی بچن سدھا - یہ ماہانہ رسالہ ہے - اس میں غیر مطبوعہ ہندی نظمیں شائع ہوا کرتی ہیں - اس رسالے کے ابھی صرف ۵ و نمبر شائع ہوے ہیں - پچھلا نمبر اگست میں نکلا تھا- میرے پیش نظر دونوں اشاعتیں ہیں - ان میں ایک نظم " اشت جام " کے عنوان سے شائع ہوئی ہے - یہ نظم سری دیودت کی لکھی ہوئی ہے - اس کے علاوہ اور دو نظمیں ہیں —

سنہ ۱۸۶۷ ع کی ابتدا سے کلکتہ سے ایک با تصویر رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا نام " انڈین سوسائیٹی " ہے - اس میں نظم و نثر

کے مضامین ان انگریزوں کے شائع ہوں گے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ۔
(انڈین میل ' بارہ فروری سنہ ۱۸۶۷ ع)

میں پابندی سے میرٹھہ کا " اخبار عالم ' پڑھتا ہوں - اس اخبار کے لایق مدیر مرزا محمد وجاہت علی صاحب از راہ عنایت مجھے اپنا اخبار بھیج کر ممنون احسان کرتے ہیں - اس اخبار میں بھی کبھی کبھی اردو نظمیں شائع ہوتی ہیں ۔ ابھی حال میں اس میں مہر کا ایک مخمس نکلا تھا - موصوف آج کل کے اعلیٰ پایہ کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں' اس مخمس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر بند کا آخری مصرع غالب کے ایک فارسي قصیدے سے مستعار لیا گیا ہے اور باقی چاروں مصرع اردو میں ہیں ۔ اس اخبار کے بعض مضامین بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ ایک مضمون ' تھرمامیٹر ' پر ہے - اس کے ساتھہ اعداد بھی دیے ہیں تاکہ وضاحت ہو جاے - ایک مضمون " حرارت پیما " پر ہے ۔ ایک ہوا پر ہے۔ اس کے ساتھہ ایک " ہوائی مشین " (*) کی تصویر بھی دی ہے ۔ ایک دلچسپ مضمون آگرہ کی نمایش پر ہے جو گزشتہ فروری میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس نمایش کو آپ ہندوستان کے لیے بس ویسا ہی سمجھئے جیسے کہ ہماری پیرس کی نمایش یورپ کے لیے ہے —

اردو کے سب اخباروں میں " اودھ اخبار " بہترین خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کی ہر اشاعت چوبیس صفحوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں - کانپور سے اس کا ضمیمہ شایع ہوتا ہے جس کا نام " کانپور گزٹ " ہے - لیکن جب سے لکھنؤ اور کانپور کے درمیان ریل بن گئی ہے اس وقت سے " کانپور گزٹ " کی اشاعت موقوف کردی گئی- اس لیے کہ اب

* Pneumatic machine

خود " اودھ اخبار " بآسانی اور جلد کانپور پہنچ جاتا ھے —

اس سال مجھے اس رسالہ کا صرف ۲۹ جنوری کا نمبر پڑھنے کو ملا - اس کے مضامین بہت دلچسپ تھے - مجھے افسوس ھے کہ میں اس کے سب پرچے نہیں منگا سکا - اس نمبر میں ایک دکھنی زبان کی نظم ھے جو مدراس کے کسی شخص نے لکھی ھے - اس کے علاوہ اور مضامین اعلی پایہ کے ھیں جن کا مقابلہ ھمارے اخباروں کے مضامین سے کیا جا سکتا ھے - ایک مضمون سید اولاد علی نے ملکہ وکٹوریہ کی توصیف میں لکھا ھے - یہ مضمون مشرقی خطابت اور بلاغت کا اعلی نمونہ ھے - اس پورے مضمون کو " اخبار عالم " نے بھی نقل کیا ھے - اس میں جو تشبیہات اور استعارے استعمال کئے گئے ھیں ان کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ نا ممکن ھے اور اگر بفرض محال ترجمہ کر بھی لیا جاے تو وہ ھمارے مذاق پر گراں گذرے گا —

اس سال ھندوستانی زبان کی جو کتابیں طبع ھوئی ھیں ان کی مکمل فہرست پیش کرنا آپ صاحبوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہ ھوگا اور خود میرے لیے موجب زحمت ھوگا - ان میں سے بہت ساری کتابیں ایسی ھیں جن کے صرف نام مجھے معلوم ھیں اور یہ نہیں معلوم کہ ان میں کس خاص موضوع پر بحث کی گئی ھے - بہر حال میں چند کتابوں کے نام یہاں آپ صاحبوں کے سامنے پیش کئے دیتا ھوں جو میرے نزدیک اھم ھیں —

مسلمانوں میں اس گئی گذری حالت میں بھی ایسے لوگ بکثرت ملیں گے جنھیں ادب سے خاص لگاؤ ھے * - لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال

---

* بقول شخصے ایک زمانہ میں شعرا کی اس قدر کثرت ھوگئی تھی کہ لوگوں کو اندیشہ پیدا ھونے لگا کہ کہیں ان کے لیے علیحدہ پانچویں ذات نہ قایم کرنی پڑے —

کے بعد سے ان میں بہت کم ایسے ملیں گے جن کے خیالات میں اجتہاد اور اپج موجود ہو۔ بالعموم قدیم شعرا کے دیوانوں کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ زیادہ تر اس زمانہ کے شاعر قدیم شعرا کے کلام کی نقل کرتے ہیں یا ان کے خیالات کو دوسرے لفظوں میں الٹ پھیر کے بیان کر دیتے ہیں —

ہندی کی بیشتر مطبوعات بنارس (شیو پوری) سے شائع ہوتی ہیں۔ شیو کے پرستار سنسکرت زبان استعمال کرتے ہیں اور زیادہ تر ویشنوی لوگ ہندی زبان میں تحریر و تقریر کو پسند کرتے ہیں۔ اسی شہر میں حال میں "ہنومان بایک" شایع ہوئی ہے جو رامائن کا ایک حصہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ "کنھ لیلا" "ودیا پتر کا" اور تلسی داس کی "سنگار سنگر ہا" بھی شایع ہوئی ہیں —

یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرف ہندوستانیوں نے اب تک مطلق توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپین زبانوں سے وہ خود اپنی تاریخ کے متعلق ترجمے شایع کیا کرتے ہیں۔ میں ان ترجموں کا ذکر کسی پچھلی صحبت میں کر چکا ہوں۔ اس سال الفنسٹن کی "تاریخ ہند" کا اُردو ترجمہ علی گڑھ سے شایع ہوا ہے۔ الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں —

اب میں ہندوستانی شاعری کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ سب سے پہلے میں مسٹر جے رابسن (J. Robson) کے "مجموعۂ خیال" کا تذکرہ کرتا ہوں۔ خیال در اصل ہندوستانی میں ایک خاص قسم کی نظم ہے جو ناٹک سے ملتی جلتی ہے۔ راجپوتانے میں یہ بہت مقبول ہے۔ یہ نظمیں عشقیہ

بھی ہوتی ہیں اور اخلاقی اور مذہبی بھی۔ اس مجموعہ کی زبان مارواڑی ہندی ہے۔ اس میں پانچ علیحدہ علیحدہ نظمیں ہیں۔ لسانیاتی اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہ پانچوں نظمیں بہت دلچسپ ہیں۔ نظموں کے ساتھ ترجمہ نہیں ہے بلکہ تمہید میں ان کے عام مطالب بیان کر دیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں مارواڑی ہندی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معنی بعد میں درج ہیں۔ ان نظموں میں دو سیاسی رنگ لیے ہوے ہیں اور انگریزی حکومت کی ان میں مخالفت کی گئی ہے۔ ایک نظم میں ہیر اور رانجھا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ راجپوتانے میں عام طور پر گیتوں کا موضوع ہوتا ہے —

حال میں مجھے ہندوستانی (اُردو) گیتوں کا مجموعہ ملا ہے جو کلکتہ میں طبع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ڈبلو ہولنگز (W. Hollings) نے کیا ہے جو ہندوستانی زبان کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

غزل کے دیوان اردو داں طبقے میں بہت مقبول ہیں۔ غزلیات میں بالعموم تصوف کے موضوع پر اشارے ملتے ہیں اور ان کا مطلب حافظ کی پیروی کی وجہ سے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ سودا کو اس پر ناز تھا کہ وہ حافظ کے اشعار سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک غزل میں کہا ہے —

کھلے ہیں مجھ پہ جو راز نہفتۂ حافظ
کہ سن کے لوٹوں ہوں شعر شگفتۂ حافظ*

مجھے تسلیم کا بھی دیوان ملا۔ یہ موجودہ شعرا میں چوٹی کے لوگوں

---

* یہ شعر ایڈورڈ ایچ پامر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان "حافظ" ہے نقل کیا ہے۔ (The Eagle, No. 27, Vol. V., Dec. 1866)

میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے مثنویاں لکھی ہیں اور پہیلیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے —

مسٹر بیمز (Beames) نے مجھے "نوشدارو" کا ایک نسخہ از راہ کرم ارسال فرمایا ہے۔ اس کی طباعت میرٹھ میں ہوئی ہے۔ اخبار عالم (مورخہ ۳ - اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ ع) نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔ اس کتاب میں نثر اور نظم ملی جلی ہیں۔ اس میں کہاوتیں، مقولے اور نصائح درج ہیں۔ اس کے مصنف کا تخلص نامی ہے۔ اس کے علاوہ "عجائب غرائب" کا نسخہ میری نظر سے گذرا۔ اس کی وجاہت علی نے بہت تعریف لکھی ہے *۔ اس کتاب کے متعلق لاہور کی انجمن میں خوب بحث رہی۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ یہ کتاب اس لائق نہیں ہے کہ اس کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے —

اُردو کی کتابوں کو ہندی (دیوناگری) رسم خط میں شائع کیا جا رہا ہے۔ حال میں حاتم طائی کا قصہ ہندی میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح ہندی کی کتابوں کو اُردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال 'پریم ساگر' اور 'مہا بھارت' کے قصے کو اُردو میں آگرہ سے شائع کیا گیا ہے —

اخبار عالم میں جدید مطبوعات پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ قرآن کا بین السطر فارسی اور اردو ترجمہ میرٹھ سے شائع ہوا ہے۔ ہر صفحے پر دس عربی کی سطریں ہیں۔ اِس کا حجم ۶۹۳ صفحات ہے †۔ تفسیر مقبول کے

---

* نیر راجستان - ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۶۵ ع -

† اخبار عالم - ۷ مارچ سنہ ۱۷۶۷ ع -

نام سے ایک اور دوسرا قرآن کا اردو ترجمہ کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔ امیر حمزہ کا ایک نیا ایڈیشن نکلا ہے جو ۳۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دوسری کتابوں کی تفصیل یہ ہے :—

(۱) دیوان شاہ تراب- یہ ۳۴۹ صفحات پر مشتمل ہے —

(۲) گلستان سخن- یہ ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس میں اردو شاعری کا بہترین انتخاب درج ہے —

(۳) زاد السبیل —

(۴) زبدۃ الحکمۃ- اس میں صفائی کے متعلق ہدایتیں ہیں —

'اخبار عالم' میں اعلان کیا گیا ہے کہ یکم جنوری کو صوبجات شمال مغربی کے لئے جو قوانین بنائے جا رہے ہیں' ان کی تفصیل سرکاری طور پر رسالوں کی صورت میں شائع کی جاے گی- اس قوانین کے مجموعہ کا نام "گنجینۂ احکام" رکھا گیا ہے- اس میں تمام سرکاری احکام و قوانین کی نوعیت بتلائی جاے گی تاکہ ان کے متعلق عام پبلک کو واقفیت حاصل ہو —

ہندوستانی مطبوعات کی جو فہرستیں شائع ہورہی ہیں ان میں جیمس لانگ (James Long) کی "تفصیلی فہرست کتب" * سب سے زیادہ جامع ہے- موصوف کا تعلق مشن سے ہے اور آپ کو اہل ہند کے ساتھ خاص شغف ہے۔ اس فہرست میں ۹۵۰ کتابوں کی کیفیت درج ہے جن میں سے زیادہ تر 'پیرس' کی "عالم گیر نمایش" میں موجود ہیں۔ ان میں ہندی اور اُردو کے علاوہ بنگالی کی کتابوں کا بھی ذکر ہے۔

---

* Descriptive_Catalogue.

بنگال کو ہندوستان کے مسلمان "جنت البلاد" کہتے ہیں - اس فہرست کی بیشتر کتابیں وہ ہیں جو کلکتہ میں یا صوبجات شمال و مغربی کے مختلف شہروں میں طبع ہوئی ہیں - مسٹر لانگ نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستانی مطابع کی مطبوعات کی مکمل فہرست وہ نہیں تیار کر سکے —

مسٹر بیمز (Beames) نے از راہ عنایت مطبع نول کشور کی مطبوعات کی فہرست بھیجی ہے - اس مطبع کے مالک "اودھ اخبار" کے مدیر ہیں - اس فہرست میں چھہ سو کتابوں کے قریب مذکور ہیں - سر الکزنڈر گرانت نے، جو آج کل صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات ہیں، ایک فہرست بھیجی ہے جس میں صوبۂ بمبئی کی جملہ مطبوعات درج ہیں - اس فہرست سے مجھے معلوم ہوا کہ مرزا لطف اللہ نے ابھی حال میں دو کتابیں اور تصنیف کی ہیں - ایک عام طب پر اور دوسری ہیضے پر - موصوف اپنی "آپ بیتی" کے باعث یورپ میں پہلے سے مشہور ہیں اور ان کی نسبت پہلے متعدد مرتبہ ذکر آچکا ہے —

میں معمولاً مسیحی، اسلامی اور ہندو مذہب کی مطبوعات اور ابتدائی مدارس کی نصابی کتب کا تذکرہ کیا کرتا تھا لیکن اس سال میں اس موضوع کو نظر انداز کرتا ہوں - صرف بر سبیل تذکرہ اتنا یہاں کہہ دیتا ہوں کہ میڈم لیو پولٹ (Leopolt) نے ہندی میں اندھوں کی تعلیم کے لیے ایک ابتدائی کتاب لکھی ہے - اس میں دیوناگری حروف کاغذ کی سطح پر اُبھرے ہوے ہیں - یہ کتاب ہماری پیرس کی نمایش میں موجود ہے —

ہندوستان میں اس سال بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ہندوستانی

دونوں شاخوں یعنی ھندی اور اردو میں کس کو ترجیح حاصل ھے اور یہ کہ آیا عربی اور فارسی الفاظ کو باقی رکھنے کی ضرورت ھے یا نہیں *۔ میرے خیال میں یہ بحث ھی سرے سے بیکار ھے اس لیے کہ زبانوں میں بالارادہ تبدیلیاں نہیں پیدا کی جاسکتیں۔ اگر ھندو فضلا یہ چاھیں کہ اردو کی اھمیت کو کم کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ اردو نے ھندوستان میں جو حیثیت قایم کر لی ھے وہ باقی رھے گی۔ وہ اگر چاھیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ھوسکتی اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑھ گئے ھیں وہ آسانی سے ترک نہیں کئے جاسکتے †۔ ان کی

---

* کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اجلاس میں اس پر بحث ھوچکی ھے کہ آیا سائنس کی یورپین اصطلاحات کو رھنے دیا جاے یا یہ کہ عربی اور سنسکرت کی قدیم اصطلاحات کو رائج کیا جاے اور نئے ترجمے کئے جائیں۔ جی کمبل (G. Cambell) کی یہ راے تھی کہ جہاں تک ممکن ھے مشرقی اصطلاحات کو باقی رھنے دینا چاھئے اور مغربی اصطلاحیں صرف اس وقت استعمال کرنی چاھئیں جب کہ بغیر اس کے کوئی چارۂ کار نہ ھو۔ میں بھی موصوف کی اس راے کے ساتھہ متفق ھوں۔ لیکن راجہ بابو رجندر لال متر نے اس خیال کی مخالفت کی۔ یہ پوری بحث سنہ ۱۸۶۶ع کی ایشیاٹک سوسائٹی کی روداد میں مفصل طور پر شایع ھوچکی ھے۔

† ۷- مئی سنہ ۱۸۶۷ع کے کلکتہ ریویو میں میری ناچیز راے سے موافقت

[بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ]

کوشش بالکل ایسی ہوگی جیسے انگریز فضلا یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کردے جو انگریزی زبان میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مل گئے ہیں۔

ہندو عوام خود بجائے اس کے کہ ہندی کو اردو پر ترجیح دیں اپنی زبان کو اردو سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ صوبجاتی السنہ میں بھی اردو کے لا تعداد الفاظ رائج ہوچکے ہیں۔ بنگال میں تو ایک مخصوص بولی نکلی ہے جسے "اردو بنگالی" کہتے ہیں۔ میں اس کی نسبت پہلے کسی صحبت میں ذکر کرچکا ہوں۔ یہ بولی بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول ہورہی ہے §۔

میں اور مسٹر بیمز اردو کے حمایت میں تنہا نہیں ہیں جو دہلی کے ٹکسالی زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جس میں عربی اور فارسی

[باقی حاشیہ از صفحہ گذشتہ]

کا اظہار کیا گیا ہے جو میں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اس جلسہ کے متعلق ظاہر کی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی تھی کہ آیا اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا ہندی کو۔ اس ریویو نے لکھا ہے کہ "موسیو گارسان دتاسی نے اردو کی حمایت میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ہمیں ٹھیک معلوم ہوتا ہے" ۴ - جولائی سنہ ۱۸۶۷ ع کے "بمبئی پولا" میں بھی میرے خیالات کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے —

§ Rev. J. Long نے چند سال ہوے اس بولی کی ۹۵ مختلف کتابوں کا اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے جو طبع ہوچکی ہیں —

کے الفاظ کی آمیزش ہے - ہم نہ اس کے قایل ہیں کہ عربی فارسی الفاظ اردو میں سے خارج کردئیے جائیں اور نہ ہم ہندی کو بے وجہ اردو پر فوقیت دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ "دہلی گزٹ" میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ آگرہ کے دربار میں ' جس کی نسبت میرتھہ کے " اخبار عالم" میں تفصیل نکل چکی ہے،' انگریزی سے جو ترجمے کئے گئے یا براہ راست اردو میں جو تقاریر ہوئیں وہ بہت سادہ زبان میں ہوئیں - اردو میں اس وقت تک لطف نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں - یہی زبان ہندوں اور مسلمانوں دونوں کو بھاتی ہے - "دہلی گزٹ" کے نامہ نگار کا خیال ہے کہ دربار وغیرہ کے موقعوں کے لئے اردو سے بہتر زبان نہیں ہوسکتی - لیکن اگر دیدہ و دانستہ عربی اور فارسی الفاظ اس میں سے خارج کردئیے جائیں جو اہل ہند اسلامی ممالک سے مستعار لیتے رہتے ہیں تو اردو بے کیف رہ جائے گی -

سر جان لارنس کو ویسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوے اب تین سال ہوگئے - آگرہ کے دربار کے موقع پر آپ پہلی مرتبہ پبلک کے سامنے شان و تجمل کے ساتھہ جلوہ فرما ہوے - دوسال قبل لاہور میں جو دربار منعقد ہوا تھا اس کی حیثیت مقامی تھی - اس میں صرف پنجاب والے شریک ہوے تھے - لیکن آگرہ کے دربار کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی - در اصل ہندوستان میں آگرہ سے زیادہ موزوں ملک کا دارالسلطنت بننے کے لئے کوئی دوسرا شہر نہیں ہے - جغرافی حیثیت سے بھی یہ شہر اس کے لئے موزوں ترین ہے - اگرچہ یورپ والوں کے لئے ہندوستان کا دارالسلطنت سمندر کے قریب رکھنا ہی زیادہ مناسب ہے -

وایسرائے کے شاندار خیمہ کے بیچوں بیچ ایک تخت رکھا گیا تھا

جس پر سنہرے کام کا تخت پوش بچھا تھا - اس تخت کے داہنے بائیں جانب ہندو اور مسلمان امرا زرق برق ملبوسات اور جواہرات پہنے ہوئے تھے' جلسے میں جو یوروپین تھے ان کے دلوں میں گولکنڈہ کی ہیرے کی کانوں اور کوہ نور کی یاد تازہ ہوگئی - بندیلکھنڈ کے رجواڑے اس جلسہ میں خاص طور پر نمایاں تھے - ان کی تلواروں کے دستوں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے' ڈھالوں کی سطح پر چاندی کا ابھرا ہوا کام تھا اور ان کے ہاتھوں میں نہایت خوشنما چھڑیاں تھیں - اس دربار میں ہندوستانی خواتین بھی اِکا دکا نظر آتی تھیں جو اس ملک کے لئے بالکل نئی بات ہے - وائسرائے جب تخت پر بیٹھنے کے لئے تشریف فرما ہوئے تو توپوں کی سلامی دی گئی - اس کے بعد ولیم میور (W. Muir) نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا جس کی بنا پر خطابات تقسیم کئے گئے اور خود وائسرائے بہادر نے ہندوستانی میں حاضرین کے روبرو تقریر کی * - جن کو خطابات عطا ہوئے ان میں مہاراجہ جے پور اور دوسرے رجواڑے شامل تھے - اس دربار میں شری رادھا کنت دیب نے بھی شرکت کی تھی - موصوف سنسکرت کے بڑے فاضل سمجھے جاتے ہیں - آپ نے سنسکرت زبان کی ایک ضخیم لغت تیار کی ہے - آپ نہایت کٹر قدامت پسند ہندو ہیں اور ہر قسم کی معاشرتی ترقی کو دھرم کے خلاف تصور کرتے ہیں - ان کے علاوہ دیو نارائن سنگھ تھے جو نہایت آزاد خیال ہیں اور انگریزی تعلیم پا چکے ہیں -

---

* وائسرائے کی پوری تقریر ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ع کے Indian Mail اور Times میں شایع ہوچکی ہے - طویل ہونے کے باعث میں اس موقع پر اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے نقل کروں —

آپ برہمنوں کی اعلیٰ ذاتوں میں تعدد ازدواج کی رسم کے خلاف ہیں ۔ دربار میں پرسنو کمار ٹگور بھی موجود تھے جنھوں نے ہندو دھرم شاستر پر ایک نہایت اہم کتاب کا ترجمہ شائع کیا ہے ۔ اس کا نام دودا چنتامنی ہے ۔ یہ کتاب کلکتہ میں سنہ ۱۸۶۳ ع میں طبع ہوئی ہے اور تین سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے —

رجواڑے اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار دربار میں آتے اور وائسرائے کے ہاتھ سے خلعت پاتے تھے ۔ اور اس کے بدلے میں نذرانے دیتے تھے ۔ اس موقع پر فرق مراتب کا پورا خیال رکھا گیا تھا ۔ ان کے بعد وہ لوگ جنھوں نے پبلک کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کی ہے وائسرائے کی خدمت میں پیش کیے گئے ۔ جن میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں ۔ بابو خان سنگھ بیدی جنھوں نے پنجاب میں تعلیم نسواں کے رواج میں سعی بلیغ کی ۔ شیو پرشاد جو بنارس کے مشہور مصنف ہیں جنھوں نے اہل ہند کو مغربی تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کی غرض سے متعدد کتابیں شائع کرائی ہیں ۔ سر سید احمد خاں جنھوں نے انجیل مقدس کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کی ہے ۔ اور جو "انجمن اسلامی" کے بانی ہیں ۔ موصوف مذہبی معاملات میں "انتخابیت" کے قائل ہیں یعنی ہر مذہب کی اچھی باتوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں * —

---

* انجیل مقدس کی تفسیر کی دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں ۔ پہلی جلد کے متعلق سنہ ۱۸۶۳ ع کے خطبے میں میں ذکر کر چکا ہوں ۔ میں نے سنا ہے کہ دوسری جلد بھی یورپ پہنچ چکی ہے لیکن اب تک مجھے موصول نہیں ہوئی ۔ اس میں باب 'پیدائش' کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے ۔ یہ ترجمہ اصل عبرانی کے مطابق ہے —

خطابات تقسیم کرنے کی رسم کے بعد ہندوستانی طریقے کے مطابق پان اور عطر تقسیم کیا گیا - پھر مختلف قسم کی تفریحات رہیں - رات میں چراغان کیا - تاج محل کی بجلی کی روشنی کا عکس جمنا کے پانی پر پڑتا تھا جس کی وجہ سے عجب منظر پیدا ہوگیا تھا —

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہوں جس کے سلسلے میں یہ باتیں میں نے آپ صاحبوں کے سامنے بیان کیں —

ہندی کے حمایتیوں میں مسٹر ایف ایس گروس (F.S. Growse) کا اور اضافہ ہوا ہے * - معلوم ہوتا ہے وہ ان تعصبات پر یقین رکھتے ہیں جو اردو کے مخالفوں نے اس زبان کے متعلق ملک میں پھیلائے ہیں - اس کے ساتھ موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ تیس چالیس سال قبل جو اردو رائج تھی اس کو باقی رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے † - لیکن شاید موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں اردو کے خاص خاص شاعر زندہ تھے - حاتم اور ولی کا عہد یہی ہے - اس زمانہ کی شاعری عربی اور فارسی الفاظ سے پر ہے - چنانچہ شیکسپیر کی ڈکشنری ان سب

---

* بقول مسٹر بیمز (Beames) ہندی کے حدود متعین کرنا بہت دشوار ہے - دیکھو موصوف کی کتاب " ہندوستانی لسانیات کا خاکہ " - پنجاب میں ہندی پنجابی سے ملی جلی ہے اور سندھ میں سندھی سے - اندور میں گجراتی کے الفاظ اس میں شامل ہیں اور بنگال کے سرحد کے قریب بنگالی نے اس کی حدود میں راہ پالی ہے - اسی طرح وسط ہند میں مرہٹی اس سے جدا نہیں کی جا سکتی -

† دیکھو موصوف کا مضمون " (ہندوستانی کے طرز انشا پر بعض اعتراضات " (جرنل آف دی ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال - نمبر ۱۳۴ صفحہ ۱۷۲) —

الفاظ پر حاوی نہیں - اگر آپ اس وقت کی اردو کے سب الفاظ تلاش کرنا چاہتے ہیں تو جانسن کی لغت فارسی اور فریتاگ یا گولیس کی لغت عربی کی طرف ہاتھ اٹھانا پڑے گا - مسٹر گروز جس ادبیات کو مصنوعی کہتے ہیں وہ فی الحقیقت اس کی مستحق ہے کہ لوگ اسے جانیں * - ہاں، میں بھی مسٹر گروز کی طرح اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے خواہ مخواہ کی جو ایک خلیج اردو اور ہندی کے درمیان پیدا کردی ہے وہ غیر ضروری ہے - یہ در اصل بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تصور کیا جاے —

پنڈت پلمہیا گورہ جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا ہے، اپنے ایک خط میں، جو انھوں نے مسٹر کاول † حال پروفیسر سنسکرت، کیمبرج یونیورسٹی کو لکھا ہے، اپنے تئیں ہندی کے حامیوں کے زمرہ میں شریک کرتے ہیں - ان کے نزدیک ہندی کو اردو پر ہر طرح ترجیح حاصل ہے - ہم موصوف کے اعتراضات کا بھی اسی طرح جواب دے سکتے ہیں جس طرح

---

* مجھے تعجب ہے کہ مسٹر گروز نے اردو کے لیے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ "اس زبان کی نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ اس کا کوئی ادب ہے" -

† سنسکرت کی پروفیسری کے لیے مسٹر کاول (Cowell) سے زیادہ موزوں شخص ملنا دشوار ہے - موصوف اپنے علم و فضل کی بدولت عام شہرت رکھتے ہیں - سنسکرت کے علاوہ آپ ہندوستانی سے بھی واقف ہیں - اس کے ساتھ یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آپ نے ہندوستان کے دوران قیام میں تعلیم کو عام کرنے میں سعی بلیغ کی اور اس طرح اہل ہند کی بڑی خدمت کی —

دوسروں کے مقابلے میں ہم نے کیا ہے - در اصل ہندو لوگ اس معاملے میں مشکل ہی سے غیر جانبداری کے ساتھ غور کر سکتے ہیں - ان کے قومی غرور کو اردو کے عربی اور فارسی الفاظ کی موجودگی سے صدمہ پہنچتا ہے - وہ چاہتے ہیں کہ اردو میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ کلیتاً خارج کردیے جائیں - وہ خالص ہندی یا برج بھاشا کو رواج دینے کے حوصلے رکھتے ہیں - لیکن در اصل اب اس قسم کی کوششیں بے سود ہیں - اردو ابتدا سے مختلف زبانوں کی پوٹ رہی ہے اور رہے گی -

لیکن پنڈت صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ٹکسالی ہندی (High Hindi) اور سنسکرت دونوں مردہ زبانیں ہیں - خود ہندوؤں میں ان کا رواج بہت کم ہو گیا ہے - انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اردو ہندوستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے - پھر پنڈت صاحب میری طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں کی بنیاد ایک ہے - آپ چاہیں تو دونوں کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کریں - جب اسی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ داخل کردیے جاتے ہیں تو اس کو اردو کہتے ہیں اور جب خالص ہندی محاورے استعمال ہوں تو اسے ہندی کہتے ہیں - ہم بھی موصوف کے ساتھ متفق ہیں کہ ہندی اور اردو کی بنیاد ایک ہی ہے - ہم بار بار اس بات کو اس واسطے دہراتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو جاے - پنڈت صاحب سنسکرت کے غیر مروجہ الفاظ کے استعمال کے خلاف ہیں اور اس کو اصولی حیثیت سے برا بتاتے ہیں -

اب ہندوستانی کی صورت حال یہ ہے کہ اس کو دو بولیوں میں تقسیم کیا گیا ہے - ہندی میں اسلامی تہذیب کے الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے - اس کے پیش نظر از منۂ متوسط کے ہندو مصنفین کی نقل ہے - ہندی

ہندوستان کے گانوؤں میں اپنی اصلی شکل میں ملتی ہے - اردو میں ' جسے ہم مسلمانوں کی ہندوستانی کہہ سکتے ہیں ' عربی اور فارسی کے بیشمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں - اردو شہروں میں عام طور پر بولی جاتی ہے اس لیے تعلیم ' اخبارات اور تصنیف کے لیے یہی زبان موزوں ہے - چنانچہ مسیحی مبلغین مذہب اس زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نشر و اشاعت کے لیے استعمال کرتے ہیں - آخر میں ' میر امن نے باغ و بہار کے دیباچہ میں اردو زبان کی جو حقیقت بیان کی ہے اس کو میں یہاں نقل کرتا ہوں :-

" حقیقت اردو کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے - انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے - ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا - سلطان محمود غزنوی آیا ' پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوے - اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی - آخر امیر تیمور نے ہندوستان کو لیا - ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا ' اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا .... امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی - ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی " -

ابسن اور اُس کی تصانیف

(۴)

از

(جناب عبدالشکور صاحب، ایم - اے، بی - ٹی)

ابسن کی زندگی کا دوسرا دور ختم ہوتا ہے، گرجا اور کلیسا کی تعمیر ختم کرنے کے بعد اس نے عوام الناس کے لیے تعمیری کام شروع کیا، جب وہ بھی ختم ہوچکا تو زندگی کے آخری دور میں وہ ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کرتا ہے، یہ اس کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے، مگر یہ تجویز عرصے سے اس کے دماغ میں موجود تھی، اولین نظم کے شائع ہونے پر اس کے دل میں جو جذبات اور خواہشات پیدا ہوئی تھیں ان کو اس نے اپنی ایک مختصر سی غزل میں اس طرح ادا کیا ہے —

" میں اپنے لیے بادل میں قلعہ بناؤں گا، اس کے دو بازو نمایاں ہوں گے

" ایک بڑا، دوسرا چھوٹا، وہ شمال میں چمکیے گا

" بڑا بازو ایک غیر فانی گانے والے کو پناہ دے گا

" چھوٹا ایک خاتون کے لیے دروازہ کھولے گا "۔

ابسن زندگی کے آخری ایام میں ایسے قلعے بنانا شروع کرتا ہے، ان

کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بنیادیں بھی ہوا میں قائم کی جاتی ہیں '
اور ان کے باشندے صورت سے تو انسان ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن عادات
اور خصائل کے لحاظ سے انسانوں سے مختلف ہیں ' اس کی وجہ یہ ہے کہ
ابسن پردے پردے میں بات کہنا چاہتا ہے ' ابسن مجاز کی نقاب اپنے چہرہ
پر ڈال کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے ' اور اپنے اشخاص ڈراما
کو بھی اسی انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے '۔ " جنگلی بط "
ابسن کا اولین مجازی ڈراما ہے ' اس کے بعد اس نے جتنے ڈرامے لکھے ان میں
یہ رنگ گہرا ہوتا گیا ۔ مگر اس کے ابنائے وطن بالخصوص ناروے کی
نئی پود ابسن کے کلام کے اس نئے طرز کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتی
تھی ۔ بارہ مارچ سنہ ۱۸۹۱ ع کو میونک میں نوجوان مصنفین نے ایک
بڑی دعوت دی جس میں ابسن اعزازی مہمان تھا ۔ اس موقعہ پر ایک
نوعمر شاعر مارٹن گریف نے تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم تلمیحات اور
استعاروں میں لپٹے ہوئے کرداروں سے مانوس نہیں ہو سکتے ' "The Lady"
"From the Sea" "Hedda Gabler," سب تاریک ' بعید از قیاس اور ادق ہیں '
کسی دوسری شے کو کسی شے کا نمایندہ کیوں بنایا جائے ' اگر آرٹ صداقت
پرستی کا دوسرا نام ہے تو پھر یہ کیوں جائز رکھا جاتا ہے —

اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ یہ نکتہ چینی کہاں تک درست ہے ' مگر ابسن کو
یہ پتا چل گیا کہ نئی پود اس کے مقابل میں آچکی ہے ' برگد کا وسیع اور بلند
درخت ارد گرد کے پودوں کو مشکل سے سر سبز ہونے دیتا ہے ' اسی طرح
ایک بلند پایہ شاعر بعض اوقات مبتدیوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہو جاتا
ہے ۔ ابسن ان اطراف میں عرصۂ دراز سے بلا شرکت غیرے میدان علم و ادب
کا تنہا بادشاہ تھا اور گوشے گوشے میں اسی کی عظمت کے گیت گائے جاتے

تھے - مگر اب ابسن نے دوسرا رنگ بدلا ' زمین سے بلند ہو کر ہوا میں اڑنے لگا - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ نئی پود نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا - ابسن ایک فہیم اور دور اندیش ادیب تھا ' اس نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ہوا کا رخ تبدیل ہو رہا ہے - چنانچہ وہ خود اپنی رام کہانی کہنا شروع کرتا ہے ' یہ ممکن ہے کہ اس ڈرامے میں فن کے اعتبار سے نقائص موجود ہوں ' لیکن ابسن کی سوانح عمری اور اس کی روح کی نگارش لطیف دلچسپ ضرور ہے —

اس ڈرامہ کا نام " The Master Builder " ہے ' یہ سنہ ۱۸۹۲ ع میں تصنیف ہوا تھا - یہ تصنیف ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ہم بڑی وضاحت سے ابسن ' اس کی بیوی اور ابسن کے گھریلو زندگی کا عکس دیکھتے ہیں - سولنس (Solness) کے لباس میں ابسن موجود ہے اور الین (Aline) ابسن کی بیوی کی ہم شکل ہے ' ابسن پوری تصویر پیش کرنے کا عادی نہیں ' وہ کردار کی صرف وہ جھلک نمایاں کرکے صفحات پر پیش کرتا ہے جو اس کی روئداد کے لیے معاون ہوتی ہے - مثلاً اپنی اہلیہ کی محض ایک خفیف سی خصوصیت اس نے اس قدر گہرے رنگ میں پیش کی ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ ان دونوں میں ایک مستقل شکر رنجی مدت سے چلی آرہی ہے - اس خفیف اور لطیف شکر رنجی کی صرف یہ وجہ تھی کہ " گڑیا کا گھر " شائع ہوتے ہی جرمنی کے اطراف و جوانب کے نوجوان شوہروں سے بد ظن اور رومانیت پرست عورتیں ابسن کو اپنا امام اور ہادی سمجھنے لگی تھیں ' اور اکثر اسے گھیرے رہتی تھیں ' ابسن ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کرتا ' اور ان کی فطرت ' رجحانات ' میلان طبع اور نفسیات کا ایک مبصر کی طرح مطالعہ کرتا

رہتا تھا، گو ابسن کی بیوی ہمیشہ یہی کہتی رہتی "ابسن! تم ان عورتوں کے جھرمٹ سے دور ہی دور رہو"۔ ابسن کہتا "نہیں نہیں انہیں آنے دو میں ان کی سیرت کا مطالعہ ذرا غور سے کرنا چاہتا ہوں"۔

چنانچہ نورا، ہاڈا، ہڈا، لونا، مرتھا، سب کی تخلیق اسی مطالعہ کے ذریعہ سے ہوئی —

سولنس اپنے شہر کا ایک نہایت نامور اور دولت مند معمار ہے، بروک اس کے ہاں ملازم ہے جو خود کسی زمانے میں نہایت کامیاب معمار تھا، اس کا بیٹا ریگنر اور اس کی بھتیجی کے آ (Kaia) دونوں سولنس کے عملے میں موجود ہیں، اول الذکر نقشہ نویس ہے، آخرالذکر محاسب۔ بروک دفتر میں موجود ہے لیکن اس قدر علیل ہے کہ وہاں زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا، کے آ اسے مشورہ دیتی ہے کہ جاؤ گھر چلے جاؤ، وہاں جاکر آرام کرو۔ لیکن وہ جانے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک سولنس نہ آئے گا میں نہ جاؤں گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں آج سولنس سے آخری فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا بیٹا کہتا ہے کہ ابھی اور انتظار کرو۔ اسی دوران میں سولنس آ موجود ہوتا ہے؛ اور کے آ سے کچھ راز و نیاز کی باتیں کرنا چاہتا ہے کہ وہ اسے نرمی سے خاموش کر دیتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شادی شدہ شخص اور ان کی بیوی اپنے مجوزہ مکان کے نقشہ کے لیے مضطرب ہیں لیکن وہ یہ کہہ کر بات ٹال دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے مکان کے نقشے کے لیے ایسا ہی مضطرب ہوتا ہے، اور اگر وہ کسی اور معمار سے رجوع کرنا چاہے تو میں کمیشن بھی واپس کرنے کو تیار ہوں۔ اس کے بعد بروک اور سولنس میں خفیہ باتیں شروع ہوتی ہیں، بروک کی یہ خواہش ہے کہ اس کا لڑکا ریگنر علحدہ اپنا کام کھولے، مگر سولنس کہتا

ہے کہ وہ نقشہ کشی کے سوا اور کچھہ نہیں جانتا - یہ سن کر برووک بہت دل گیر ہوتا ہے اور دردناک آواز میں کہتا ہے کہ تم اس کی اب اتنی مدد ضرور کرو کہ یہ کوئی کام آزادانہ طور سے کر گذرے تاکہ مرنے سے قبل میں اس کے ہاتھہ کا کوئی نمایاں کام دیکھہ سکوں - سولنس کہتا ہے کہ کیا میں اس کے لیے آسمان پر سے کھینچ لاؤں - جس کا وہ یہ جواب دیتا ہے کہ اسی وقت اسے ایک بڑا کام مل سکتا ہے - اُس کا اشارہ اس کام کی طرف ہے جس کا ذکر سولنس نے اس گفتگو کے شروع میں بے اعتنائی سے کیا تھا - اب وہ گفتگو کا طرز بدل کر کہتا ہے کہ وہ مکان تو میں خود بنانے والا ہوں -(واقعہ یہ ہے کہ اس کا مجوزہ مکان کا نقشہ اور تخمینہ ریگنر نے ہی تیار کیا تھا جو بہت ہی پسند کیا گیا تھا کیونکہ اس نقشہ میں جدت تھی) - یہ سن کر سولنس بگڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے لڑکے کو ہرگز یہ کام نہ دوں گا - برووک کی آواز غصے سے بھرانے لگتی ہے اور وہ پوچھتا ہے کہ کیا میں دنیا سے اسی طرح ناشاد و نا مراد چلا جاؤں گا - لیکن سولنس کے دل پر اس گفتگو کا مطلق اثر نہیں ہوتا - برووک کی حالت خراب ہونے لگتی ہے - اور وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ چلا جاتا ہے —

سولنس اور کے آ میں عشق و محبت کے شکوے شکایات کا دفتر شروع ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کے آ کی منگنی ریگنر سے عرصہ ہوا ہو چکی تھی ' اب شادی بھی ہونے والی ہے ' لیکن کے آ اپنے آقا کی محبت کا دم بھرتی ہے اور کہتی ہے کہ " آپ خوب جانتے ہیں کہ صرف ایک ہی شخص ہے جسے میں چاہتی ہوں اور ساری دنیا میں وہی ایک شخص ہے جس کی میں پروا کرتی ہوں اور کسی کی مجھے مطلق پروا نہیں "—

جس کا سولنس یہ جواب دیتا ہے کہ چاہے تم ریگنر سے دس دفعہ شادی کرو لیکن اُسے یہ ملازمت ترک کرنے نہ دو ' کیونکہ ایسی حالت میں میں تمہیں بھی یہاں رکھہ سکتا ہوں - اس وقت کسی کے پاؤں کے چاپ سنائی دیتی ہے اور کے آ جلد اپنے میز پر جاکر کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرتی ہے - مسز سولنس آتی ہے - کچھہ مشکوک نگاہیں کے آ پر ڈالتی ہے اور اپنے شوہر کو اطلاع دیتی ہے کہ ڈاکٹر ہالورڈ دوسرے کمرے میں موجود ہے ' یہ کہہ کر وہ چلی جاتی ہے ' اور دروازہ بند کردیتی ہے ' کے آ کا عشق پھر اُبھرنے لگتا ہے اور وہ سولنس سے کہتی ہے کہ میں اپنی منگنی توڑنے کے لیے تیار ہوں - کیونکہ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم سے جدا ہوکر رہوں - جانے سے قبل وہ ریگنر کے نقشے سولنس کو دے جاتی ہے - کمرے میں مسز سولنس اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں ' میاں بیوی میں شک آمیز نوک جھوک ہوتی ہے جس کا موضوع کے آ ہے - ڈاکٹر اور سولنس میں بات چیت ہونے لگتی ہے ' وہ کہتا ہے کہ مسز سولنس کے آ سے سخت برگشتہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ تم دونوں میں رات دن کا ربط ضبط ہے ' اور یہ امر مسز موصوف کی صحت کے لیے سخت مضر ہے - مگر سولنس صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اس کے بغیر میرا کام چل ہی نہیں سکتا - پھر وہ ساری رام کہانی سنانی شروع کرتا ہے - بروک اور ریگنر کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہے ' کے آ کا آنا ' اس کا اور ریگنر کا پیار ' پھر خود اس کی اور کے آ کی ملاقاتیں ' اور کے آ کا سولنس پر عاشق ہوکر اپنی خوشی سے ریگنر سے قطع محبت وغیرہ - بہ خیال خود وہ گویا اپنی بیوی الین سے انتقام لے رہا ہے - بیوی اسے دیوانہ تصور کرتی ہے - اس قصے کے دوران میں الین کے قدیم آبائی مکان کے جلنے کا قصہ نکل آتا ہے جس کے

صدمے نے اس کی صحت ہمیشہ کے لیے خراب کردی تھی جس میں اس کے دو بچے جل کر مرے اور جس کے بعد وہ پھر کبھی ماں نہ بن سکی ' مگر اسی مکان کے کھنڈر پر سولنس کی دنیوی ترقی کی عالی شان عمارت تیار ہوئی تھی - قسمت سولنس کے ساتھ ہے اور وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کررہا ہے مگر اب وہ بے حد پریشان ہے ' اُسے ڈر ہے کہ قسمت برگشتہ نہ ہو جائے - ڈاکٹر پوچھتا ہے :

" حماقت ! قسمت کون برگشتہ کردے گا ؟ "

" نئی نسل - "

نئی نسل ! کیا خوب ! تمھاری حالت پہلے سے بدرجہا زیادہ مستحکم ہے "

" قسمت ضرور پلٹا کھائے گی - میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ دن آرہا ہے - کوئی اور شخص اپنے دماغ میں یہ خیال پاکر مجھ سے کہے گا " مجھے موقعہ دو " - اس کے پیچھے سب شور مچاتے ہوئے آئیں گے ' اور مجھے سخت سست کہہ کر دھمکائیں گے - کوئی دن جاتا ہے کہ نئی نسل میرا دروازہ پیٹ رہی ہوگی " -

ڈاکٹر کہتا ہے ' فرض کرو کہ ایسا ہوا بھی ' مگر اس کا کیا نتیجہ ہوگا ؟ - جس کا سولنس یہ جواب دیتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو میرا خاتمہ ہو جائے گا - اس کے بعد ہی کوئی دروازہ پر دستک دیتا ہے ' ہلدا داخل ہوتی ہے - اس کا قد میانہ ہے ' اس کا جسم نازک ہے ' جلد تمازت آفتاب سے قدرے متاثر معلوم ہوتی ہے ' اس کا لباس سفری ہے ' اس کا سایہ اونچا ہے تاکہ چلنے پھرنے میں آسانی ہو ' بحری مسافر کی طرح اس کا کالر کھلا ہوا ہے ' سر پر ایک چھوٹی سی بحری ٹوپی ہے ' سامان سفر ایک تھیلے میں

پشت پر موجود ہے - اس انداز سے وہ اسٹیج پر آتی ہے، آنکھوں میں خوشی کی سرخی دوڑ رہی ہے - وہ سولنس کو سلام کرتی ہے، سولنس کچھ تعجب کے بعد اُسے پہچان جاتا ہے، اس کے وطن میں سولنس نے ایک قدیم گرجا کا مینارہ بنایا تھا، اس وقت ہلدا بارہ تیرہ برس کی لڑکی تھی- ہلدا مسز سولنس سے بھی واقف ہے، اس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ ایک صحت گاہ میں کچھ دن رہ چکی تھی - اب وہ اس کے مکان پر رات کی رات بطور مہمان کے رہنا چاہتی ہے، سولنس اپنی بیوی کو اطلاع کرنے جاتا ہے - ڈاکٹر ایک مریض کو دیکھنے کی اجازت چاہتا ہے - مسز سولنس اپنے مہمان کا خیر مقدم کرتی ہے - سولنس کے مکان میں تین بچہ خانے (Nurseries) ہیں لیکن بچہ کوئی نہیں، چہل قدمی کرتی ہوئی ہلدا دفتر کی میز پر جا پہنچتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ یہاں کون کام کرتا ہے - سولنس جواب دیتا ہے - ہلدا بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی ہے، اس کے پاس نہ کوئی اور لباس ہے؛ نہ ترنک ہے، نہ روپیہ، وہ خود یہ نہیں جانتی کہ وہ وہاں کب تک قیام کرے گی- اس کے بعد سولنس اور ہلدا میں کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے، وہ سولنس کے مینارہ تیار کرنے، اس پر پھولوں کا ہار لٹکانے اور اس بلندی پر چڑھنے کے قصے کو دہراتی ہے - مینار تیار کر کے سولنس خود اس بلندی پر پھولوں کا ایک ہار آویزاں کرنے گیا تھا، ہلدا اسکول کی لڑکیوں کی قطار میں موجود تھی اور اپنا رومال ہلاتی جاتی تھی، یہ ضرور ہے کہ اس بلندی پر جا کر سولنس کا سر چکرانے لگا تھا؛ لیکن وہ ایک باہمت اور کامیاب آرٹسٹ کی طرح اس مہم میں ثابت قدم نکلا، اس کے بعد سولنس ہلدا کے یہاں کھانے پر مدعو تھا - ہلدا سفید لباس پہنے ہوے شاہزادی معلوم ہوتی تھی جس کو دیکھ کر سولنس یہ کہہ گذرا تھا:

" تم بڑی ہو کر میری شہزادی بنوگی ' اور میں تمھیں ایک قلعہ
اور ایک سلطنت دوں گا " * —

ہلدا کہتی ہے کہ میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں تمھاری بنائی ہوئی عمارتیں دیکھوں - سولنس کہتا ہے کہ پہلے میں گرجاؤں کے مینارے بناتا تھا ' مگر ادھر میں نے انسانوں کے رہنے بسنے کے لیے مکان بنائے ہیں ' ہلدا کہتی ہے :

"کیا تم ان مکانوں پر ایک چھوٹا سا مینارہ نہیں بنا سکتے ؟ " —

تعجب ہے کہ سولنس خود اسی تجویز پر اس دوران میں غور کر رہا تھا - نہ صرف یہ بلکہ اس نے خود اپنے لیے ایک مکان تیار کیا تھا - جس پر ایک بڑا اونچا مینارہ تھا - ہلدا کہتی ہے میں کل صبح تڑکے اسے دیکھنے جاؤں گی - گفتگو جاری رہتی ہے - سولنس کہتا ہے کہ میں تمھارے آجانے سے بیحد مطمئن ہوں ' میں خود نئی نسل سے خائف ہو چلا ہوں ' اسی لیے مکان میں تنہا پڑا رہتا ہوں ' میں خوب جانتا ہوں کہ ایک روز یہ نئی نسل میرے دروازہ پر آکر میرے دروازے توڑنا شروع کرے گی - ہلدا جواب

سولنس ہلدا کے معصومانہ حسن سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اُس نے اُسے اپنی شاہزادی بنانے ' اس کے لیے قلعہ اور سلطنت حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا - اس کے بعد اُس نے اس کے بوسے لیے تھے ' اس وقت سولنس بوسہ لینے سے انکار کر رہا ہے - سلطنت کا نام اس عاشقانہ اور مشتاقانہ گفتگو میں " Orangia " تجویز ہوا تھا - یہ واقعہ انیس ستمبر کا تھا ' اتفاقاً یا قصداً اس روز بھی انیس ستمبر تھی - معلوم ہوتا ہے کہ ہلدا پورے دس سال بعد سولنس کی تلاش میں نکلی تھی - اس عرصۂ دراز تک وہ سولنس کا روزانہ انتظار کرتی رہی ' لیکن وہ نہ آیا ' اس لیے اسے خود گھر سے باہر نکلنا پڑا ' وہ کہتی ہے کہ انتظار ختم ہو چکا ' مجھے میری سلطنت دو —

دیتی ہے تم خود دروازہ کھول کر اس نسل سے دوستانہ تعلقات کیوں نہیں قایم کر لیتے ۔ اس کے بعد یہ لوگ کھانے کو جاتے ہیں اور ایکٹ ختم ہو جاتا ہے —

دوسرا ایکٹ کے آ اور سولنس کی گفتگو سے شروع ہوتا ہے ۔ بروک صاحب فراش ہے ۔ مسز سولنس پیشین گوئی کرتی ہے کہ بروک عنقریب مرنے والا ہے ۔ سولنس بات ٹالنے کی غرض سے اپنی بیوی کو یاد دلاتا ہے کہ نیا مکان تقریباً تیار ہے اور وہاں ہماری زندگی زیادہ پر لطف ہوگی مگر مسز سولنس بڑی درد ناک لہجہ میں یہی کہتی ہے :

تم جتنے چاہو مکانات بناتے جاؤ ' لیکن تم میرے لیے حقیقی مکان نہ بنا سکوگے—

مکان کی بات چیت شروع ہوتے ہی ۔ مسز سولنس کے دماغ میں ہزاروں خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں ۔ جس قدر وہ اس درد ناک موضوع کو دور رکھنا چاہتی ہے اسی قدر یہ خیالات بار بار اس کے دماغ پر طاری ہوتے رہتے ہیں ' آخر کار وہ کہتی ہے :

" بے شک ' دونوں جانب میرے فرائض تھے ' تمہاری طرف بھی اور ننھے بچوں کی طرف بھی ۔ مجھے اپنا دل پتھر کی طرح سخت کر لینا چاہئے تھا ۔ مجھے دہشت کو اتنا موقع نہیں دینا چاہئے تھا کہ وہ میرے اوپر مسلط ہو جاتی ۔ نہ مجھے اپنے مکان کے جل جانے کا اتنا ملال کرنا چاہئے تھا (کف افسوس ملتے ہوے) ' ہالورڈ ! کاش مجھہ میں برداشت کرنے کی قوت ہوتی " —

اس کے بعد سولنس اپنی بیوی کو یقین دلاتا ہے کہ وہ نہ صرف

ہے نہ دیوانہ' بلکہ ایک بوجھہ ہے جو اس کی روح کو پارہ پارہ کر رہا ہے' وہ بیوی کے احسان کا بوجھہ ہے' مگر اس کی بیوی یہ پہیلی سمجھنے سے قاصر ہے - قبل اس کے کہ سولنس کچھہ توضیح کرسکے ہلدا داخل ہوتی ہے' وہ کہتی ہے' میں سوئی تو خوب آرام سے لیکن میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا - وہ یہ کہ میں اونچے پہاڑ سے نیچے غار میں گر رہی ہوں - مسز سولنس کہتی ہے' میں ذرا بازار جا کر ہلدا کے لیے کچھہ ضروری چیزیں خرید لاؤں؛ ہلدا اس کی مہربانی کا گرمجوشی سے شکریہ ادا کرتی ہے مگر مسز سولنس اس پر بھی جواب دیتی کہ اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے' میں جو کچھہ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے - یہ کہہ کر وہ بازار کو روانہ ہو جاتی ہے - سولنس اپنی بیوی کی مدح سرائی شروع کرتا ہے' مگر ہلدا اس سے متفق نہیں ہے' اس کے خیال میں کسی ذی ہوش بھلے مانس کو " فرض " کا خوفناک لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئیے' کیونکہ اس کے خیال میں یہ لفظ نہایت ہی افسردہ کن' زہر آلود' اور کرخت ہے - اس کے بعد کتابوں کی الماری سے گذرتی ہوئی وہ نقشے دیکھنے لگتی ہے جو ریگنر نے طیار کیے تھے' وہ یہ بات پسند نہیں کرتی کہ سولنس نے یہ کام کسی اور کو کیوں سکھایا - وہ یہ چاہتی ہے کہ ملک میں سولنس اس فن کا تنہا اُستاد ہو - اس گفتگو سے ہلدا نے سولنس کی دکھتی ہوئی رگ میں جنبش پیدا کردی - سولنس ہلدا کو کھڑکی تک لے جاتا ہے اور اُسے وہ مکان دکھاتا ہے جو قریب مکمل ہو چکا تھا' اور جس پر ایک بہت بلند مینارہ زیر تعمیر تھا - یہ اس کا وہ نیا مکان تھا جس میں اب وہ منتقل ہونے والے تھے - اس میں بھی تین بچہ خانے ہیں - ان کے بچہ ہونے کی کوئی توقع نہ تھی - سولنس کے دو بچے تھے لیکن وہ نذر آتش ہو چکے تھے - وہ

ہلڈا سے کہتا ہے میں خوش ہوں کہ تم آگئیں، میں اب کسی سے بات چیت تو کر سکتا ہوں۔ سولنس کے جذبات شراروں کی طرح ابھرنے لگتے ہیں اور وہ قدیم داستان درد سنانے لگتا ہے۔ وہ اس آراضی کی جانب اشارہ کرتا ہے جہاں اس کی بیوی کا آبائی مکان تھا، جو جل کر خاک ہوگیا تھا۔ آگ کا ہولناک منظر، خوف، دہشت، رات کی سرد ہواؤں کے جھونکے، بے سروسامانی اور خواری، ان امور نے میری بیوی کو علیل کر دیا، یہاں تک کہ اس کا دودھ زہر آلود ہو گیا۔ مگر اس کا یہ اصرار تھا کہ بچوں کو دودھ خود ہی پلائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بچے چل بسے۔ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو اس کا صدمہ ہوا مگر اس حادثے کا دوسرا پہلو بھی ہے، اس فن میں میری کامیابی کی یہ پہلی سیڑھی تھی، میں نے کہیں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی بلکہ میں نے جو کچھ سیکھا خود ہی سیکھا۔ ہلڈا یہ گفتگو نہایت دلچسپی سے سنتی ہے اور کہتی ہے، سولنس تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ تم نے بنی نوع انسان کے لیے ایسے خوبصورت، آرام دہ، خوشنما مکانات تعمیر کیے۔ لیکن سولنس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ جو قیمت میں نے ادا کی ہے اس کا زخم دل پر سے آج تک مندمل نہیں ہوا۔ لوگ مجھے خوش نصیب تصور کرتے ہیں، لیکن میں خود جانتا ہوں کہ میں نے اس ظاہری خوش نصیبی کی کیا قیمت ادا کی ہے، بہ الفاظ دیگر میں اپنے فن میں اپنی بیوی کے فن کے کمالات قربان کر کے کامیاب ہوا۔ ہلڈا کہتی ہے، مگر اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ مگر سولنس کو اس کا یقین نہیں کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ ریگنر داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے، میرا باپ بستر مرگ پر ہے، اگر آپ نے نقشے دیکھ لیے ہوں تو ان پر سفارشی کلمات لکھ دیجیے تا کہ میرا باپ مرنے سے قبل وہ الفاظ

دیکھ لے ۔ سولنس کہتا ہے : ریگنر ! تم میرے ہاں ہی رہو ' جو تم چاہو گے ہو جاے گا ' اس کے بعد تم کے آ سے شادی کرسکتے ہو ' اور آرام سے زندگی بسر کرسکتے ہو ' مگر فی‌الحال عمارت کا کام خود تم شروع نہ کرو ' تم مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو جس کا پورا کرنا میری قوت سے باہر ہے ۔ ریگنر چلا جاتا ہے ۔ هلدا سولنس کے طرز کلام سے سخت برافروختہ ہوتی ہے ۔ سولنس ایک اور داستان شروع کرتا ہے ' وہ کہتا ہے ' ہمارے آتش دان کی چمنی میں ایک شگاف تھا ' میں نے کئی مرتبہ اس کو درست کرنے کا خیال کیا لیکن کوئی طاقت مجھے ہمیشہ روکتی رہی ' مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں اس شگاف کے ذریعہ سے شاید کامیابی کی بلندی تک پرواز کرسکوں ۔ گفتگو جاری رہتی ہے :

سولنس : کیا تمہارا یہ خیال نہیں کہ دنیا میں ایسی برگزیدہ ' منتخب ہستیاں موجود ہیں جن میں خواہش کرنے ' آرزو کرنے ' اور کسی شے کو چاہنے کا ایسا مادہ ودیعت کیا گیا ہے کہ آخر کار ان کی مسلسل ' پیہم اور اٹل آرزو کرنے سے وہ بات ضرور رونما ہوجاتی ہے ۔

هلدا (شک کے ساتھ) : اگر ایسا ہے تو ہم دیکھ لیں گے کہ میں بھی ان منتخب لوگوں میں ہوں یا نہیں —

سولنس : یہ صرف کسی کی شخصیت ہی نہیں جو اتنا بڑا کام کر گذرے ' اجی نہیں ' مدد کرنے والے اور خدمت کرنے والے ۔ ان کو بھی اپنا کام کرنا چاہئے ۔ اگر کسی فائدے کی توقع ہے ' لیکن وہ خود بخود کبھی نہیں آتے ' ان کو بار بار بلانا پڑتا ہے ' دل سے ' — تم سمجھیں ؟

هلدا : یہ مدد کرنے والے اور خدمت کرنے والے کون ہوے ؟

سولنس : اس کے متعلق ہم پھر کبھی بات چیت کریں گے ، فی‌الحال ہمیں صرف آتش زنی کے قصے ہی تک رہنا چاہئیے —

ہلدا : کیا تمہارا یہ خیال نہیں کہ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود بھی آگ ضرور لگتی ہے

سولنس : اگر یہ مکان کلنٹ بروک کا ہوتا تو آگ اسے اتنی جلد کبھی نہ ختم کر سکتی ؛ مجھے اس کا یقین ہے ، کیونکہ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مدد کرنے والوں کو کس طرح بلایا جاتا ہے ، اور نہ وہ خدمت کرنے والوں کو بلانا جانتا ہے (اضطراب میں اٹھ کر) ہلدا ! تو تم نے دیکھا ، آخر کار ، یہ میرا ہی قصور ہے کہ ان دو بچوں کی جانیں قربان کی گئیں ، اور کیا اس میں بھی میرا ہی قصور نہیں کہ الین پھر کبھی ویسی عورت نہ ہو سکی جیسے وہ ہوتی ؛ یا جو وہ ہونا چاہتی تھی —

ہلدا : بیشک ، اگر یہ سب مدد کرنے والوں کا ہی کام ہے تو —

سولنس : مدد کرنے والوں کو کس نے بلایا ؟ میں تھا ، وہ آئے انہوں نے میرے حکم کی تعمیل کی (بڑھتے ہوے جوش میں) ؛ یہ وہ شے ہے جسے لوگ کہتے ہیں کہ قسمت تمہاری معاون ہے ، لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسمت کو میں کیسا محسوس کرتا ہوں ؛ وہ میرے سینے پر ایک زخم ہے ، اور مدد کرنے والے دوسرے لوگوں کی کھال اتار کر بار بار میرے زخم کو پوشیدہ کرنا چاہتے ہیں ، لیکن پھر بھی زخم مندمل نہیں ہوتا ، کبھی نہیں ، کبھی نہیں ، کاش تم یہ جان سکتیں کہ بعض وقت اس میں کیسی ٹیس ہوتی ہے —

ہلدا کہتی ہے کہ تمہارا ضمیر کمزور معلوم ہوتا ہے ۔ سولنس کہتا ہے کہ تمہارا ضمیر بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتا ورنہ تم اپنے باپ کو تنہا نہ چھوڑتیں ۔ ہلدا جواب دیتی ہے ، کہ یہ ضمیر نہیں ہے بلکہ میرے دل میں کوئی ایسی تحریک پیدا ہوئی جسے میں دبا نہ سکی اور مجھے گھر سے باہر نکلنا پڑا ۔ یہ سن کر سولنس کہتا ہے کہ تمہارے جسم میں بھی وہ آسیب موجود ہے جو تمہارے خیال کے مطابق میری روح سے وابستہ ہے —

" ہلدا ، دنیا میں لا تعداد آسیب موجود ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے "۔

ہلدا : آسیب ؟

سولنس : (رک کر) اچھے آسیب اور برے آسیب ، سفید بالوں والے آسیب اور سیاہ بالوں والے آسیب ، اگر تم یہ بتا سکتیں کہ جس آسیب نے تم پر قبضہ کیا ہے وہ سفید ہے یا سیاہ تو بہت آسانی ہو جاتی ۔

ہلدا : (اپنی نظروں سے اسے دیکھتے ہوے) ، یا اگر ہمارے پاس مضبوط ، چمکدار اور تندرست ضمیر ہو ، تا کہ پھر ہم جو چاہیں کر گذریں ۔

سولنس : اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس معاملے میں میری طرح اور ہزار ہا افراد بھی کم مایہ اور بے حقیقت ہیں —

سولنس اسی لے میں باتیں کرتا رہتا ہے ، وکنگس (Vikings) کی داستاں چھیڑتا ہے جو قتل و غارت گری کرتے اور پھر اپنے وطن میں آکر شرابیں پیتے اور جشن مناتے تھے ۔ وہ ہلدا کو ایک شکار کرنے والی چڑیا تصور کرتا ہے ، ہلدا اس لقب کو پسند کرتی ہے ، اور کہتی ہے کہ آخر میں خود کیوں نہ شکار کرنے کو جاؤں ۔ پھر وہ ریگنر کے نقشے اٹھا لاتی

ہے اور سولنس سے کہتی ہے کہ تمہیں ان پر سفارشی کلمات لکھنا ہوں گے۔ سولنس غصے ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہلدا ضبط سے کام لیتی ہے۔ سولنس کہتا ہے کہ میں نے خود اس کے باپ کو تباہ کیا، اگر اسے بڑھنے کا موقعہ دیا گیا تو یہ سب سے پہلے مجھ پر ہاتھ صاف کرے گا۔ قسمت کی گردش ضرور رنگ لائے گی، گناہوں کا کفارہ دینا ہو گا۔ ہلدا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ ایسی فال منہ سے نہ نکالنا، میں تمہیں ہاتھ میں پھولوں کا ہار لیے پھر مینار کی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں —

اس اثنا میں مسز سولنس بازار سے واپس آتی ہے، وہ کئی چیزیں ہلدا کے لیے خرید کر لائی۔ ہلدا اس کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ الین پھر وہی کہتی ہے کہ اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے؟ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ اس کے بعد ہلدا اصرار کر کے سولنس سے ریگنر کے نقشوں پر تحسینی کلمات لکھوا لیتی ہے اور Kaia کو ہدایت کرتی ہے کہ اسے جلد برووک تک پہنچا دے۔ سولنس اس کے بعد ہی ریگنر اور کے آ کو ملازمت سے بر طرف کردیتا ہے۔ کے آ چلی جاتی ہے۔ سولنس اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ اب جس قدر جلد ہو سکے نئے مکان میں منتقل ہو جانا چاہیئے۔ آج شام کو میں خود اس کے بلند مینارے کی بلند ترین چوٹی پر ہار آویزاں کروں گا۔ یہ سن کر مسز سولنس سراسیمہ ہو جاتی ہے، اس کے خیال میں یہ خطرناک تھا کہ سولنس اس بلندی پر چڑھے، وہ اپنی روح کی پوری طاقت سے اپنے شوہر کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ہلدا بار بار سولنس سے یہ سوال کرتی ہے "کیا تم میں اس بلندی پر جانے کی ہمت باقی نہیں؟" کیا وہ اس بلندی تک پرواز نہیں کر سکتا جو وہ خود تعمیر کرتا ہے —

وہ بہت جلد نئے مکان میں منتقل ہوجاتے ہیں - مگر مسز سولنس کچھ خوش نہیں معلوم ہوتی ' اس کے آبائی مکان کی آراضی کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے نئے مکانات بنا دئے گئے تھے جن میں اب اجنبی آباد تھے - الین کو یہ بات پسند نہ تھی ! وہ کبھی اس پائین باغ میں نہ جاتی جو مکان سے ملحق تھا - سولنس کے حکم سے مجبور ہوکر اس مکان میں آگئی تھی اس لیے کہ شوہر کی تابعداری عورت پر فرض ہے - بچوں کی موت کو وہ حکم خداوندی تصور کرتی ہے جس کی رضا پر راضی رہنا ہر شخص کا فرض ہے - وہ آبائی جواہرات ؟ کوتے تھپے ' ریشمی ملبوسات اور اپنی نو گڑیوں کو یاد کرتی ہے جو نذر آتش ہو چکی تھیں - ڈاکٹر آتا ہے اس کے بعد سولنس آتا ہے - مسز سولنس ہلدا سے بار بار کہتی ہے کہ مینارے پر چڑھنے کے خیال کو ان کے دماغ سے نکالنے کی سعی بلیغ کرو - سولنس کے داخل ہونے سے قبل الین ڈاکٹر کو لے کر اندر چلی جاتی ہے - ہلدا کہتی ہے کہ میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھیر سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس قیام کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا - سولنس کہتا ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میں کس کے لیے زندہ رہوں گا - وہ کہتی ہے الین کے لیے - سولنس جواب دیتا ہے :

" بے شک ' ان آسیبوں نے ! میرے اهرمن نے اس کا خون چوس لیا (نا امیدی سے ہنستا ہے) ہاں ! ہاں ! انھوں نے یہ میری خوشی کے لیے کیا تھا ' (غمگین لہجہ میں) اب وہ میرے لیے مردہ ہے ' اور میں زندہ ہوکر ایک مردہ عورت سے باندھ دیا گیا ہوں - (مضطربانہ) میں - میں - جو زندگی میں لذت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ؟

سنا بات کاٹ کر هلدا پوچھتی ھے ' اس کے بعد کیا تعمیر کروگے - سولنس جواب دیتا ھے ' گمان غالب یہ ھے کہ میں اب زیادہ عمارتیں اور نہ بناؤں گا ' مجھے اس کی توقع نہیں کہ یہ مکانات جو میں نے والدین اور بچوں کے لیے بنائے ھیں وہ آئندہ نسلوں کے لیئے زیادہ مفید نہ ھوں گے - هلدا اس جواب سے مطمئن نہیں ھوتی ' وہ کہتی ھے سلطنت کے ساتھہ قلعہ کا ھونا ضروری ھے اس لیے اب تمہیں میرے قلعے کے عمارت کی بنا ڈالنا چاھئیے -- هلدا کے خیال کے موافق یہ قلعہ ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر بنانا چاھئیے تاکہ دور تک کی فضا آسانی سے نظر آسکے ' اس پر ایک بہت اونچا مینار ھونا چاھئے جس پر پہونچ کر یہ دونوں ھوائی قلعہ تعمیر کر سکیں ' هلدا کہتی ھے کہ ان سے زیادہ حسین شے دنیا میں اور کوئی نہیں ' ان کا بنانا اور ان میں پناہ لینا دونوں نہایت ھی آسان ھے — رینگفر داخل ھوتا ھے ' اس کے ھاتھہ میں ایک شاداب گجرا ھے جس میں ریشم کے پرزے آویزان ھیں ' اس کو دیکھہ کر هلدا اُچھلنے لگتی ھے - هلدا کو معلوم ھوتا ھے کہ سولنس کی تحریر بروِوک کے بیہوش ھو جانے کے بعد پہونچی ' اس لیے وہ موت سے قبل اطمینان اور مسرت کی سانس نہ لے سکا - هلدا کہتی ھے کہ پھر بھی تمہیں سولنس کا شکریہ ادا کرنا چاھئیے - رینگفر کہتا ھے کہ میں اس شخص کا کس دل سے شکریہ ادا کروں جس نے برسوں تک مجھے پامال کیا ' مجھے ابھرنے کی مہلت نہ دی ' میرے باپ کو مجھہ سے بدظن کیا - محض اس لیے کہ کےآ کو وہ اپنے دفتر میں رکھہ سکے ؛ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ اب کےآ کے دل و دماغ پر سولنس ھی کا اثر موجود ھے اور وہ اس دفتر سے جانا نہیں چاھتی - هلدا اس کا یہ جواب دیتی ھے کہ اس نے کےآ پر اس لیے تسلط حاصل کیا

کہ تمہیں یہاں سے چلے جانے کا خیال تک نہ آے ؛ جس کے معنی یہ ہیں کہ سولنس ریگنر کی قابلیت سے خائف تھا ؛ وہ اس قدر بزدل ہے کہ خود اپنے شاگرد سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ؛ وہ برووک اور ریگنر کی خوشیوں کو پامال کرنے کے لیے تیار ہے لیکن خود اپنے بنائے ہوئے مینارے پر چڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا - اس کے جواب میں ہلدا سولنس کا قدیم کار نامہ دہراتی ہے لیکن ریگنر مطمئن نہیں ہوتا - وہ کہتا ہے کہ یہ قصۂ ماضی ہے ؛ اب اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ مینارے کی بلندی پر جا سکے ؛ نئی نسل اس کے کارنامے پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں - ہلدا کہتی ہے کہ آج پھر وہ مینارے پر چڑھے گا اور دنیا پھر اس کی بلندی کا اندازہ کر لے گی - لیکن ریگنر کو اس کا یقین نہیں آتا - اسی دوران میں مسز سولنس داخل ہوتی ہے ؛ وہ یہ سن کر گھبرا جاتی ہے کہ وہ کچرا لے کر باہر گیا ہے ؛ وہ ریگنر کی منت کرتی ہے کہ اسے اس خیال سے باز رکھے اور اسے واپس بلا لائے ؛ وہ سولنس کو بلانے جاتا ہے ؛ ڈاکٹر ہرڈال داخل ہوتا ہے ؛ وہ مسز سولنس سے کہتا ہے کہ تم خود جاکر اسے بلا لاؤ ورنہ وہ واپس نہ آئے گا - اس اثنا میں چند خواتین آتی ہیں اور یہ رسم دیکھنا چاہتی ہیں - مسز سولنس کہتی ہے یہ میرا فرض ہے کہ میں ان خواتین کے پاس جاؤں ؛ چنانچہ وہ چلی جاتی ہے ؛ اس کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے ؛ اس کے بعد ہی سولنس آتا ہے ؛ ہلدا اس سے دریافت کرتی ہے کیا تم اس بلندی پر چڑھنے سے ڈرتے ہو ؛ وہ کہتا ہے کہ میں خائف ضرور ہوں - لیکن اس سے نہیں بلکہ مکافات عمل سے ڈرتا ہوں - یہ معمہ ہلدا کی سمجھ میں نہیں آتا ؛ سولنس اس کی وضاحت کرتا ہے - وہ کہتا ہے تم جانتی ہو کہ میں نے گرجے بنانے سے ابتدا کی

تھی ' میں ایک مذہبی خاندان کا لڑکا تھا ' میں نے گرجوں کی عمارتوں کو بڑے خضوع و خشوع سے بنایا ' مجھے خیال تھا کہ گرجوں کا مالک مجھہ سے خوش ہو گا ' لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھہ سے خوش نہیں ' اسی لیے میرا قدیم مکان جل کر خاک ہوگیا - شاید مدعا یہ تھا کہ میں علائق دنیوی سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن گرجوں کا معمار بن جاوں - میں تمہارے وطن کے گرجا کے مینارے پر چڑھا ؛ وہاں میں نے اس سے کہا کہ اپنی مملکت میں تو آزاد ہے ' میں بھی اپنے پیشے میں آج سے آزاد ہوتا ہوں : میں آج سے گرجے نہ بناؤں گا بلکہ انسانوں کے لیے مکانات تعمیر کروں گا - مگر اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ انسانوں کے لیے مکان بنانا سراسر نادانی اور حماقت ہے - انسانوں کو ایسے مکانات کی ذرا بھی ضرورت نہیں - خود میرے پاس اگر ایسا مکان ہوتا تو مجھے اس سے ذرا بھی فائدہ نہ ہوتا اس لیے میں نے جو کچھہ بنایا وہ سب بیکار ثابت ہوا - ہلدا کہتی ہے ؛ کیا اب کبھی کچھہ تعمیر نہ کروگے - اس کا وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں ہوائی قلعہ بناؤں گا - ہلدا کہتی ہے کہ ان قلعوں کے بلندی تک پہنچتے پہنچتے تمہارا سر چکرانے لگے گا - وہ کہتا ہے کہ اگر میں تمہارے ہاتھہ میں ہاتھہ ڈال کر چلا تو کوئی خطرہ نہیں - ہلدا چاہتی ہے کہ سولنس پھر مینارے پر چڑھے ' سولنس جھجکتا ہے ' مگر ہلدا شدت سے اصرار کرتی ہے ' سولنس کہتا ہے کہ اگر میں اس بلندی پر چڑھا تو میں خدا سے یہی کہوں گا کہ میں نے یہ جسارت اپنی شہزادی کی ہمت افزائی کی وجہ سے کی ' جس کے لیے میں ہوائی قلعہ تعمیر کروں گا ' جس سے میں محبت کروں گا اور جس کو میں اس بلندی سے اُتر کر خوب پیار کروں گا - یہ تقریر سن کر ہلدا وجد کرنے لگتی ہے - سولنس اپنے ہاتھہ میں گجرا لے کر چلا

جاتا ھے۔ نوجوان طبقے کا ایک کثیر گروہ موجود ھے' ان کے خیال میں سولنس اس مہم سے خائف ھے؛ یہ اُن لوگوں کا گروہ ھے جن کو سولنس اُبھر نے نہ دیتا تھا۔ مسز سولنس کا تردد دم بدم بڑھتا جاتا ھے' سولنس مینارہ پر چڑھنے لگتا ھے' ھوا میں موسیقی کی لہریں پیدا ھوتی ھیں جو ھلدا ھی سن سکتی ھے' لوگ بڑی دھشت کی حالت میں سولنس پر نگاھیں جمائے ھوئے ھیں' وہ چڑھتا چلا جاتا ھے' یہاں تک کہ مینارے کی چوٹی پر پہنچ جاتا ھے' لوگوں کی سراسیمگی اور ھلدا کی خوشی درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ھے' مگر سولنس زیادہ دیر تک چوٹی پر نہ ٹھیر سکا۔ وہ گرتا ھے اور اس کا سر چکنا چور ھو جاتا ھے —

ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ھے کہ یہ قصہ خود ابسن کی آپ بیتی ھے' بڑھاپے میں وہ اپنی زندگی پر ایک غائر نگاہ ڈالتا ھے اور اس کی واردات کو سولنس کی حیات کے واقعات سے جا ملاتا ھے۔ ناقدین کے خیال میں اس ڈرامے کا یہ پہلو بے حد دلچسپ ھے کیونکہ ابسن اپنے گھر کی حالت غیروں سے' اور اپنے دل و دماغ کی حالت اپنے احباب اور خاندان کے افراد سے ھمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا' اس کے خطوط کا انبار جو شائع ھو چکا ھے اس کے خیالات کی غمازی کرتے ھیں' لیکن اس کی گھریلو زندگی؛ اور اس کے جذبات کا تموج اس ڈرامے کے ذریعہ سے بے نقاب ھوسکتا ھے۔ اس لیے ابسن کے اس ادبی کار نامہ کو اس کی سوانح عمری کا لب لباب تصور کیا جاتا ھے —

اب ابسن کی لائف پر نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ وہ کہاں تک سولنس سے مشابہت رکھتا ھے' ناظرین کو یاد ھوگا کہ ابسن نے کیسی کیسی سختیاں جھیلی تھیں' اس کے والد کا سارا اثاثہ برباد ھو چکا تھا' اس لیے اس کی

نہ معقول تربیت ہوسکی' اور نہ وہ تعلیم حاصل کرسکا اور وہ گھر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہوا۔ ایک دوا خانے میں جاکر ملازم ہوتا ہے؛ اور زندگی کی مشکل ترین منازل طے کرنے لگتا ہے؛ ایک بار یونیورسٹی میں داخل ہونے کی کوشش کی؛ لیکن نا کام رہا؛ اور مجبور ہو کر اُسے پھر روزی کمانے کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اس کی بہن بہت مذہبی عورت تھی' اس کے خاندان کے اکثر افراد مذہب کے پکے پیرو تھے' صرف ابسن ہی آزاد خیال اور معقول پسند پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے خاندان والوں سے اس کے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے تھے۔ تعلیم اور تربیت کے بغیر وہ ڈراما نویسی شروع کرتا ہے' اور سنہ ۱۸۶۵ ع سے (جس سال "برینڈ" شائع ہوا) برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ نہ صرف امریکہ بلکہ یورپ کے اکثر ممالک پر چھا جاتا ہے۔ اس کی شادی ہوتی ہے۔ نا روے ڈنمارک کی اعانت سے گریز کرتا ہے' ڈنمارک پر دشمن کی افواج جوق در جوق اُمنڈتی چلی آتی ہے' ابسن کا غصہ بڑھتا چلا جاتا ہے' وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے اپنے وطن کے عیاری' خود غرضی اور بے راہ روی پر لعنت بھیجتا ہوا نا روے کو خیر باد کہہ کر یورپ کے دیگر ممالک میں جا بستا ہے۔ یہ حقیقتاً وہ آگ تھی جس نے سولنس کے آبائی مکان کو خاک سیاہ کردیا تھا' اس کے بعد وہ مدت تک در بدر پھرتا ہے' کبھی میونک میں قیام کرتا ہے' کبھی ڈریسڈن کو اپنا وطن بناتا ہے' کبھی روم کی خاک چھانتا ہے' مگر ابسن اور اس کی بیوی دونوں وطن کی فضا کو ترستے ہیں۔ جس طرح سولنس اور الین آبائی مکان سے نکل کر کبھی چین سے نہ رہ سکے وہ ڈراما لکھنا شروع کرتا ہے' پہلے اخلاقی' مذہبی اور اصلاحی تصانیف کا ڈھیر لگا دیتا ہے' "تیسری سلطنت" کی بنا ڈالتا ہے' یہ

دراصل سولنس کے گرجوں کے عمارتیں ھیں؛ " برینڈ " کے شایع ھوتے ھي وہ دولت مند بھی ھو جاتا ھے اور مشہور بھي ؛ اس کے بعد اس کی تصانیف اقصائے عالم میں پھیلنے لگتی ھیں' وہ اپنے فن کا اُستاد کامل (Master Builder) تسلیم کر لیا جاتا ھے' دور دور سے مداحیں اس کی خدمت میں آکر اُسے مبارک باد دیتے ھیں' مختلف زبانوں میں اس کی تصانیف کے تراجم ھوتے ھیں' بڑے بڑے شہروں کے علمی حلقوں میں اس کے خیالات پر تبصرے کیے جاتے ھیں —

اس کے بعد وہ انداز کلام تبدیل کرتا ھے' یعنی سوشل ڈرامے لکھنے لگتا ھے۔ گھریلو زندگی کو سنوارنا شروع کرتا ھے' نورا کو عالم وجود میں لاتا ھے' " بھوت پریت " سے ھمیں آگاہ کرتا ھے۔ یہ دراصل سولنس کے تیار کردہ وہ مکانات ھیں جو اُس نے عوام الناس کے لیے بنائے تھے' چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے مکانات' خوشنما' صاف' مستحکم۔ لیکن لوگوں نے ان مکانات کی قدر نہ کی اور مجبور ھوکر اُسے اپنے فن کو دوسری جانب متوجہ کرنا پڑا۔ اس دوران میں وہ وطن سے دور رھتا ھے' کُل یورپ کو اپنا وطن بنا لیتا ھے' آبائی مکان جل کر مٹی کا تودہ ھوگیا تھا اس لیے دوسرے مکانوں میں رھتا ھے۔ اُس کے خیال میں ناروے سے ایک ایسا شدید گناہ سرزد ھوا تھا کہ وہ اس کو سالہا سال معاف نہ کرسکا۔ وہ خود اور اس کی بیوی دونوں پردیس سے اُکتا چکے ھیں؛ لیکن ان جذبات کے اثرات اب تک اس کے دل پر ثبت ھیں جن سے متاثر ھو کر اس نے سنہ ۱۸۶۳ع میں " A Brother in Distress " نظم لکھی تھی' جب ناروے نے اپنے عہد و پیمان فراموش کرکے اپنے بھائي ڈنمارک کی اعانت سے پہلو تہی کی تھی۔ ھم اس نظم کا ترجمہ پہلی قسط میں درج کرچکے ھیں۔ وہ خود

کہتا ہے کہ میری اپیل میرے ہم وطنوں پر کارگر نہ ہوئی۔ اس لیے مجھے جلا وطن ہونا پڑا۔ مسز ابسن ایک نہایت زیرک اور فہیم خاتون تھی۔ ماں کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی تھی۔ بچوں کی تربیت، ان کی نگہداشت اور ان کی غور و پرداخت کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی، گویا ایلن کی طرح وہ خود بھی چابک دست معمار ہوسکتی تھی، لیکن ان کی زیادہ اولاد نہ ہوئی، اس لیے مسز ابسن کی یہ قابلیت رائگاں گئی —

"معمار کامل" (Master Builder) سنہ ۱۸۹۲ ع میں لکھا گیا، اس وقت ابسن پورے ۶۴ (چوسٹھ) سال کا تھا، زندگی کی خزاں تھی، قوائے ذہنی اور جسمانی مضمحل ہونے لگے تھے، جیسا کہ خود اس ڈرامے اور اس کے بعد کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے، دماغ کو خیالات پر گرفت نہ رہی تھی، جذبات اور خیالات دونوں نے دل و دماغ کو اپنا تابع کرلیا تھا۔ ورنہ سولنس ایسی بے تکی باتیں نہ کرتا اور نہ ہلدا یوں بے دھڑک اپنے باپ کو چھوڑ کر چھڑے دم اپنی سلطنت اور اپنا قلعہ سولنس سے طلب کرنے آتی۔ سولنس کی نیم دیوانگی، اور ہلدا کا ۲۳ برس کی عمر میں یہ عہد طفلی جو ہمارے پیش نظر ہے، یہ دونوں اُمور خود ابسن کی ضعیف العمری پر دال ہیں۔ ابسن سنہ ۱۸۶۵ سے تیس سال تک اپنے فن کا کامل اُستاد تسلیم کیا جاتا تھا، مگر جب وہ خود یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے بت پرانے ہوچلے ہیں، ان کا رنگ و روغن پھیکا پڑنے لگا ہے؛ نئے مصنفین، نئے نقاد، نئے ڈراما نویس، نئے فلسفی اُبھر رہے ہیں، پرانے خیالات اور قدیم اسلوب بیان پر اس نئی اُمت نے حملہ کرنا شروع کردیا ہے۔ ابسن آخر کب تک اپنے پرانے قلعہ کی خیر مناتا؛ اُس

نے فوراً تاڑ لیا کہ یورش سخت ہے ؛ نئی نسل کے علمبردار صف در صف بڑھتے چلے آتے ہیں ؛ اس لیے ان کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کرنا چاہئے ۔ مگر کمال کا غرور اس کی اجازت نہیں دیتا ' سولنس ریگنر کی قابلیت کا معترف ہے ' خود ڈاکٹر سے اس کا ذکر کرتا ہے ' لیکن اس کا دل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کی ہمت افزائی کرے ۔ چنانچہ نئی اُمت یلغار کرتی ہوئی اُمڈی آتی ہے ؛ اب یہاں صرف یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ اس ہلدا کے لباس میں کونسا محبوب پوشیدہ ہے ۔ ابسن کے ہاں مافوق العادت بہ الفاظ دیگر نیم دیوانی خواتین کی بڑی آو بھگت ہوتی تھی ؛ اس کی اغلباً تین وجہ تھیں ' اول تو خود ابسن حسن کی طلعت ریزیوں سے مسحور تھا ۔ دوم وہ ان کی مختلف خصوصیات کو ایک جگہ مجتمع کر کے ایک نیا کردار تیار کرتا تھا ' سوم وہ انسانی فطرت کے مطالعہ کا نہایت ہی شایق تھا ۔ عام زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ لڑکی جتنی سرپھری اور دیوانی زیادہ ہوتی اسی قدر ابسن اُسے زیادہ چاہتا تھا ۔ یہاں علم النفس کا ایک نکتہ مضمر ہے ؛ جس کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ؛ گو یہ تشبیہ غیر مکمل اور ایک حد تک دھوکا دینے والی ہے پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ اس کی مدد سے نکتہ کی وضاحت ہو جائے گی ' مشین کے دو تین پرزے علحدہ کرنے کے بعد ماہر فن اس کی نوعیت اور اس کے اصول عمل کو جلد اور آسانی سے سمجھ جاتا ہے ' چنانچہ ماہرین علم النفس دیوانوں ' سر پھروں اور پاگلوں کے مطالعہ سے جو جو علمی نکتے اخذ کر لیتے ہیں وہ اچھے ہوشمند اور دانا افراد سے اخذ نہیں کرسکتے ' اس لیے سر پھرا فرد جس قدر دلچسپ ہوتا ہے اُس قدر ہوشمند نہیں ہوتا ۔ بہرحال ظن غالب یہ ہے کہ یہ ہلدا ابسن کی دلی دوست Emilie Bardach ہے ' جس نے اس ڈرامے کے

شائع ہونے سے قبل ایملی ڈائری میں یہ لکھا تھا ' کہ ابسن مجھ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے —

یہ Gossen Sass کے قیام میں ابسن سے ملی تھی ' اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی ' اس کی شوخی اور طراری ' اور اس کا حسن و جمال دیکھ کر ابسن مہینوں دیوانہ بنا رہا ' اس کی شخصیت کا ہلکا سا عکس ہلدا میں بھی موجود ہے - ابسن کی عمر اس وقت باسٹھ سال کی تھی ' لیکن ابسن کی سنجیدگی ' بردباری ' متانت ' وضعداری ایملی نے ایک ہی وار میں برباد کر دی تھی ' شاید اس وقت ابسن کو نئی نسل کی توانائی اور اپنی کم مائگی کا احساس ہوا ہو ' اس کے علاوہ ایک نوجوان مصنف Knut Hamsun نے بھی ابسن پر نکتہ چینی کی تھی ' اس کا خیال تھا کہ لٹریچر انسان اور فطرت سے وابستہ ہونا چاہئے ' وہ لٹریچر مفید نہیں جس میں ہوائی قلعے تعمیر کیے جائیں - اس میں شک نہیں کہ خیالی قلعے جس طرح بے بنیاد ہوتے ہیں اسی طرح ابسن کے یہ ڈرامے ایک حد تک مہمل اور دور از قیاس ہیں - حیات انسانی کے کسی دور میں نہ ہلدا ملتی ہے نہ سولنس نظر آتا ہے ' اس لیے ان کے جو پہلو ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں وہ فہم و ادراک سے بالا تر ہیں ' اس ڈرامے کو محض ابسن کی آپ بیتی سمجھ کر اہمیت دی جا سکتی ہے —

اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سولنس کے کردار کی تشریح ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ تصنیف کی پوری خوبی کا پتہ چل جائے - سولنس کی زندگی مذہبی افراد کے لیے آئینۂ عبرت بن سکتی ہے وہ ایک گرجے کے مینارے پر چڑھ کر رب ذوالجلال کو چیلینج دیتا ہے ! اپنی آزادی کا اعلان کرتا ہے ! خود مختار بنتا ہے اور ایک دوسرے مینارے کی

بلندی سے کچھہ مدت بعد دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فطرت نے اس کو بغاوت کرنے کے لیے منتخب کیا ہو، اس کو سرسبز ہونے کی کافی مہلت دی، پھر اس کے منہ سے بغاوت کے کلمات بر آمد ہوے اور اس کا سر پاش پاش کر دیا گیا - یہ قرین قیاس اس لیے ہے کہ گو سولنس دوران سر کا مریض ہے لیکن پہلے موقعہ پر جب وہ مینارے پر چڑھتا ہے اس وقت اس کی حالت دگرگون نہیں ہوتی، بغاوت کرنے کے بعد جب وہ پھر یہ جسارت کرتا ہے اس وقت فطرت اپنا پورا انتقام لیتی ہے - پہلی کامیابی ایک دھوکے سے زیادہ نہ تھی، یہ ایک جال تھا جس میں نادان باغی گرفتار ہو کر فنا ہو جاتا ہے، بغاوت کے باوجود سولنس کو دولت اور وقار کثرت سے حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے فن کا استاد شمار کیا جاتا ہے، یہ فطرت کا عطیہ ہے؛ مگر فطرت اسے بیماری کا شکار بنا دیتی ہے، اور اِس بہانے سے اس کی دوسری کوشش میں اُسے پیوند خاک کر دیتی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ ابسن حقائق سے اکتا گیا ہے، معمولی قسم کے افراد سے جو ہمیں آے دن ملتے رہتے ہیں ابسن کا دل سیر ہو چکا ہے، اب وہ منطق، فطرت انسانی، نفسیات اور عمرانیات سے بلند اُڑنا چاہتا ہے وہ ایسی فضا کا خواہشمند ہے جہاں معمولی قوانین اور ضوابط عمل پیرا نہیں ہوتے؛ وہ تیز روشنی کے بہ نسبت دھندلی روشنی کو پسند کرتا ہے، جہاں نظام حیات کا تار و پود زیادہ اُستوار نہیں ہوتا؛ اس لیے اُس نے اس ڈرامے میں دو ایسے کیریکٹر پیدا کیے ہیں جو ایسے خیالات اور جذبات کے مالک ہیں جو اس دنیا میں نہیں پاے جاتے۔
سولنس یقیناً نیم دیوانہ ہے، اس کی دیوانگی ہی اس ڈرامے کی بنیاد ہے، مگر وہ Passive ہے؛ ہلڈا کا عمل اور اس کے جارحانہ حملے اس

روئداد کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں - جس روز ہلدا آنے والی ہے اس روز سولنس کے دماغ کی حالت بیحد دگرگوں تھی - الین اور خاندانی ڈاکٹر کا یہ پختہ خیال ہے کہ سولنس کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے' اس کی بھنک سولنس کے کان میں بھی پہنچ چکی ہے - اُسے اور کوئی نہیں ملتا تو وہ ڈاکٹر ہالورڈ ہی سے اپنے گذشتہ اعمال کا اقرار کرنے لگتا ہے' اس سے زیادہ اس کی دیوانگی کی روشن دلیل اور کون سی ہوگی - وہ ایک غور کرنے والا شخص ہے جس کا کمزور دماغ واقعات کو اوہام باطلہ کی بنیاد پر ایک دوسرے سے منسلک کرنے لگتا ہے - ایسے لوگ قصداً عمل سے گریز کرتے ہیں' اور اس سکوت کے بعد اُنہیں واقعات کی غیر فطری تاویلیں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا ان کے سکوت کی وجہ سے ہوتا ہے - بہر حال سولنس کی گردن پر گناہوں کا انبار تھا؛ بیوی کا دائمی مرض اور بچوں کی موت کا اس کے خیال میں وہی باعث ہوا؛ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ یہ مکان تباہ ہو جائے چنانچہ ایسا ہوا؛ گویا رب ذوالجلال نے اپنے باغی سے انتقام لیا ہے' اس کی دیوانگی کی یہ پہلی اور کافی نمایاں مثال ہے' اس کا خیال یہ تھا کہ خداوند کریم کا مدعا یہ ہے - " میں تمام عمر گرجے ہی بناتا رہوں اس لیے میرے دنیوی علائق منقطع کر دیے گئے " - مگر سولنس اس کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ خدا کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی کی طرح اس کی مرضی کے مطابق رقص کرتا رہے - چنانچہ وہ چیلینج دیتا ہے اور دس سال تک گرجا بنانے کا نام تک نہیں لیتا' اس دوران میں نہایت سرسبز ہوتا ہے مگر ایک خلش پیہم رفتہ رفتہ اسے دل برداشتہ کر دیتی ہے - اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ میری سرسبزی ہی کہیں میری تباہی کا موجب نہ ہو' اس کا ملال روز افزوں ہے -

وہ اپنے آپ کو بھوتوں کا آقا تصور کرتا ہے ' لیکن ایک چھوٹا سا ضعیف بھوت کےآ کی صورت میں آتا ہے اور اس پر قبضہ کر لیتا ہے ' وہ ھالدا کی آمد سے مسرور ہے لیکن خود ھلدا نئی نسل کی علم بردار ہے جس سے وہ اس قدر خائف ہے ' وہ سولنس پر ایک حاکم کی طرح چھا جاتی ہے اور اسے ریگنر کے نقشوں پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کردیتی ہے - یہاں یہ ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اپنے نئے مکان پر سولنس نے ایک مینارہ کیوں تعمیر کیا - بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ مینارہ اس کے چیلینج کا مادی پیکر ہے مگر بعض اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اس کی شکست کا اعتراف ہے ' وہ رب ذوالجلال کے غصے کی تاب نہ لا سکا ' وہ منفعل اور پشیمان ہے ' اس مکان کے بعد اگر وہ کوئی عمارت بناتا اور فطرت اسے ذرا اور مہلت دیتی تو وہ ہوائی قلعوں کی تعمیر میں مصروف ہوتا ۔ کیوں کہ وہ ان مذہبی عمارتوں اور انسانوں کے لیے مکانوں سے بے حد بد دل معلوم ہوتا ہے —

اس کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ھلدا کی شخصیت کا مطالعہ کریں ' اس ڈرامے کی روح و رواں ھلدا ہے ' وہ حقیقت ہے اور سولنس اس حقیقت کا عکس ' وہ سر گرم عمل ہے ' وہ ذی حیات ہے ' اس کے ہاتھ میں سولنس پتلی کی طرح رقص کرتا ہے جس طرح الین اپنے شوہر کے ابرو کے اشارے پر رقص کرتی ہے - کُل ڈرامہ ایک معمہ ہے ' مگر اس کو معمہ بنانے والی ھلدا ہے نہ کہ سولنس - سولنس کی شخصیت ' خیالات ' اور جذبات کا صحیح اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ؛ لیکن ھلدا کے پیدا کردہ نقوش آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے - وہ اپنے دل کی کھڑکیوں کو ہمیشہ بند رکھتی ہے ' جو وہ کہتی ہے ' وہ از سر تاپا

عقدۂ لاینحل ہوتا ہے۔ اس کے عمل اور گفتگو میں اس بلا کی آمد ہے کہ ان میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ' وہ بے دھڑک اپنے خیالات بیان کرتی جاتی ہے ' اور ان خیالات پر بے خوف ہوکر عمل پیرا ہوتی ہے ؛ اس کی بات چیت میں یقین کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ ہم جو کچھہ سنتے ہیں اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ وہ بے تکلف اپنے باپ کے گھر سے چل کھڑی ہوتی ہے ' اور سولنس سے اس طرح مطالبہ کرتی ہے ' جس طرح ایک مہاجن اپنے گاہک کے مکان پر دستک دے کر اصل اور سود دونوں تحکم کے ساتھہ طلب کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس برس تک اسی کا انتظار کرتی رہی ' اور مدت گذرنے پر مطالبے لیے ہوے اپنے گاہک کے ہاں آموجود ہوئی ' اس کے مطالبے یہ ہیں —

(۱) تم مجھے اپنی شاہزادی بناؤ

(۲) اپنی شاہزادی کے لیے ایک سلطنت دو

(۳) اپنی شاہزادی کے لیے ایک ہوائی قلعہ تعمیر کرو

یہ مطالبے سن کر سولنس پریشان ہو جاتا ہے ' اسے ہلدا سے دس برس پہلے ملنا تو یاد ہے ' لیکن اسے یہ مطلق یاد نہیں کہ اس نے ہلدا سے یہ تین وعدے کیے تھے ' سولنس لاکھہ کوشش کرتا ہے اپنے حافظے پر بار بار زور دیتا ہے ! سر کھجاتا ہے ' پیشانی پر بل ڈالتا ہے لیکن اسے ایک وعدہ بھی یاد نہیں آتا ' مگر ہلدا کے تیقین کا امنڈتا ہوا سیلاب سولنس کی شبہات کو بہالے جاتا ہے ' اور اسے طوعاً و کرہاً اعتراف کرنا ہوتا ہے ' سولنس ایک ذہین اور کامیاب انسان ہے ' مگر اس کی کیا وجہ کہ اسے اپنے وعدے یاد نہیں آتے ' ہم یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ سولنس اپنے وعدے بھول گیا ' نہ ہم یہ خیال کرسکتے ہیں کہ وہ ہلدا

کو دھوکا دے رہا ہے ' وہ ھلدا کے آنے سے خوش ہے ' پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کو دھوکا دینا جائز رکھے ' ممکن ہے کہ Lysanger کی کامیابی سے سرشار ' اور ھلدا کے معصومانہ حسن اور قاتلانہ انداز سے متاثر ہوکر سولنس نے یہ کہا ہو کہ جب تم بڑی ہوجاؤگی تو میں تمھارے لیے قلعے بناؤں گا ' ایک سلطنت کی بنا ڈالوں گا ' اور پھر تمھیں اپنی ملکہ بناؤں گا۔ اس قسم کی باتیں بچوں سے اکثر کی جاتی ہیں ' بچوں کو بادشاہوں ' شہزادیوں ' قلعوں ' سلطنتوں ' اور جنات وغیرہ کی کہانیوں میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے ' اس وقت ھلدا کی عمر بھی تیرہ برس کی تھی ' اس نے سولنس کو مینارے پر چڑھتے اور گجرا آویزاں کرتے دیکھا تھا ' اس کے خیال میں Lysanger کا مینارہ دنیا میں سب سے بلند اور سولنس دنیا کا سب سے بہتر معمار تھا ' وہ اسے اپنا ہیرو سمجھتی تھی ' دن رات اسی کا کلمہ پڑھتی تھی۔ مینارے کی مہم سر کرنے کے بعد وہ ھلدا کے مکان پر بطور مہمان کے جاتا ہے ' ھلدا کو وہ گود میں لیتا ہے ' اس سے ایسی باتیں کرتا ہے جیسی عام طور سے بچوں سے باتیں کی جاتی ہیں ' ھلدا کے خیالات اس وقت مشتعل تھے ' سولنس جو کچھ کہتا جاتا ہے وہ ھلدا کے صفحۂ دل پر ثبت ہوجاتا ہے ' چنانچہ جب ہم دس برس بعد ھلدا سے ملتے ہیں تو اس کے ناقوس دل سے وہی صدائیں آتی ہیں ' جن کو سن کر ایک طرف تو سولنس مبہوت ہوتا ہے ' اور دوسری طرف ناظرین انگشت بہ دنداں رہ جاتے ہیں —

اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن ہے ' سولنس کے کارنامے نے جس کا اس نے خود مشاہدہ کیا تھا اسے ھلدا کا ہیرو بنادیا تھا ' وہ اسے دنیا کا سب سے بہتر ' سب سے طاقتور ' اور سب سے چابکدست انسان تصور کرتی تھی ' ممکن ہے کہ

اس نے خود عالم خیال میں یہ آرزو کی ہو کہ میں اس کی شہزادی بنوں گی، اُس کی سلطنت پر میری حکمرانی ہوگی، اور اس کا قلعہ میرے حسن کی تابش سے جگمگائے گا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خیال پختہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اُس نے یقین کی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ دس سال بعد جو ہلدا نظر آتی ہے تو یقین کامل کا پیکر بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ بہر حال چاہے ہم پہلی صورت کو بہتر سمجھیں یا دوسری کو مگر اُس میں شک نہیں کہ ہلدا کے انداز میں غضب کا بچپن موجود ہے، وہ اب تیئیس سال کی عورت ہے لیکن اب بھی وہ اپنے ذہنی ارتقا کے لحاظ سے تیرہ سال کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ باتیں کرتی جاتی ہے اُسی قدر اس کی یہ خصوصیت اور نمایاں ہوتی جاتی ہے، اب تک اُس کے ذہن میں بچپن کے افسانے پیوست ہیں جن پر اس کا اب بھی اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کہ بچوں کا ہوتا ہے اور اب تک دیوؤں اور شہزادوں کی پرانی کہانیاں اُسے ازبر ہیں —

اس کے علاوہ جب سولنس بھوتوں کا قصہ چھیڑتا ہے ہم اس کی دلچسپی میں ایک نمایاں اضافہ دیکھتے ہیں۔ مزید برآں، ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ سولنس نے دس سال ہوئے اسے پیار کیا، اس کے بوسے لیے، اسے اپنی شہزادی بنانے کا وعدہ کیا، اس کے لیے ایک سلطنت اور ایک قلعہ تیار کرنے کا عہد کیا۔ پھر بھی کیا ایک تیئیس سالہ عورت سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک ایسا مطالبہ حاصل کرنے کے لیے یوں چل کھڑی ہوگی۔ ہلدا ذی ہوش ہے، وہ حسین ہے، ذہین ہے، بے حد معصوم ہے، لیکن ہر پہلو سے وہ اب تک بچہ ہے۔ اس کی عمر ضرور بڑھتی گئی، لیکن اس کے صنفی احساسات کا نشو و نما

ایک نقطہ پر پہنچ کر بند ہوگیا؛ وہ واقعہ جس نے تیرہ سال کی عمر میں ہلدا کے خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرائی تھی وہ اب تک اس کے جذبات کا بلند ترین مرکز بنا ہوا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ Lysanger کا تجربہ ہلدا کے لیے ایک نہایت ہی اہم اور حواس برہم کن تجربہ تھا جس کی وجہ سے اس کے جذبات کا نشو و نما ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا؛ اس کا ہوش' اس کی عقل اور اس کے حواس اُس کی قوت ارادی کے تابع ہیں' وہ اضافاً یہ جانتی ہے کہ Lysanger کے مینارے سے دنیا میں ہزاروں مینارے بلند تر ہوں گے؛ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ دنیا میں سینکڑوں معمار سولنس سے بڑھ کر ہوں گے' لیکن اس کے علم کے یہ اجزا اس کے دل کی دنیا سے دور ہیں' وہ اپنے خوابوں میں مگن ہے' وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مسرور ہے' وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کی یہ دنیا درہم برہم ہوجائے' وہ اس لیے آئی ہے کہ سولنس کا کوئی اور کارنامہ دیکھے؛ تاکہ اس کا اعتقاد مستحکم ہوجائے' اور وہ پھر بے غل و غش اپنے خیالات کی دنیا میں آسودۂ راحت ہو —

ایک اور وجہ ہے جو ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ ہلدا کی صنفی زندگی اب تک نا رسیدہ ہے۔ Lysanger کے تجربے کے وقت وہ تیرہ سال کی تھی' وہ اس وقت تک گو صنفی تحریکات سے باخبر ہو چلی تھی؛ لیکن ان تحریکات نے اس وقت تک پختگی حاصل نہ کی تھی' اس زمانے میں وہ بچپن سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جس زمانے میں ان صنفی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس حالت میں لڑکی بالعموم جوش و خروش کو پسند کرتی ہے جن کی تکلیف میں بھی ایک خاص قسم کی لذت پنہاں ہوتی ہے' اس عمر کی لڑکیاں اور لڑکے ایسے افسانے بڑی رغبت

سے پڑھتے ھیں جن میں سنسنی پیدا کرنے والے واقعات موجود ھوتے ھیں۔ یہی حالت ھلدا کی تھی۔ گو اس کی عمر بڑھتی جاتی ھے لیکن وہ بچہ ھی رھتی ھے، ایسا بچہ جس کے صنفی احساسات کی صرف اولین تحریک پیدا ھو چلی ھو، یہ عام قاعدہ ھے کہ جس زمانے میں یہ تحریکات پہلی مرتبہ پیدا ھوتی ھیں اس وقت لڑکی قتل و غارتگری، ظلم و تعدی، اور قطع و برید کے مظاھروں سے خاص لذت حاصل کرتی ھے، ھلدا میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ھے، وہ قدم قدم پر ایسے مظاھروں کی جویاں نظر آتی ھے؛ جب سولنس اپنے مکان میں آگ لگنے کا قصہ بیان کرتا ھے اس وقت ھلدا غیر مطمئن ھوکر بار بار یہ پوچھتی ھے "ھاں کہو کیا ھوا؟ کوئی جل کر مرا تو نہیں؟"

وہ جانتی ھے کہ سولنس دوران سر کا مریض ھے، مسز سولنس بار بار اس کی منتیں کرتی ھے کہ سولنس کو مینارے پر چڑھنے سے باز رکھا جاے، لیکن وہ ان تحریکات کی مطلق پروا نہیں کرتی، وہ ھر موقعہ پر سولنس کو مینارے پر چڑھنے کی پرزور ترغیب دیتی ھے، شاید وہ یہ بھی جانتی ھے کہ سولنس اس کی تاب نہ لا سکے گا، مگر وہ جوش و خروش کی عاشق ھے، اس لیے وہ سولنس کے جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔

یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا ھوتا ھے، جس کا جواب دینا ضروری ھے، وہ یہ ھے کہ آخر ھلدا کی تشریف آوری کس غرض سے ھوئی؟ اس کا مدعا کیا ھے؟ وہ کیا چاھتی ھے؟ اور وہ دس سال کی مدت کے بعد کیوں یکایک آ موجود ھوئی؟ بادی النظر میں اس کا جواب یہ ھے کہ وہ اپنی سلطنت کی آرزو مند ھے، وہ اپنی مملکت اور اپنے قلعے کی متلاشی ھے۔ مگر آخر یہ سلطنت کونسی سلطنت ھے؟ یہ قلعہ کونسا قلعہ ھے؟ اور وہ کس عنوان سے شہزادی بننا چاھتی ھے؟ اس کا جواب دینا اس لیے اور زیادہ مشکل ھو گیا ھے

کہ ھلڈا کی باتیں بالعموم بے جوڑ اور مبہم ھوتی ھیں ، وہ کوئی بات بر ملا نہیں کہتی ھے ' یہ ظاھر ھے کہ سلطنتیں بازار میں فروخت نہیں ھوتیں اور نہ ھر جگہہ قلعے تعمیر کئے جاسکتے ھیں ' علاوہ ازیں وہ ایسے قلعے کی آرزو مند ھے جو خود اس "کی سلطنت میں واقع ھو ' اس کی یہ دلی آرزو ھے کہ سولنس میدارے پر چڑھے ' اس کے وجود کا ریشہ ریشہ اسی آرزو کی لرزش سے متحرک ھے ۔ سولنس بلندی پر جا پہنچتا ھے ' ھلڈا کی روح وجد کرنے لگتی ھے ' اس کے بعد وہ گر کر پاش پاش ھو جاتا ھے ' مگر ھلڈا کی تیوری پر بل تک نہیں پڑتا ۔ اس کے وجد کی کیفیت نے شاید اس کے سارے احساسات فنا کر دیے تھے ۔ لوگ تو سولنس کی موت کا ماتم کرتے ھیں ' اور اس کے دشمن اس کی ناکامی پر خندہ زن ھوتے ھیں ' لیکن ھلڈا کے دل سے یہی صدا آتی ھے :

" وہ سیدھا میدارے کی چوٹی پر چڑہ گیا اور میرے کانوں میں سرود و بربط کی آوازیں آ رھی تھیں جو ھوا میں بج رھی تھیں " پھر وہ اپنی شال ھوا میں گھماتی ھے اور ایک وحشیانہ وجد میں چلا کر کہتی ھے " میرا ' میرا میر معمار " —

تو کیا ھلڈا محض یہ نظارہ دیکھنے آئی تھی ؟ کیا یہی اس کی سلطنت ھے ؟ کیا یہی اس کا قلعہ ھے ؟ مگر ھمیں یہ فراموش کردینا نہیں چاھئے کہ اس کا ارادہ سولنس کے ھاں قیام کرنے کا تھا ' وہ کہتی ھے کہ گو میرے پاس نہ کپڑے ھیں ' نہ ٹرنک ھے اور نہ روپیہ لیکن میں قیام کرنے کی غرض سے آئی ھوں ۔ اگر محض اس تماشے کا مشاھدہ مقصود ھوتا تو پھر قیام کرنے کی وجہ سمجھہ میں نہیں آتی ۔ ھلڈا سولنس کی عاشق ھے ' الین کے رویہ اور فرض شناسی سے وہ دل برداشتہ ھے ' اس لیے ھمیں

هلدا کے دلی مقصد کو کہیں اور تلاش کرنا چاهیے۔ کمرے میں داخل هونے کے چلد هی منٹ بعد وہ کہتی هے کہ اب کے آ کی ملازمت ختم هونے آئی لیکن جوں هی سولنس اسے بُک کیپر بننے کا اشارہ کرتا هے وہ نفرت کے ساتھہ اس تجویز کو ٹھکرا دیتی هے' اور کہتی هے :

"یہاں اور بہت سے کام کرنے کے قابل هیں"

سولنس خاموش هو جاتا هے' اس کے بعد گفتگو جاری رهتی هے' جس کے دوران میں وہ کہتا هے' اچھا هوا تم آ گئیں' میں تم سے باتیں کر کے اپنا بوجھہ کم کر سکوں گا' مگر اس کا بھی وہ یہی جواب دیتی هے :

"جب تم نے یہ کہا تھا کہ تمہیں میری ضرورت هے تو کیا اس سے تمہارا صرف یہی مقصد تھا" —

صاف معلوم هوتا هے کہ هلدا کی آرزو کی پرواز بلند تر هے' وہ چھوٹی موٹی باتوں سے مطمئن نہیں هوتی' وہ زمین پر رینگنے والے کیڑے کی زندگی کو نا پسند کرتی هے' وہ هوا کے کُرے سے بلند هو کر ایتھر کی فضا میں پرواز کرنا چاهتی هے' وہ اگر محض سولنس سے قربت چاهتی تو کے آ کی جگہہ کام کرنے کے لیے تیار هو جاتی' لیکن نہ وہ صرف قربت چاهتی هے اور نہ محض محبت سے سیر هو سکتی هے' وہ سولنس کی شخصیت کے هر پہلو کو اپنے قبضۂ قدرت میں لانا چاهتی هے' وہ اس کے لیے الہام کا سر چشمہ بننا چاهتی هے' وہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنے حسن کی طلعت ریزی پیوست کرنا چاهتی هے' وہ یہ چاهتی هے کہ وہ دیوی بنے اور سولنس اس کا پجاری هو۔ اور اسی کا کلمہ پڑھے۔ یہ اس کی سلطنت هے اور سولنس کا دل اس کا قلعہ۔ جس پر وہ جلد سے جلد تصرف حاصل کرنا چاهتی هے! دس سال تک اس نے سولنس

کی پوجا کی، اب اس کا غرور نسوانی اس کا متقاضی ہے کہ اس کی پوجا کی جاے - وہ دیوانی بن چکی، اب سولنس کو وہ اپنا دیوانہ بنانا چاہتی ہے - ہلدا کے جارحانہ حملے اس لحاظ سے سرا سر نسوانی ہیں، وہ حملہ کرتی ہے، غریب سولنس تھوڑے سے مقابلے کے بعد ہتیار ڈال دیتا ہے، غرور نسوانی کے لیے یہ امر باعث صد مسرت ہے —

مذکورۂ بالا ڈرامے کے بعد ہم ابسن کی آخری تصنیف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں - اس کی ہر تصنیف پر تنقید کرنا مشکل ہے - تصانیف کا سلسلہ طولانی ہے، اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ صرف ممتاز ڈراموں کو اس تذکرہ میں شامل کیا جاے - ہم نے ابسن کو دو حیثیتوں میں پیش کیا ہے، ایک فلسفی کی حیثیت سے اور ایک آرٹسٹ (حسن کار) کی حیثیت سے، آرٹ کی خوبی ڈراموں کی ساخت سے وابستہ ہے، اور اس کا فلسفہ اس کے خیالات کی جان ہے جو اس کی تصانیف میں کثرت سے موجود ہیں —

ابسن کا نیا ڈراما عموماً دو سال بعد شایع ہوتا تھا، صرف ایک صورت میں یہ قاعدہ ٹوٹا، (Ghosts) پر جو ہر طرف سے سخت لے دے ہوئی تھی اس سے متاثر ہو کر ابسن نے (An Enemy of the People) صرف ایک ہی سال میں تیار کیا تھا، ورنہ (Pillars of Society) سے لے کر (Borkman) تک اس قاعدے کی پابندی ہوئی - ابسن آخری ڈرامے پر بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس کے اعزہ اور اس کے احباب اس کی محنت شاقہ دیکھ کر اس کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوے متردد ہو چلے تھے، ابسن نے اس ڈرامے کا نام (Epilogue) رکھا - ہمیں یقین ہے کہ ابسن جانتا تھا کہ اب اس کے چل چلاؤ کا وقت ہے، اور یہ اُس کی آخری تصنیف ہے - اس لیے وہ جان توڑ کوشش کر کے اپنے دماغ کی ساری

قوتیں اس پر صرف کرتا ہے - اس کا حوصلہ اب تک بلند ہے ' وہ اس ڈرامے کے خاتمے پر کہتا ہے :

" اس کے بعد اگر مجھے پھر میدان میں آنے کا موقعہ ملا "

" تو میں نئے زرہ بکتر اور نئے ہتھیاروں کے ساتھہ میدان میں آؤں گا "۔

لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی —

یہ ڈراما در اصل ابسن کی جام شراب کا تلچھٹ ہے ؛ اس لیے باوجود اس کے کہ اس میں جا بجا آرٹ کی خامیاں ' اور واقعات کا عدم تسلسل موجود ہے پھر بھی اس میں مئے دو آتشہ کا مزہ پایا جاتا ہے ؛ ابسن کی روح کا یہ آخری پر تو اور اس کے فلسفے کی یہ آخری جھلک ہے - اس ڈرامے میں اس نے اپنی زندگی پر ایک نہایت دلچسپ ریویو کیا ہے ' جس میں ضمناً اس کے خیالات پر بھی بحث آجاتی ہے —

ڈرامے کا ہیرو پروفیسر روبک ہے ' وہ ایک سن رسیدہ سنگ تراش ہے ' اس حیثیت سے وہ دور دور مشہور ہو چکا ہے - ناموری کے ساتھہ ساتھہ اس نے غیر معمولی دولت بھی حاصل کی ہے ' اپنی بیوی Maia کے ساتھہ وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہے ' اس وقت دونوں میاں بیوی ہوٹل کے باغ میں فوارے کے قریب کرسیوں پر بیٹھے مے نوشی سے شغل کررہے ہیں - بیوی ایک خوبصورت سفری لباس پہنے ہوے ہے ' اور فضا کی خاموشی سے پریشان معلوم ہوتی ہے ' وہ کہتی ہے کہ یہاں کا شور و غل بھی مردہ اور بے حس ہے - پروفیسر بھی کچھہ زیادہ بشاش نہیں ہے —

Maia شوہر سے جلد چل دینے پر اصرار کرتی ہے ' حالانکہ بیوی ہی کے اصرار پر اس نے شمال کا سفر کیا تھا - بیوی اس کا اقرار کرتی ہے اور کہتی ہے ' مجھے کیا خبر تھی کہ اس قلیل مدت میں ہمارے وطن کی

ہر شے اس قدر تبدیل ہوجائے گی - پروفیسر اپنے گھر کی وسعت اور دل کشی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم اب زیادہ بہتر سوسائٹی میں نقل و حرکت کرسکتی تھیں ' پھر بھی تم متردد معلوم ہوتی ہو ' اس کا خیال ہے کہ Maia کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے گو وہ اس کا بھی اقرار کرتا ہے کہ وطن کے لوگ بھی تبدیل ہوگئے ہیں ' وہ اپنے وطن کے فضا کی سرد مہری اور اسٹیشنوں کی تاریکی اور بے حسی کی جانب اپنی بیوی کی توجہ مبذول کراتا ہوا کہتا ہے ' کل بندرگاہ میں جہاز آجائے گا ' اس میں سوار ہوکر ہم ساحل کے سفر کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور قطب شمالی کے سمندر تک جائیں گے - Maia کہتی ہے کہ تم اپنے وطن کے لوگوں کو نہ دیکھ سکوگے حالانکہ تم نے اسی خیال سے یہ سفر کیا تھا ' پروفیسر اس کا یہ جواب دیتا ہے : " میں انہیں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں " —

اس کے بعد پروفیسر کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک مدت کے آرام کے بغیر بادہ پیمائی کرتا رہتا ہے ' اُسے کہیں سکون نہیں ملتا ' نہ وطن میں ملتا ہے نہ پردیس میں ' وہ بنی نوع انسان سے متنفر ہوگیا ہے ' اسے اپنے کام میں بھی دلچسپی باقی نہ رہی ' وہ شب و روز سخت محنت کرنے کا عادی تھا ' یہ عادت بھی جاتی رہی ' مگر اس کے شاہکار کی تکمیل کے بعد اس میں یہ تغیر پیدا ہوا ' جس نے اُسے نہ صرف بین اقوامی شہرت دی بلکہ بے شمار دولت بھی عنایت کی - پروفیسر کہتا ہے بے شک وہ میرا شاہکار تھا ' Maia کہتی ہے ' بے شک دنیا یہ تسلیم کرتی ہے ; جس کے جواب میں روبک یہ معنی خیز الفاظ کہتا ہے : " دنیا کچھ نہیں جانتی اور نہ کچھ سمجھتی ہے " - اور استدلال کرتا ہے : " دنیا کے لیے جان کھپانے کا

یہ نتیجہ ہے "—

Maia گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہتی ہے : کیا تمھارے لیے یہ زیبا ہے کہ تم کبھی کبھار ایک نیم قد تصویر بنا کر خاموش ہو جایا کرو۔ پروفیسر جواب دیتا ہے کہ میں صرف اسی قسم کی تصویریں ہی نہیں بناتا بلکہ ان تصویروں کی تہ میں وہ اسرار ہیں جنھیں لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ صرف شباہت دیکھ کر خوش اور حیران ہو جاتے ہیں لیکن تہ کے اسرار تک ان کی رسائی نہیں —

چنانچہ ان دو رخی مجسموں سے امرا از حد مانوس ہیں ' اور ان کو خریدنے کے لیے بے شمار زر و جواہر خرچ کرتے ہیں۔ بیوی اپنے شوہر کو شراب پیش کرتے ہوئے شادان و فرحاں ہونے کی ترغیب دیتی ہے ' اور اس کے بعد پروفیسر کو اس کا ایک قدیم وعدہ یاد دلاتی ہے۔ "تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ایک بلند پہاڑ پر لے جاؤگے اور مجھے دنیا کی عظمت و شان کا نظارہ کراؤگے اور وہ عظمت و شان پھر میری ہو جائے گی " —

پروفیسر کہتا ہے کہ یہ تو ایک قسم کی تشبیہ تھی۔ اس کے علاوہ تم در اصل پہاڑوں پر چڑھنے کے قابل نہیں ہو —

اس کے بعد باتھ کا انسپکٹر آ موجود ہوتا ہے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد وہ پروفیسر اور Maia کے مزاج کی کیفیت دریافت کرتا ہے ' پروفیسر اس سے کہتا ہے کہ رات کی تاریکی میں کوئی شخص پارک میں چہل قدمی کرنے کا عادی ہے۔ یہ سن کر انسپکٹر حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں ایک لاغر اندام خاتون سفید ریشمی لباس میں ایک خیراتی راہبہ کے ساتھ آتی ہے پروفیسر کا خیال ہے کہ اس نے اسی خاتون کو شب کی تاریکی میں دیکھا تھا ' وہ کسی اور ملک کی باشندہ ہے ' لیکن وہ نارو۔

کی زبان بے تکلفی سے بولتی ہے ' اس کا لہجہ شہانی ہے ' اس کے بعد ہی انسپکٹر چلے جانے کی اجازت طلب کرتا ہے' اور جانا ہی چاہتا تھا کہ الفہیم نامی شکاری کی آواز کی گرج اس کے کان میں پہنچتی ہے ' انسپکٹر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے - الفہیم شکاری لباس میں ہے اور اس کا ملازم دو شکاری کتے لیے ہوے ہے- اس کا قد بلند ہے ' اس کی آواز میں گرج ہے ' انسپکٹر کو ڈانٹنے کے بعد وہ نیم وحشیانہ لہجے میں اپنے نوکر کو کتوں کی خوراک کے متعلق ہدایات کرتے ہوے چلے جانے کا حکم دیتا ہے - نوکر چلا جاتا ہے - اس کے بعد وہ اپنے کھانے کے متعلق انسپکٹر کو ہدایت کرتا ہے - انسپکٹر چلا جاتا ہے ، پروفیسر روبک اور الفہیم ایک دوسرے سے واقف تھے مگر بہت مدت کے بعد ملے ہیں ' دونوں میں باتیں شروع ہو جاتی ہیں ' Maia اس سے باتیں کرنے لگتی ہے اور پوچھتی ہے کہ تم ریچھ کے شکار کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو -

الفہیم اس کا نہایت معقول جواب دیتا ہے ' کہ میں اور تمہارا شوہر دونوں سخت مادوں سے جد و جہد کرتے ہیں - وہ سنگ مرمر کے کندوں سے اور میں ریچھوں کی قوت سے ' ہم دونوں اپنے حریفوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور جب تک غالب نہیں آ جاتے اپنی جد و جہد ترک نہیں کرتے -

الفہیم کہتا ہے کہ میں اب بلند پہاڑوں کے جنگلوں میں پھر شکار کے لیے جارہا ہوں ' وہ پروفیسر اور اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہے' شکاری کی نظر خیراتی راہبہ پر پڑتی ہے' وہ علیل اور ناتواں لوگوں کا مذاق اڑانے لگتا ہے ' وہ اپنے دوستوں (کتوں) کو ان کے علیل ہوتے ہی گولی سے مار دیتا ہے ' راہبہ ایک قاب میں روٹی اور دودھ لاتی ہے اور سامنے والی میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے ' شکاری اس غذا کا مذاق اڑاتے ہوے اپنے کتوں کی خوراک کا ذکر کرتا ہے ' اور Maia کو ان کے کھانے

کا نظارہ دکھانے اپنے ساتھ لے جاتا ہے - ایک خاتون باہر آتی ہے' اور دودھ پینا چاہتی ہے کہ اس کی نظر روبک پر پڑتی ہے' روبک اس کی جانب بڑھتا ہے - دونوں ایک دوسرے کو پہچان جاتے ہیں - خاتون اس بات سے متعجب ہے کہ روبک اب تک زندہ ہے' وہ اس کی بیوی کے متعلق سوال کرتے ہوے کہتی ہے کہ ہمارا بچہ نہایت خوش حال ہے' بہت ناموری حاصل کر چکا ہے' اس کی ہر دلعزیزی نے اس کے باپ کو بھی مشہور کر دیا ہے - روبک کہتا ہے کہ میں تمہارا بہت ممنون احسان ہوں - Irene (اس خاتون کا نام) کہتی ہے' کاش میں تم سے جدا ہوتے وقت اس بچہ کو مار ڈالتی' اسے خاک میں ملا دیتی ! روبک اس کے قریب جاتا ہے اور نرم آواز میں دریافت کرتا ہے کہ اس قدر مدت کے بعد اب تو بتاؤ کہ تم مجھ سے کیوں جدا ہوگئیں' تم کیوں یکایک غائب ہوگئیں کیا کوئی اور شخص تھا جو تمہارے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا - Irene کہتی ہے' ایک ہی شخص دنیا میں ایسا تھا جسے نہ میری زندگی عزیز تھی نہ میری محبت -

روبک : مگر تم کہاں رہیں؟ میں نے بہت تلاش کی' تمہارا کہیں پتا نہ لگا -

ارین : میں تاریکی میں روپوش ہوگئی تھی —

روبک : کیا تم نے دنیا میں بہت سفر کیا ؟

ارین : ہاں' میں بہت سے ملکوں میں پھری -

روبک : تم نے کیا کیا -

ارین : ایک منٹ ٹھیرو' دیکھو' اب میں بیان کرتی ہوں' میں نے تماشوں میں حصہ لیا' میں زندہ تصویروں میں' برہنہ مجسمے کے لیے بیٹھی - بے شمار دولت حاصل کی' تمہارے ساتھ رہ کر میں اتنا نہ کرسکتی تھی' اس کے بعد میں نے ہر قسم کے انسانوں کو فریفتہ اور

مفتوں کیا ' تمہارے ساتھہ رہ کر یہ کہاں ہو سکتا تھا —

روبک : کیا اس کے بعد تم نے شادی کر لی ؟

ارین : ہاں ' میں نے اُن میں سے ایک کے ساتھہ شادی کرلی

روبک : تمہارا شوہر کون ہے ؟

ارین : وہ جنوبی امریکہ کا باشندہ تھا - ایک ممتاز مدبر ' میں نے اسے بھی دیوانہ بنایا ' بالکل دیوانہ - وہ بڑا پر لطف کام تھا - میں دل ہی دل میں خوب ہنستی رہتی تھی - کاش میرے پاس دل ہوتا —

روبک : اب وہ کہاں ہے ؟

ارین : کسی نہ کسی قبرستان میں ' اس پر ایک اچھی یادگار نصب کی ہے ' اب بھی اس کی کھوپری میں ایک گولی ٹکرا رہی ہوگی —

روبک : کیا اس نے خود کشی کی ؟

ارین : ہاں وہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے میرے ہاتھوں کو تکلیف نہ دی -

روبک : کیا تم اس کی موت کا ماتم کرتی ہو -

ارین : ماتم ؟ ' موت ؟

روبک : کیوں ' مسٹر فان سیٹو کی موت !

ارین : اس کا نام سیٹو (Satow) نہیں تھا -

روبک : کیا یہ نام نہ تھا ؟

ارین : میرے دوسرے شوہر کا نام سیٹو ہے ' وہ روسی ہے

روبک : اور وہ کہاں ہے ؟

ارین : دور ' بہت دور - یورال پہاڑوں میں ' اپنی سونے کی کانوں میں -

روبک : تو وہ وہاں مقیم ہے -

ارین : مقیم ؟ مقیم ؟ میں نے اسے کبھی کا مار ہی ڈالا۔

روبک : مار ڈالا ؟

ارین : میں نے ایک نفیس آبدار خنجر سے اس کا کام تمام کر ڈالا - یہ خنجر میں ہمیشہ اپنے بستر میں رکھتی ہوں

روبک : مجھے تمہاری باتوں کا یقین نہیں۔

ارین : تمہیں یقین کرنا چاہیے۔

روبک : کیا تمہارے کبھی کوئی بچہ نہیں ہوا ؟

ارین : میرے بہت سے بچے ہوے۔

روبک : اب تمہارے بچے کہاں ہیں ؟

ارین : میں نے انھیں بھی مار ڈالا۔

روبک : تم جو کچھ کہتی ہو اس میں کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے —

ارین : میں اس کا کیا علاج کروں ' میں جو کچھ کہتی ہوں وہ میں نہیں کہتی ، مجھ سے کہلوایا جاتا ہے —

روبک : مجھے یقین ہے کہ میں ہی تنہا ایسا شخص ہوں جو تمہارے معنی سمجھ سکتا ہوں —

ارین : بیشک تم ہی ایک ایسے ہو —

روبک : تمہاری فطرت کے بعض سلسلے شکستہ معلوم ہوتے ہیں —

پروفیسر اُسے یقین دلاتا ہے کہ وہ مردہ نہیں ہے بلکہ زندہ ہے ' وہ بھی محسوس کرتی ہے کہ موت کے خواب سے بیدار ہورہی ہے ' وہ اپنی موت کا روبک کو ملزم قرار دیتی ہے ' دونوں گذشتہ واقعات کے متعلق باتیں کرنا شروع کردیتے ہیں ؛ ارین روبک کے ساتھ دنیا کے کنارے تک جانے کے لیے تیار ہے ' وہ روبک کے آرٹ کا نمونہ (Model) بڑی خوشی سے بنی ؛ اُس

نے اپنی روح شباب کی پوری قوت کے ساتھہ روبک کی خدمت کی، ہفتوں اربن کا بے نقاب شباب روبک کے پیش نظر رہا، لیکن اُس نے اس کے جسم کو کبھی ہاتھہ نہ لگایا، کیوں کہ وہ آرٹسٹ تھا، وہ اپنی زندگی کے کارنامے کی تکمیل کے لیے بیتاب تھا، اس شاہکار کا نام روز حشر رکھا گیا، جس میں ایک نوجوان عورت موت کے خواب سے بیدار ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان دونوں کا اکلوتا بچہ تھا —

روبک اربن کو ایک متبرک شے تصور کرتا تھا، گو وہ خود بھی اس زمانے میں جوان تھا، لیکن اس کا یہ یقین تھا کہ اگر اُس نے اربن کو مس کیا یا خواہشات کی بو اس کے وجود شعری سے مس ہوئی تو خود روبک کی روح گندی ہو جاے گی، اور وہ اپنے کام کو انجام نہ دے سکے گا جس کی تکمیل سب سے مقدم ہے —

اس مجسمے کی تکمیل کے بعد روبک نے کوئی اور شاہکار نہ بنایا؛ اربن اس کی بیوی کا حال دریافت کرتی ہے؛ وہ خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے —

اربن اُسے پہاڑوں کی بلندی پر لے جانے اور اپنے ساتھہ رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اسی دوران میں Maia داخل ہوتی ہے، اور اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ میں تمہارے ساتھہ ساحلی سفر پر نہیں جاسکتی، میں پہاڑوں اور جنگلوں میں جانے کی آرزومند ہوں۔ شکاری کی باتوں نے Maia پر جادو کا کام کیا؛ اس کے قصے کسی قدر بھدے، نفرت انگیز اور جھوٹ تھے، لیکن ان کی دلکشی میں کسی کو کلام نہ تھا، روبک خود پہاڑوں پر جانے کا ارادہ کرچکا تھا، اس کی بیوی یہ سن کر خوش ہوجاتی ہے؛ Maia یہ خوش خبری شکاری کے پاس لے جاتی ہے، روبک اور اربن بھی پہاڑوں پر جانے کا تہیہ

کرتے ہیں، اردن کہتی ہے کہ جب سے میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اپنی جوان اور زندہ روح تمھاری نذر کرکے خود بے روح ہوگئی تب سے میں تمھاری متلاشی تھی، راہبہ دروازہ کھولتی ہے اور پہلا ایکٹ ختم ہوجاتا ہے —

دوسرے ایکٹ میں ابسن کے فلسفے کی جھلک بہت نمایاں ہے، اور چونکہ یہ اس کی آخری تصنیف ہے اس لیے ہمیں اس کے خیالات کی پوری تشریح کرنا ضروری ہے؛ روبک اور اس کی بیوی ایک پہاڑی مقام میں مقیم ہیں، دور تک پہاڑی علاقہ چلا گیا ہے؛ جھیل کے پیچھے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں، بائیں جانب پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ ہے۔ میاں بیوی میں باتیں ہورہی ہیں، روبک کرسی پر بیٹھا ہے؛ Maia قریب گھاس پر لیٹی ہے؛ وہ شکاری کے ساتھہ دوسرے دن بھیڑیوں کے شکار کو جانے والی ہے، بچوں کی چیخ پکار کی آوازیں آرہی ہیں جن کو سن کر Maia پریشان ہو جاتی ہے؛ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے روبک یہ کہتا ہے کہ اس میں بھی کبھی کبھی موسیقی کا لطف پیدا ہوجاتا ہے؛ روبک ہمہ تن آرٹسٹ ہے لیکن بقول اس کی بیوی کے وہ بھی اب بھدا ہوچلا ہے، اس کی آنکھوں میں ماندگی اور تھکن کی جھلک نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے خلاف کوئی سازش کررہا ہے۔ روبک کہتا ہے، اچھا بتاؤ میرا اس پہاڑی علاقے میں آنے کا مدعا کیا ہے، Maia زرد رو لیڈی (اریِن) کی طرف اشارہ کرتی ہے، روبک کہتا ہے کہ عرصہ ہوا میں نے اُسے فراموش کر دیا تھا؛ دونوں خانگی شکر رنجی کا ذکر کرتے ہیں، Maia کہتی ہے —

"تم سوسائٹی پسند انسان نہیں ہو، تم اپنے ہی تک محدود رہنا چاہتے ہو، تم اپنے ہی خیالات پر غور و فکر کرنا چاہتے ہو،

بیشک میں تمھارے معاملات کے متعلق تم سے اچھی طرح گفتگو نہیں کرسکتی ' میں آرٹ سے بالکل واقف نہیں ہوں ' نہ اس قسم کی اور باتوں سے اور نہ میں ان کی کچھہ پروا کرتی ہوں ''۔

روبک کہتا ہے کہ " اسی وجہ سے ہم لوگ آتش دان کے پاس بیٹھہ کر فضول باتوں میں وقت صرف کرتے ہیں - میری بے چینی کا یہی سبب ہے۔ میں اب اس فضول زندگی کا متحمل نہیں ہوسکتا " ـــ

Maia اس قسم کی باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے ' وہ کہتی ہے کہ اگر تمھارا مدعا یہ ہے کہ میں چلی جاؤں تو میں اس کے لیے بھی بالکل آمادہ ہوں ' مگر روبک کہتا ہے کہ گو ہم دونوں ساتھہ نہیں رہ سکتے پھر بھی اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہم جدا ہو جائیں ' وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا حقیقی ساتھی ہو ؛ جو اس کی کم زوریوں کو دور کرسکے ' اور جو اس کی کوششوں میں اس کا ہاتھہ بٹائے ـــ

روبک یہ خوب جانتا ہے کہ (Maia) یہ خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ (Maia) کے خیال میں روبک " زرہ رو خاتون " کے فکر میں غلطاں ہے ' وہ پھر اپنی داستان یوں سنانا شروع کرتا ہے ' " روز حشر " کے شایع ہوتے ہی مجھے وافر دولت اور شہرت حاصل ہوگئی- آخر کار میں تعریف و توصیف سے اس قدر گھبرا گیا کہ میں نے جنگل میں فرار ہو جانے کا ارادہ کر لیا تھا ؛ اس کے بعد میں نے نیم مجسمے بنانا شروع کئے ' مگر یہ بات ہمیشہ میرے دماغ میں موجود رہی کہ آرٹسٹ کے مشن کے متعلق جو جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ کھوکھلی ' بے معنی اور لغو ہیں- آرٹ سے بدرجہا زیادہ اہم شے حیات انسانی ہے - روبک پھر اپنی زندگی کی کیفیت کے متعلق بحث شروع کرتے

ہوے کہتا ہے کہ میں سست قدم، خاموش زندگی سے حظ حاصل نہیں کرسکتا۔ آرٹسٹ چند ہی سال میں ساری عمر کا لطف صرف کردیتا ہے۔ روبک کی شخصیت چونکہ ایک ہیجان میں سے گذر کر نئی بیداری پیدا کر رہی تھی اس لیے وہ کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہتے رہتے بالکل بیزار ہو گیا ہوں۔ مگر اس میں تمہارا قصور نہیں —

(Maia) جدا ہونے کے لیے رضا مند ہے لیکن روبک ایک راز افشا کرتا ہے، وہ اپنے سینے کی جانب اشارہ کر کے کہتا ہے کہ اس میں ایک مقفل ڈبا موجود ہے جس میں میرے آرٹ کے سارے تصورات محفوظ ہیں، اس زرد رو خاتون کے پاس اس کی کنجی ہے، ڈبے کے اندر جو سامان ہے وہ میں اب تک بروئے کار نہ لاسکا، سال گذرتے چلے جاتے ہیں، اس خزانے کو کھولنے کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ (Maia) کہتی ہے کہ خاتون یہاں موجود ہے اس سے کنجی لے کر ڈبا کھول لو۔ وہ اس خاتون کو اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار ہے، شکر رنجی کی صورت میں وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے لیے بھی آمادہ ہے۔ اس اثنا میں ارین دور سے نظر آتی ہے، اس کو دیکھتے ہی بچے آکر گھیر لیتے ہیں وہ ان کو ہوٹل میں بھیج دیتی ہے، اور خود چشمے کے کنارے کھڑی ہوجاتی ہے، Maia چل کھڑی ہوتی ہے اور ارین سے کہہ جاتی ہے کہ روبک اس کا منتظر ہے، روبک بھی آجاتا ہے، وہ چشمہ کے ایک کنارے پر ہے، ارین دوسرے کنارے پر۔ ارین کہتی ہے کہ وہ ایک طویل خواب میں محو تھی جس کا اثر اب تک اس کی آنکھوں میں موجود ہے، روبک کا خیال ہے کہ دن کی روشنی نمودار ہو گی اور ان کی تاریکی دور کردے گی۔ اس کے بعد روبک اور ارین میں ایک طویل مکالمہ شروع ہوتا ہے، جس

کے شروع میں وہ روبک پر تحقیر اور غصے کی نگاہیں ڈالتی ہوئی کہتی ہے کہ میں آرٹسٹ سے سخت نفرت کرتی ہوں ——

بات چیت جاری رہتی ہے، اس مجسمے کو ارین بار بار اپنا بچہ کہتی ہے۔ روبک کہتا ہے کہ میں نے اس میں ذرا سی تبدیلی کردی ہے، اس مجسمے کے ارد گرد مجھے دنیا کا وہ حصہ شامل کرنا پڑا جو مجھے نظر آتا تھا۔ جس کی وجہ سے مجسمہ کی چوکی وسیع کرنی پڑی۔ اس پر زمین کا ایک قطعہ نصب کیا گیا جس پر مردوں اور عورتوں کی دھندلی صورتیں نظر آتی ہیں۔ مجسمے کی آنکھوں کی مسرت کو بھی ذرا ہلکا کردیا گیا، خود مجسمے کو ذرا پیچھے ہٹا دیا گیا تاکہ پس منظر کا کام دے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے اس گروہ میں میں خود موجود ہوں، ایک ایسے مجرم انسان کی صورت میں جو اپنے آپ کو دنیا سے آزاد نہیں کرسکتا یہ شخص بیٹھا ہوا بہتے ہوے چشمے میں اپنی انگلیاں ڈبوتا ہے تاکہ ان کو آلائش سے پاک کر لے، لیکن یہ یقین اس کا دل پارہ پارہ کرتا رہتا ہے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا، ابد تک وہ آزادی حاصل نہ کرسکے گا، ہمیشہ وہ اپنی دوزخ میں مقید رہے گا۔ یہ سن کر ارین کہتی ہے کہ تمہارا رویہ شاعرانہ ہے، کیونکہ تم کاہل اور کمزور طبع ہو، خیال اور عمل میں تم سے جو گناہ سر زد ہوتے ہیں انہیں معاف کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہو، تم نے میری روح کو ذبح کیا، اس لیے تم نے اپنی پشیمانی، خود الزام دہی اور ریاضت کا مجسمہ بنایا، اور (ہنستے ہوے) اب یہ خیال کرتے ہو کہ تمہارا حساب بے باق ہو گیا، اس کا جواب روبک یہ دیتا ہے:

"ارین، میں ایک آرٹسٹ ہوں، وہ کمزوریاں جو مجھ میں موجود ہیں اُن سے میں ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ

میں پیدائشی آرٹسٹ ہوں ' میں کچھہ ہی کروں اس کے خلاف نہیں ہو سکتا "۔

ارین : آرنلڈ ! تم شاعر ہو ' تم ایک پیارے ' بڑے متوسط عمر کے بچے ہو۔ کیا تم اسے سمجھتے ؟

روبک : تم مجھے بار بار شاعر کیوں کہتی ہو ؟

ارین : میرے دوست ! اس لفظ میں کچھہ معذرت آمیز بہانہ مخفی ہے ' کوئی ایسی شے ہے جو گناہوں کی معافی کی جانب اشارہ کرتی ہے ' اور کمزوریوں پر پردہ ڈالتی ہے ۔ (یکایک لہجہ بدلتے ہوے) مگر میں تو اس زمانے میں ذی حیات انسان تھی ' مجھے بھی ایک زندگی بسر کرنی اور ایک انسانی قسمت کی تکمیل کرنی تھی ' دیکھو ' میں نے یہ سب کچھہ تج دیا کہ تمھاری غلام بن سکوں (دھیمی آواز میں) اس گناہ کا کفارہ میں کبھی ادا نہ کرسکوں گی ۔

... ...

ارین : (ظاہری ضبط کے ساتھہ) مجھے دنیا میں بچے پیدا کرنے چاہئے تھے ' بہت سے بچے ' اصلی بچے ' ایسے بچے نہیں جو قبروں کی چھتوں میں پوشیدہ رکھے جاتے ہیں ' مجھے تمھاری (شاعر کی) کبھی اطاعت گذاری نہیں کرنی چاہیئے تھی ۔

اس کے بعد ارین گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں توڑ کر چشمے میں ڈال دیتی ہے ؛ اور انھیں سمندری پرندوں سے تشبیہ دیتی ہے ' روبک کو پرانے واقعات یاد آجاتے ہیں جب وہ مجسمہ تیار کر رہا تھا اور تعطیل کے دن یہ دونوں چشمے کی روانی کا لطف اٹھاتے تھے۔ اس زمانے میں ارین کنول کے پھول کی پنکھڑیاں چشمے میں ڈالتی تھی ' اور ان کو ہنس سے تشبیہ دے کر مزے لیتی تھی۔ گفتگو جاری رہتی ہے ' ارین وہ زمانہ یاد کرتی

ہے جب وہ ٹانٹز کی جھیل کے کنارہ پر رہتے تھے —

اِرین: ٹانٹز کی جھیل پر زندگی حسین، بہت حسین تھی —

روبک: مگر اِرین پھر بھی —

اِرین: پھر بھی ہم دونوں نے زندگی اور اس کے حسن کو ہاتھ سے کھو دیا —

روبک اُسے اپنے گھر میں آ کر قیام کرنے کی دعوت دیتے ہوے التجا کرتا ہے کہ میرے دل کے خزانے کا قفل کھول دو کہ میں پھر اپنی زندگی سے وہی لطف حاصل کرسکوں مگر اِرین یہی کہتی ہے کہ یہ خالی خولی خواب ہے کیونکہ جو زندگی ہم تم بسر کر چکے ہیں وہ اب پھر نہیں آ سکتی۔

اس کے بعد الفہیم اور Maia شکاری لباس میں نظر آتے ہیں، ان کے پیچھے نوکر کتے لیے ہوے ہے، یہ لوگ شکار کو جا رہے ہیں، Maia اپنے شوہر کو سلام کرتی ہے، وہ اپنی آزادی کا اعلان کرتی ہوئی شکاری کے ہمراہ چلی جاتی ہے۔ اِرین پہاڑی کے نیچے جانے کا قصد کرتی ہے؛ روبک کے کانوں میں Maia کے گیت کی آواز آتی رہتی ہے، الفہیم اور Maia پہاڑوں کے جنگلوں میں گشت لگاتے ہیں، اسی اثنا میں پہاڑوں کی بلندی پر طوفان کے کالے کالے بادل نمودار ہونے لگتے ہیں، منظر بہت بھیانک اور خطرناک ہوتا جاتا ہے، شکاری روبک کی بیوی Maia کو اپنی پناہ میں لے کر چلتا ہوتا ہے، روبک اور اِرین تنہا رہ جاتے ہیں، اِرین پر خوف طاری ہوتا ہے —

روبک اس کی ہمت بڑھاتا ہوا اس کی پاسبانی کا وعدہ کرتا ہے، اِرین کہتی ہے کہ خود میرے پاس ایک خنجر موجود ہے جس کو میں کبھی جدا نہیں کرتی، بلکہ جب گذشتہ باب میں روبک نے اِرین کے

افسانۂ محبت کو محض ایک قصہ تصور کیا تھا۔ اس وقت خود مہ پارہ اَرین اس کا سرتن سے جدا کرنے والی تھی، لیکن پھر رک گئی' اس کے بعد ان دونوں میں آخری مکالمہ شروع ہوتا ہے جس کا ترجمہ ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:—

روبک: تم نے پھر اپنا ہاتھ کیوں روک لیا' (قتل کرنے سے)-

اَرین: مجھے معاً یہ خیال آگیا کہ تم تو پہلے ہی عرصہ ہوا مرچکے ہو-

روبک: مرچکا ہوں؟

اَرین: مردہ' بالکل ایسے ہی مردہ جیسی میں ہوں' ٹانٹز کی جھیل پر
ہم دونوں سرد مٹی کے پتلاوں کی طرح بیٹھتے تھے' اور ایک دوسرے
سے کھیلتے تھے-

روبک: میں اسے موت نہیں سمجھتا' لیکن تم مجھے نہ سمجھیں-

اَرین: تب وہ جھلسا دینے والی خواہش کہاں ہے جس کے خلاف تم اس
قدر جنگ کرتے تھے جب میں تمہارے سامنے مردوں میں سے بیدار
شدہ عورت کی طرح آزادی کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی-

روبک: یقیناً ہماری محبت مردہ نہیں ہوئی ہے-

اَرین: وہ محبت جو اس زمین کی زندگی سے وابستہ ہے' حسین اعجاز نما
حیات' ناقابل فہم حیات' جو ہم دونوں میں مردہ ہوچکی ہے-

روبک: کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہی محبت آج کل میرے خاک شدہ دل
کو پامال کر رہی ہے-

اَرین: اور میں' تمہیں معلوم ہے کہ میں اب کیا ہوں؟

روبک: تم کچھ بھی ہو' مجھے اس کی پروا نہیں' میرے لیے تم وہ
عورت ہو جس کے میں خواب دیکھتا ہوں-

اری‌ن: تمہارے بعد بارہا گھومنے والی میز پر کھڑے ہوکر سینکڑوں آدمیوں کو اپنی برہنگی کا نظارہ دکھا چکی ہوں -

روبک: یہ میں تھا ' جس نے تمہیں اس طرف ہانکا - میں اس وقت اندھا تھا - میں جو مردہ مٹی کے پتلے کو مسرت حیات سے زیادہ وقیع تصور کرتا تھا - مسرت محبت سے بھی زیادہ -

اری‌ن: اب وقت نکل گیا - وقت نکل گیا -

روبک: اس دوران میں جو کچھ بھی رونما ہوا اُس نے بال برابر بھی تمہیں میری نگاہ میں کم نہیں کیا -

اری‌ن: نہ خود میری نگاہ میں -

روبک: پھر کیا ہے! تو ہم آزاد ہیں ' اور اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی زندگی پھر باہم بسر کرسکیں -

اری‌ن: آرنلڈ ' مجھ میں زندگی کی آرزو مردہ ہوچکی ' اب میں اُٹھ چکی ہوں ' میں تمہاری متلاشی ہوں ' میں نے تمہیں پالیا ' میں دیکھتی ہوں کہ تم اور زندگی دونوں مردہ پڑے ہو ' جیسے میں پڑی تھی -

روبک: تم سراسر غلط ہو ' ہم دونوں میں اور ہمارے ارد گرد زندگی کا چشمہ اُبل رہا ہے -

اری‌ن: تمہارے "روز حشر" کی نوجوان دوشیزۂ حیات کو اپنے تابوت پر پڑا ہوا دیکھ سکتی ہے -

روبک: تب دو مردوں ' یعنی ہم دونوں کو پھر حیات کے انتہائی نقطے تک جانے دو ' قبل اس کے کہ ہم اپنی اپنی قبروں میں جائیں -

اری‌ن: (چیخ مار کر) آرنلڈ!

روبک: اس تاریکی میں نہیں! اس جگہ نہیں - جہاں ایسی بدنما تاریکی

کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔

ارین: نہیں، نہیں، روشنی میں، نہایت درخشاں فضا میں "قلۂ کامیابی" کی بلندی پر۔

روبک: میری محبوب ارین، وہاں ہماری شادی کی دعوت ہوگی —

ارین: آرنلڈ۔ سورج ہمیں آزادی سے دیکھ سکتا ہے۔

روبک: روشنی کی ساری قوت ہمیں آزادی سے دیکھ سکتی ہے اور تاریکی کی ساری قوتیں بھی۔ میری دلہن کیا تم میرے ہمراہ چلو گی ؟

ارین: میرے آقا، میرے مالک، میں تمہارے ساتھ آزادی سے اور خوشی سے چلتی ہوں —

روبک: پہلے ہمیں اس کہر سے نکل چلنا چاہیے —

ارین: ہاں! کہر سے نکل چلنا چاہیے، پھر اس مینارے کی بلندی پر پہنچنا چاہیے جو ضیائے سحر میں درخشاں ہوتا ہے۔ روبک اور ارین دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے برفانی میدان کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں۔ مگر نیچے جھکے ہوئے بادلوں میں جلد غائب ہوجاتے ہیں، ہوا کے سخت جھونکے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ راہبہ نمودار ہوتی ہے اور اِدھر اُدھر متلاشی نگاہیں ڈالتی ہے، دور Maia کے گانے کی آواز کان میں آتی ہے۔ یکا یک بلندی پر گرج کی آواز بلند ہوتی ہے، روبک اور ارین برف کے تودوں میں دفن ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، راہبہ چیخ مار کر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ارین کو آواز دیتی ہے اور خاموش کھڑی رہ جاتی ہے۔ (Maia) کا فتح مندانہ گیت اب تک سنائی دے رہا ہے۔

ابسن نے اس ڈرامے میں آرٹ اور حیات انسانی کے تعلق پر

گہری روشنی ڈالی ہے' دراصل یہی موضوع اس (Epilogue) کی کنجی ہے' شاعر اسی مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے' اور اپنی کتاب حیات کے ابواب کھول کر دنیا کے سامنے پیش کر کے عبرت کا سبق دیتا ہے۔ وہ خود آرٹ کا ایک پجاری ہے' اُس نے اپنی ساری عمر آرٹ کی سیوا میں بسر کی' اب وہ خود اپنی زندگی کی ختم ہونے والی کتاب کے ابواب کھولتا ہے' اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوا۔ وہ آرٹ کی اہمیت کو تولتا ہے' اس کے بعد وہ زندگی کی گرانباری کا اندازہ کرتا ہے' اور پھر یہ پتا لگاتا ہے کہ ان دونو میں کون زیادہ وزنی ہے۔ دنیا کا یہ نہایت اہم ترین مسئلہ ہے۔ بہت سے حکما اور فلسفیوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض حضرات آرٹ کی پرستش کو دنیاوی علائق سے بلند تر خیال کرتے ہیں' ایک آرٹسٹ اپنے دوست کے مکان کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر وجد میں آ جاتا ہے' جب آگ کی لپٹیں چھت کو گراتی اور دیواروں کو منہدم کر کے آسمان کی جانب بلند ہوتی ہیں اس وقت آرٹسٹ دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا دوست بے گھر ہو جاتا ہے' لیکن جب شاعری کا جذبہ انسان میں قوی ہوتا ہے اس وقت وہ اس دنیا میں ہوتا ہی نہیں کہ اس کے علائق کا اُسے احساس ہو۔ شاعر اپنی دھن میں محو ہے' اس کے عزیز کی موت کے بعد تجہیز و تکفین ہو جاتی ہے لیکن اسے اصلا خبر نہیں ہوتی۔ یہ تو آرٹ کی یا شاعری کی پوجا ہے' اس کے ساتھ ساتھ زندگی ہے' دنیاوی تعلقات ہیں' سورج کی روشنی ہے' چاند کی چاندنی ہے' جھلملاتے ہوئے تارے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کی پرستش بہتر ہے یا زندگی کی پوجا۔ ابسن آرٹ کی پوجا میں ساری عمر گنوانے کے بعد

اپنے دل سے یہ سوال کرتا ہے " ساری زندگی آرٹ کے نذر کر دینا کہاں تک درست ہے "۔

ارین اس کا جواب دیتی ہے :

جب ہم مردہ بیدار ہوتے ہیں تو اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تلافی اور اصلاح ممکن نہیں اس وقت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کبھی زندہ تھے ہی نہیں —

ابسن دنیا کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میری زندگی ناکام تھی' میں نے عمر بھر شاعری کی' مگر وہ خود زندگی سے دور رہا' اب موت کے منہ میں پہنچتے وقت بیدار ہوتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ اس کی مثال برینڈ ہے وہ اپنے اصول پر قائم رہتا ہے' اپنے خیالات پر اڑا رہتا ہے' نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے متعلقین تباہ ہو جاتے ہیں۔ برینڈ فلسفے کا بندہ ہے' سماجی زندگی کے اصول سے ناواقف ہے اس لیے تباہ ہوجاتا ہے' روبک یا خود ابسن آرٹ کا بندہ ہے لیکن زندگی سے دور ہے' اس لیے وہ ناکام رہتا ہے —

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اس نکتے کی تشریح کردی جائے۔ دنیا میں سب سے اہم شے حیات انسانی ہے' سارے آرٹ' سارے فنون' سائنس کی ساری شاخیں' فلسفے کے سارے نظریے' اور علم کے سارے شعبے اہمیت میں حیات انسانی سے کمتر ہیں' علم و حکمت اور علم و فن کی ساری کوششیں اسی نقطے پر متحد ہوتی ہیں' ان کا منشا صرف ایک ہے' وہ یہ کہ حیات انسانی کو خوش تر بنایا جائے۔ سب سے بہتر تصویر وہ ہے جو انسان کو سب سے زیادہ مسرت پہنچائے اور اس کے احساسات کا مکمل نشو و نما کر سکے' سب سے بہتر عمارت وہ ہے جو انسان کو بھلی معلوم ہو اور جو اسے سب سے زیادہ آرام پہنچا سکے' سب سے اچھا راگ وہ

هے جو همارے سب سے اچھے جذبات کو مرتعش کر سکے - اب غور کرنے کی بات یہ هے که جو آرٹ حیات انسانی کی مفاد کو نظر میں نهیں رکهتا وه بهت کمتر درجے کا آرٹ هے ' ابسن ان لوگوں میں تها جو فطرتاً شاعر یا آرٹسٹ هیں ' موت کے قریب پہنچ کر وه یه غور کرتا هے که میری زندگی ناکام هوئی ' مگر یه اس کی خام خیالی هے ' وه بالطبع اسی زندگی کا پابند هو سکتا تها ' وه ایک مشن لے کر اس دنیا میں داخل هوا اور اس نے اپنا پیام اپنے ڈراموں کے ذریعے سے عوام‌الناس تک پہنچا یا —

ابسن کی زندگی گذر چکی هے ' بہتر سے بہتر ڈرامے اس کے قلم سے نکلے اور دنیا میں شہرت دوامی حاصل کر چکے هیں ' وه جانتا هے که وه قبر کے کنارے تک آچکا هے ' اب وه اپنے کارناسے پر نظر ڈالتا هے ' مگر اس کی روح بہت دلگیر هے ' اس کا دل پاش پاش هوا جاتا هے ' اور وه یہی کہتا هے که میں نے مٹی کی مورتوں پر زندگی کی خوشی اور محبت کو قربان کر دیا - Irene اپنے شباب جمیل کے ساری دلکش رعنائیوں کے باوجود هفتوں برهنه هو کر اس کے سامنے کهڑی رهی مگر روبک اس کے عشق کو ٹهکراتا رها ' اس کے جمال جهاں آرا پر محض آرٹسٹ کی سی نگاهیں ڈالتا رها جن میں عشق کی گرمی کے بجاے آرٹ کی سرد مہری موجود تهی ' اس کا یه خیال تها که اگر اس محبت میں نفسانیت کا شائبه بهی هوا تو اس کا مجسمه خراب هو جاے گا —

جب هم ارین کی گفتگو سنتے هیں تو هم یقیناً روبک کے رویه کو سخت نا پسند کرتے هیں - وه ایک بے حس ' مرده دل ' بے کیف آرٹسٹ هے ؛ ارین کا چکا چوند کرنے والا حسن اس پر کارگر نهیں هوتا ' اس کا جادو روبک کے دل پر مطلق نهیں چلتا - یه ضرور هے که روبک اپنی اور ارین

کی محبت اور "مسرت حیات" کو برباد کر دیتا ہے ' مگر وہ ایک ایسا شاہکار بنا جاتا ہے جو صدیوں تک آنے والی نسلوں کی زندگی کو مسرور اور پر کیف بنا دیتا ہے ۔ ہم نے یہ مانا کہ خود روبک کی زندگی رائگاں گئی اور اس کے جذبات کی دنیا ہمیشہ تاریک رہی ' لیکن اگر اس قربانی کے بعد اتنا بڑا کام عوام الناس کے مستقل مفاد کے لیے کیا جا سکے تو کیا یہ قربانی جائز نہیں ۔ جو شخص ایسے ایسے اور بے نظیر مفید ڈرامے لکھ جائے اُسے اپنی زندگی کو ناکام نہیں کہنا چاہیے ۔ مگر یہ یاد رہے کہ سب سے زیادہ نقصان Irene کو پہنچا ہے ' روبک نے شہرت و دولت حاصل کی ' اور اپنا پیام بنی نوع انسان تک پہنچا کر خلعت دوام پائی ' دنیا والے خوش ہیں کہ ان کو ایک شاہ کار ہاتھ آیا ' ان تک خدا کا پیغام پہنچا ۔ مگر ارین کو کیا ملا ' اس کی مثال بانسری کے سی ہے ' گانے والا دنیا میں مشہور ہو کر تان سین کا ہمسر ہو جاتا ہے ' جو اس کی موسیقی سنتا ہے ' سر دھنتا ہے ' مگر غریب نے کو کیا حاصل ہوا ؟ یہی حالت ارین کی ہے —

ابسن کی موت قریب ہے ' وہ اپنی تصانیف پر ایک گہری ناقدانہ نظر ڈالتا ہوا ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرتا ہے ' اُسے ناامیدی اور مایوسی گھیرے ہوے ہے ' وہ فوارے کے قریب بیٹھا ہے ' اس کا سر پشیمانی کی وجہ سے جھکا ہوا ہے ' اس کے بشرے پر رنج و الم کے گہرے آثار پائے جاتے ہیں ' وہ چشمے میں اپنی انگلیاں دھوتا ہے ۔ وہ انگلیاں جن سے اُس نے یہ ڈرامے لکھے ۔ انگلیوں پر دھبے پڑے ہوے ہیں ' وہ ان دھبوں کو دھو ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کی کوشش ناکام ہوتی ہے ' اس کی نگاہوں کے سامنے گہری تاریکی مستولی ہو جاتی ہے ' وہ اپنی زندگی کی ناکامی پر غور

کرتے کرتے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ناکامی کے تین پہلو ہیں، اولاً وہ کہتا ہے کہ اس کا ضمیر علیل ہے اور گناہ کا بوجھ اسے دبائے ڈالتا ہے، اس کے بعد اس نے تخئیل کو چھوڑ کر حقیقت کی جانب پیش قدمی کی۔ اس کے خیال میں آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ کجروی تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پیش قدمی کو کجروی کیوں کہا جاتا ہے، حقیقت نگاری بذات خود مصوری اور شاعری دونوں میں انتہا درجے کا کمال ہے، یہ ضرور ہے کہ تخیل کی دنیا حقیقت کی دنیا سے زیادہ رنگین، زیادہ شاداب، زیادہ سرسبز اور زیادہ شاداں ہوتی ہے۔ مگر اصل مصوری حقیقت نگاری کا دوسرا نام ہے۔ علاوہ ازیں ابسن آئیڈیل کی وہ بلندی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس پر وہ خود نہیں پہنچ سکتا، وہ ہمیں مداہنت سے جلگ کرنا سکھاتا ہے لیکن خود اس کمزوری کا شکار ہوتا ہے، پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابسن تخئیلی آرٹ کو حقیقت نگاری پر کیوں ترجیح دیتا ہے۔ اگر تصانیف کی ہر دلعزیزی اور ان کا مفید ہونا ان کی خوبصورتی کا کوئی معیار ہو سکتا ہے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ " برینڈ " " گڑیا کا گھر " کے مقابلے میں نہایت ہی بے حقیقت شے ہے۔ گو ہم یہ جانتے ہیں کہ کتاب کا ہر دلعزیز اور مفید ہونا اس کے آرٹ کے حسن کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ابسن اپنی زندگی کے رویہ سے سخت دل برداشتہ ہے، وہ سوچتا ہے کہ اگر میں اپنی قوتیں بجائے آرٹ کی سیوا میں صرف کرنے کے " لطف زندگی " میں صرف کرتا تو بدرجہا بہتر ہوتا۔ ہمیں ابسن کے اس خیال سے بھی اختلاف ہے۔ آخر الذکر صورت میں وہ خود خوش اور مسرور ہو سکتا تھا، لیکن دنیا پر اس کی ذات کا کیا اثر ہوتا۔ دنیا اسی طرح گمراہ رہتی۔ فطرت کا پیام بنی نوع انسان

تک نہ پہنچتا - ابسن قربانی کرتا ہے اور اس کا فیض دنیا کے اکثر ملکوں میں جاری و ساری ہو جاتا ہے، کیا اس کامیابی کا احساس ابسن کو مسرور بنانے کے لیے کافی نہیں ؟ —

روبک نے ارین کو یہ لالچ دے کر اپنی طرف کھینچا تھا کہ میں تمھیں پہاڑوں کی بلندی پر لے جاؤں گا جہاں پہنچ کر تم دنیا کی ساری شان و شوکت دیکھ سکو گی - ارین اس سے شکایت کرتی ہے کہ نہ تم مجھے پہاڑوں کی بلندی پر لے گئے اور نہ وہ شان و شوکت مجھے ملی جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا - روبک اس کا جواب دیتا ہے کہ میری یہ گفتگو ایک قسم کا استعارہ تھا جو میں بچپن میں لڑکوں کو لبھانے کے لیے استعمال کرتا تھا - اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے آئیڈیل کی سعی میں بھی دو پہلو موجود ہیں، یعنی اس کا نصب العین اُسے بھی دھوکا دے سکتا ہے، اور دنیا کو بھی؛ وہ خود یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ تمام عمر ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا رہا - مطالعۂ نفس نے اُسے یہ ایک نہایت اندوہناک سبق دیا جس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ یہ جو کچھ میں نے کیا سب ہیچ و پوچ ہے —

ابسن نے اپنی زندگی میں تین پہلو بدلے - پہلے آئیڈیل کی تلاش برینڈ اور پیرگنٹ سے کی، جو ارین کے مجسمے کی صورت میں موجود ہے، پھر اس نے معمولی انسانوں کے اخلاق و عادات، ان کے خوف، ان کی امیدوں پر معاشرتی ڈرامے لکھے؛ ان انسانوں کی صورتیں مجسمے کے ارد گرد موجود ہیں؛ آخر میں اُس نے خود اپنے نفس کی تحلیل کی، اس لیے مجسمے کے قریب وہ خود سرنگوں موجود ہے - اب آخر عمر میں ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خیالات میں انتشار اور پراگندگی پیدا ہونے لگی؛

خود اس کا فلسفہ اُسے اس لیے ناقص نظر آنے لگا کہ وہ اس کو کسی مرتب صورت میں پیش نہ کر سکتا تھا - ایک طرف آئیڈیل کی تلاش ہے، دوسری طرف سوشل خرابیوں کو دور کرنے کا عزم ہے، تیسری طرف خود اپنے نفس کو بے نقاب کرنا مقصود ہے، اس خلط مبحث میں ترتیب کا رشتہ ابسن کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے - چونکہ دماغ کمزور اور قویٰ ضعیف ہو چکے تھے اس لیے وہ اس فلسفے کو مرتب نہ کر سکا، اگر دو چار سال اور ابسن کی صحت قائم رہتی تو بہت ممکن ہے کہ اُس کے فلسفہ کے اجزاے پریشان کسی مرتب صورت میں نظر آنے لگتے - حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم ابسن کے پیام کو تلاش کرنا بھی چاہیں تب بھی ہمیں ناکامی ہوگی، ابسن کے دل و دماغ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو وہ من و عن اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتا ہے، اس کے دماغ پر جو جو پرتو پڑتے گئے، اس کے دماغ پر جو جو حالتیں طاری ہوئیں وہ بجنسہ اس کی تصانیف میں موجود ہیں، اس لیے اس کے خیالات میں تسلسل کی توقع کرنا فضول ہے - وہ خود اپنی اس کمزوری سے واقف ہے، لیکن وہ اس کمزوری کو حقیقت نگاری کا جز و اعظم تصور کرتا ہے - انسانی دماغ کا نشو و نما برابر جاری رہتا ہے، ہم آے دن اپنے زاویۂ نگاہ بدلتے رہتے ہیں، جو شے ہمیں آج اچھی معلوم ہوتی ہے کل ہم اس پر نفرین کرتے ہیں، آج جس شے سے دل برداشتہ ہیں کل اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں - اس نظریہ کو ذہن میں رکھئے تو ابسن کا تضاد آپ کی سمجھ میں آ جاے گا؛ بلند پایہ مصنفین کا قاعدہ ہے کہ کتاب ختم یا شائع ہوتے ہی خواہ وہ کتنا ہی اچھی کیوں نہ ہو کچھ بے ربط، کچھ بے معا ورہ اور کچھ غلط معلوم ہونے لگتی ہے - ابسن نہایت ہی ذکی الحس ہے؛ ذہنی ارتقا کے منازل جلد

جلہ طے کرتا ہے، آج ایک منزل پر ہے تو کل دوسری منزل پر نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں کہنا ضروری ہیں، میں اس جگہہ ان کا صرف حوالہ دوں گا، اِن پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ روبک کی صورت میں خود ابسن جلوہ گر ہے، گو ابسن کی زندگی میں نہ Maia تھی اور نہ Irene۔ گو ابسن نے اپنے فن سے روپیہ کبھی نہ کمایا نہ اس کے شاہکار شائع ہونے کے بعد اس کی تصانیف ختم ہو گئیں، پھر بھی روبک ابسن سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ (Epilogue) خود ابسن کی کتاب حیات کا آخری باب معلوم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ واقعات اور ان کے بیان کرنے میں بڑی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے، روبک ایک جگہہ Maia سے کہتا ہے کہ میرے مکان میں تمھیں بہت اچھے لوگوں کی صحبت حاصل ہوتی ہے، دوسری جگہہ کہتا ہے کہ ہم دونوں تنہا ہیں... اس قسم کی چند خامیاں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابسن کا دماغ کمزور ہو چلا تھا، اور اس کی ذہنی قوت زائل ہو رہی تھی۔ ابسن نے اپنے گذشتہ ڈراموں میں جب کبھی گذشتہ واقعات پر کوئی مکالمہ لکھا تو یقیناً اس مقام پر اپنا کمال دکھا دیا مگر یہ ڈراما مکالمے کی چمک دمک سے عاری ہے۔ اس کے بعد ہم (Irene) کے کردار پر ایک سر سری نگاہ ڈال کر اس قصے کو ختم کرتے ہیں —

Maia اور Rubek دونوں کے خاکے دھندلے ہیں، Maia ایک مستقل بوجھ معلوم ہوتی ہے Rubek ایک نیم دیوانہ، ختم شدہ، بوڑھا آرٹسٹ ہے، جس کے نہ صرف تصورات اور تخیلات کا خزانہ بلکہ جس کی ساری شخصیت ارین کے قبضۂ قدرت میں ایک کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ ارین کی تصویر کے نقش و نگار اُبھرے ہیں، اس کی آنکھوں میں ارادے کی چمک ہے؛ اس

کی پیشانی پر تلخ کامی کی شکن ہے' اس کے اعضا میں جان ہے اور اس کی متوالی آنکھیں اب تک عشق اور لگاوٹ کے رس سے معمور معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بر خلاف Maia ایک لاغر اندام' پست قامت' سادی' کم فہم لڑکی معلوم ہوتی ہے جس کو روبک کی "تشبیہہ" نے دام محبت میں گرفتار کردیا' اور جو الفہیم کے ساتھہ جا کر اپنی طفلانہ تحریکات سے کھیلنا چاہتی ہے۔ اس کے بر خلاف آہنی عزم رکھنے والی' بلند و بالا' زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوے ارین ہے جو گو چہل سالہ ہے مگر اب تک شان دلبری میں یکتاے روز گار معلوم ہوتی ہے۔ مجسمہ تیار ہو جانے کے بعد وہ دیوانہ وار چل کھڑی ہوتی ہے' رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی زائل ہوتی جاتی ہے' مگر اس کے جذبات کی دنیا اب تک تاریک ہے۔ وہ روبک پر ہزار جان سے عاشق ہے' لیکن آرٹسٹ روبک سے وہ سخت متنفر ہے' اس کے علاوہ اس کو ماں بننے کی شدید آرزو ہے' وہ مجسمہ بنوانے کے لیے اس لیے اور جلدی تیار ہو جاتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ وہ مجسمہ ان دونوں کا مشترکہ بچہ ہوگا' وہ اس کے قدموں پر گری' اس نے اس کی پوجا کی' اس نے کس طرح اپنی روح کی نذر روبک کو پیش کی' اور کس طرح وہ ہلاک ہو گئی۔ روبک اُسے واپس بلاتا ہے' اور چاہتا ہے کہ وہ پھر واپس آ کر اس کے ساتھہ رہے اور اس کے آرٹ کو اُکسائے' لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ وہ کہتی ہے' تم بھی مر چکے تمہارا آرٹ بھی مردہ ہوگیا۔

ابسن کو اپنے زمانے سے اُسی قدر نفرت تھی جس قدر کہ خود زمانے کو اُس سے' وہ دل کھول کر زمانے کو صلواتیں سناتا تھا' اُسی طرح زمانے والے دل کھول کر اس کی تذلیل کرتے اور اس پر پھبتیاں کستے تھے۔ اُنیسویں صدی میں کسی شاعر پر اتنی بوچھاڑ نہیں ہوئی جس قدر

کہ ابسن پر ہوئی - اس کے سوشل ڈراموں کو دنیا نے بدمذاقی کا مظاہرہ سمجھا اور خود اسے ایک اوسط درجہ کا ڈرامہ نویس قرار دیا جو اپنے زعم باطل میں اخلاقی تلبیس کرنے پر آمادہ ہے - یورپ کے ہر تنقیدی مرکز سے ان ڈراموں کے خلاف ایک شدید صدائے احتجاج بلند ہوئی ' حکومت کے ایوانوں ' مذہب کے گرجاؤں ' اور علم کے مندروں کے مینارون سے گالیوں کی ایسی شدید بارش ہوئی کہ ابسن کو مدت تک کہیں پناہ نہ مل سکی -

سقراط کے فلسفے پر جو اعتراض تھا وہی ابسن پر تھا کہ وہ نوجوانوں کے طبقے کو گمراہ کرتا ہے ' لیکن رائے عامہ ایک شدید غلطی پر تھی ' اُسی سقراط کے مردود فلسفے کو بڑے بڑے علما آنکھوں سے لگاتے ہیں ' اسی طرح ابسن کے متعلق بھی دنیا کی رائے تبدیل ہوئی ' اور ہمیں ماننا پڑا کہ وہ نیکو کاری کی قوت ' اپنے فن کا اُستاد اور انسانی سیرت کا بڑا مصور ہے —

ابسن کے ڈراموں کی خصوصیات پر بحث کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے ' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روئداد ؛ اس کا آرٹ ' اور اس کے اصول سب خود اُسی کے ایجاد کردہ ہیں - وہ یونان کے قدیم اصولوں پر کار بند نہیں ہوتا جو ارسطو نے ڈرامے کے لیے مقرر کیے تھے ' نہ وہ خود اپنے زمانے کے اصولوں کی پروا کرتا ہے جو ارسطو کے اصولوں سے بہت کم مختلف تھے. وہ ڈرامے کی اقلیم میں ایک نئی راہ اور ایک نئے مذہب کا بانی ہے. سب سے پہلے وہ انسان کی شخصیت سے بحث کرتا ہے ' فردیت اس کے خیالات کی کنجی ہے ' وہ اخلاقی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے مگر ایک حد تک قسمت پرست معلوم ہوتا ہے ؛ ساتھ ہی وہ انسان کو خود

مختار تصور کرتا ہے جو قوت ارادی سے متصف ہے۔ وہ اُس اختلاف کو اپنے ڈراموں کا مرکز بناتا ہے جو خواہش انسانی اور انسانی اوصاف میں اکثر رونما ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کی بیشتر مسرتوں اور ناکامیوں کا موجب ہوتا ہے - اخلاقی ذمہ داری کو بعض اوقات نظر انداز کردیا جاتا ہے جس کے نقائص ابسن نے "Ghosts" میں قلم بند کئے ہیں، اسی ڈرامے میں والدین کے گناہوں سے بحث کی ہے، اور توارث کی چاشنی کے ذریعہ سے ڈرامہ کو سائنٹیفک بنا دیا ہے - بسا اوقات ابسن کی حقیقت نگاری دھوکے میں ڈال دیتی ہے کیونکہ اس کا اصلی مدعا مجاز کے نقاب میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس کے ڈراموں کا موضوع وہی ہے جو بڑی سے بڑی ٹریجڈی میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کے بیان کرنے کا طریقہ انوکھا ہے - وہ اچھے، برے، پرانے، نئے اصولوں کو لیتا ہے، اور ایک ایک پر دیوانہ وار حملہ کرتا ہے، مگر کوئی حل پیش نہیں کرتا - اس کے ہیرو اکثر ذلیل و خوار، رسوا اور پامال ہوتے ہیں؛ پڑھنے والا اس قتل و غارتگری کو دیکھکر عش عش کرنے لگتا ہے، اصول کے چراغ گل کرتا چلا جاتا ہے، دنیا اندھیرے میں بدحواس ہوکر اُسے گالیاں دینے لگتی ہے —

وہ ایک سخت دل جراح ہے - وہ اوسط طبقے کے لوگوں کو لیتا ہے اور ان کی روح کے ریشے ریشے پر عمل جراحی شروع کرتا ہے، وہ لسانی یا بڑی بڑی تقریروں سے کام نہیں لیتا بلکہ باتوں ہی باتوں میں وہ روحوں کی قطع و برید شروع کردیتا ہے - وہ ایک بازی گر ہے؛ اس کے تھیلے میں بہت سی روحیں موجود ہیں، وہ آپ کو سامنے بٹھا کر ان پر نشتر کے وار کرنا شروع کرتا ہے - یہ حواس برہم کُن تماشہ دیکھ کر آپ بے تاب ہوجاتے ہیں بالخصوص اس وجہ سے کہ یہ روحیں آپ ہی کی ہیں - جب Aristophanes

اپنے شکار کی کھال اُتارنا شروع کرتا ہے تو ساتھ ہی وہ ایک خوش آئند گیت گانے لگتا ہے، شکسپیر کے ڈراسے میں اچھے برے دونوں ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ وہ آسمانی موسیقی سے ہمیں مسرور کرتا رہتا ہے، مگر ابسن کے عمل جراحی کے دوران میں نہ مسرت کی چاشنی ہے، نہ راگ کی موسیقی ہے، اور نہ کوئی اور دل خوش کن مظاہرہ ہے، وہ اس پر تلا ہوا ہے کہ وہ ہماری کوتاہ خیالی، ناتواں ہیئتی اور ہماری فطری کمینہ پن کی حقیقت کو بے نقاب کرے۔ وہ ما بعد الطبیعات کا شیدائی نہیں نہ اس کے کردار خیالی ہوتے ہیں، وہ زندہ ذی حس انسانوں سے سروکار رکھتا ہے، اُس کے ڈرامے اُنہیں پسند نہیں آسکتے جو محض جذبات کی فراوانی یا مسخرے پن کو پسند کرتے ہیں۔ وہ محض حقیقت نگار ہے، وہ ایک ایسا آئینہ خانہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے جس میں آپ اپنے خط و خال خوب دیکھ سکتے ہیں، اس کا یہ کمال بنی نوع انسان پر ایک بڑا احسان ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی طنز کا مالک ہے، وہ دنیا کو کھیل نہیں سمجھتا، وہ سنجیدگی، اخلاقیت، اور سرگرمیٔ عمل کا پرستار ہے؛ وہ ہر آئیڈیل کو صاف کرکے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اور قدم قدم پر اپنے آرٹ کے کمال کو دکھاتا جاتا ہے —

اس کے ڈرامے رنگ و روغن، تکلف و تصنع، آرائش و زیبائش سے خالی ہیں۔ اس کے ڈراموں میں المناک پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے، انداز بیان صاف ہوتا ہے، عورتیں اور مرد اکثر بھدے، غیر مہذب اور دنیا سے جدا معلوم ہوتے ہیں، اس کے نئے نئے خیالات دقیانوسی روایات پرست انسانوں کے لیے پریشان کن ہوتے ہیں، قصے کا انجام اکثر غم آگین ہوتا ہے، اور روئداد کے ہر پہلو میں عورتیں ضرورت سے زیادہ اُبھرتی

ہوئی معلوم ہوتی ہیں - ڈرامے کا ہر صفحہ خیالات سے لبریز ہوتا ہے ؛ تھیٹر کاہ میں جانے کا مقصد نہ سوچنا ہوتا ہے اور نہ غور کرنا - بلکہ ہم اس لیے وہاں جاتے ہیں کہ تھوڑی بہت مسرت اور لطف حاصل ہو - مگر ابسن کے ڈرامے میں غور و فکر کرنا اشد ضروری ہے ' وہاں نہ موسیقی کی لہریں ہیں اور نہ حسن کی فرحت بخش جلوہ طرازی ؛ اس کی بجاے وہ تیزاب کے چند قطرے ہمارے دلوں اور ہمارے دماغ پر ڈالتا رہتا ہے ' اور ہماری روحوں کی عریانی کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے - ابسن بناوٹ کا دشمن ہے ' وہ مذہبی ' سیاسی اور سوشل ' ہر قسم کے دھوکے سے نفرت کرتا ہے - وہ اتنا گہرا حقیقت نگار نہیں جس قدر کہ وہ اشارے اور کنایہ سے کام لیتا ہے - اس کے اخلاق کا لب لباب یہ ہے کہ آدمی کو آزادی حاصل کرنے کے لیے خود آزاد ہونا چاہیے ؛ چونکہ وہ دنیا سے نفرت کرتا ہے اس لیے اس کی تصانیف میں طنز کا پہلو بہت نمایاں ہے ' جو بہت چبھتا ہوا اور بعض وقت بہت دلدوز ہوتا ہے - ابسن کے ڈرامے اس جگہہ سے شروع ہوتے ہیں جہاں اوروں کے ڈراموں کا اختتام ہوتا ہے - اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی سے محض ایک اہم واقعہ اخذ کرلیتا ہے اور اس کے بعد مباحثے کو طول دے کر پرانے خیالات کو پرکھتا ہے - ڈرامے میں مباحثہ کی ابتدا ابسن نے کی - جب نورا هلمر سے کہتی ہے کہ آؤ ہم ذرا پہلی مرتبہ سنجیدگی سے باتیں کریں تب گویا یورپ کے لٹریچر میں سائنٹیفک ڈرامے کی بنیاد پڑی ' وہ پرانی ادبی روایات پر عمل پیرا نہیں ہوتا ' جس طریقے سے ناول نویسی میں فطرت نگاری کی تحریک پیدا ہوچکی ہے اسی طریقے سے ابسن نے ڈرامے کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کرکے اس فن کو سائنس سے جا ملایا —

وہ علم النفس کا ماہر ہے ' آرٹسٹ ہے اور شاعر ہے ' اگر وہ آرٹسٹ نہ ہوتا تو ٹوالسٹائے کی طرح پند و نصائح کرتے کرتے فنا ہو جاتا - اس میں وہ ضبط موجود ہے جو آرٹسٹ کے لیے ناگزیر ہے (جس سے ٹوالسٹائے متصف نہ تھا) - وہ اچھی طرح غور کرتا ہے ' پھر اپنے خیالات کو شاعری کا جامہ پہناتا ہے ' وہ ناامید نہیں ہوتا - یہ ضرور ہے کہ ہم اس کے معاشرتی ڈراموں کے بعض افراد کی بداخلاقی دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں لیکن اس کے آخری آخری الفاظ یہ ہیں " Pax Vobiscum " - ابسن حساس بہت تھا ' بہت جلد مشتعل ہو جاتا تھا - اگر کسی اخبار نے اس پر حملہ کیا تو وہ خیال کرنے لگتا تھا کہ میں بالکل برباد ہوگیا - ایک کتب فروش اس کی ایک تصنیف پر تالہ مارنا چاہتا ہے یہ سنتے ہی وہ ناروے کی کل آبادی' حکومت ' کلیسا ' سیاست ' ہر شے سے سخت ناراض ہو جاتا ہے اور اپنے وطن سے دائمی قطع تعلق کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے - یہ تو اس کی ذاتی کمزوری تھی ' مگر اس کے باوجود وہ اس صحیح نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ آزادی کی جنگ میں سب سے اہم شے جنگ کا دائمی حوصلہ ہے - دوسرا اہم سبق جو اسے حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ اقلیت ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے کیونکہ عوام الناس اعلیٰ ترین اور جدید ترین خیالات تک یکایک نہیں پہنچ سکتے ' اس لیے سب سے کامیاب شخص وہ ہے جو مستقبل سے وابستہ ہوتا ہے - وہ خود انسان کی ذاتی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا ' وہ کہتا ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے اچھی طرح واقف ہو کر صداقت کو حاصل کر سکتے ہیں ' کیونکہ صداقت خود ہم میں موجود ہے ' وہ ایسی صداقت کا متلاشی نہیں جو تجریدی ہو بلکہ وہ ایسی صداقت کا جویاں ہے جو کار آمد اور مفید ہو اور جس کی مدد سے وہ اپنی حیات کا مقصد

پورا کرسکے ' اس مقصد پر بحیثیت آرٹسٹ وہ ہمیشہ عامل رہا - وہ صداقت کے مشاہدے میں کامیاب ہے اور اس کے حصول کو محض قوت ارادی سے متعلق تصور کرتا ہے - وہ تنگ نظر ہے مگر شدت سے اس امر کا قائل ہے - اسی لیے وہ آرٹ کے اخلاقی پہلو کو سب سے زیادہ ضروری ' مفید ' اور کار آمد تصور کرتا ہے - اس کے خیال میں " Brand " سراسر ایک حسن کا رانہ تصنیف ہے ' اس نے اگر کچھہ خیالی قلعے منہدم کیے یا تعمیر کیے ابسن کو اس کی پروا نہیں ' وہ عالم وجود میں اس لیے آیا کہ ان حالات کو آرٹ کی ایک صورت میں نمایاں کرے " کیونکہ میری روح ان سے سیر ہو چکی تھی اور وہ میرے لیے بار تھے - اس کے بعد وہ تصنیف میرے لیے بیکار ہو گئی "- ابسن کہتا ہے کہ میں درس دینا نہیں چاہتا - میری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں انسانی کردار اور انسانی قسمتوں کے چربے اُتار جاوں - اس کا اور نیٹشے کا مدعا ایک ہی معلوم ہوتا ہے یعنی تکمیل شخصیت ؛ مگر دونوں میں اختلاف ہے ' ابسن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جب تک یہ تکمیل نہ ہوگی تب تک ہم بہترین کام دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے ' ابسن انسان کی شخصیت کو محبت ' قوت ارادی اور ذہن کا مرکب تصور کرتا ہے - ذہن صداقت کی تلاش کر کے اسے اپنی گرفت میں لیتا ہے ' محبت اس صداقت کی اہمیت ' اور اس کے تعلقات کی جستجو کرتی ہے ' اور قوت ارادی اس کو عملی جامہ پہناتی ہے - انسان کی مکمل شخصیت کے یہ تین ناگزیر اجزا ہیں - اس نکتے کی وضاحت کے لیے برینڈ اور جولین پر نظر ڈالنا چاہیے ' برینڈ قوت ارادی کا مالک ہے ! لیکن وہ اس لیے ناکام ہوتا ہے کہ اس میں محبت کا عنصر بالکل نہیں ؛ جولین کی یہ کوشش ہے کہ وہ روح سے مراجعت کر کے مادہ پرست

بن جاے- یہ دونوں ابسن کے لیے ناکامی کے علم بردار ہیں کیونکہ ایک میں صرف پہلا جز ہے' دوسرے میں صرف دوسرا ؛ مگر ابسن محبت کی بنیادوں پر تیسری عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے —

ابسن اُس فرض پر بہت زیادہ زور دیتا ہے جو اس کی ذات سے متعلق ہے - خود اس کی زندگی اس کا سب سے اہم فرض تھا' وہ ایک آرٹسٹ تھا' چنانچہ اس کی تکمیل کو وہ جان سے زیادہ عزیز تصور کرتا ہے' اس لیے اس فرض کے ادا کرنے میں وہ ہمہ تن ہمیشہ مشغول رہا' اس نے اپنی ذات کو ہر غیر متعلق شے سے دور رکھا - چنانچہ اس نے اپنی خودی کی ہمیشہ سیوا کی' اور صرف اس شے سے تعلق رکھا جو اس کی ذات پر اثر انداز ہوسکتی تھی - اس کے باوجود وہ سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کا آرزو مند ہے' اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہ ذمہ داری کس قدر گراں ہے - لیکن نیٹشے کی طرح وہ اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار نہ سکا' وہ اتنا باہمت نہیں ہے جس قدر کہ نیٹشے' مگر اس کے دلائل و براہین اسی قدر استوار ہیں جس قدر کہ نیٹشے کے- اس نے خرد و دانائی سے حصۂ وافر پایا تھا اور شاید اسی لیے وہ اپنی تعلیم میں کامیاب نہ ہو سکا' وہ خود کہتا ہے کہ ہر ڈرامے یا نظم میں میں نے خود اپنی روحانی آزادی حاصل کرنے کی سعی کی ہے' کیونکہ میں خود ان گناہوں اور جرموں کا ذمہ دار ہوں جو سوسائٹی میں رائج ہیں - وہ اپنی ذات کو سوسائٹی سے جدا تصور نہیں کرتا' بلکہ اس کے جز کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری محسوس کرتا اور آزادی کا ساعی ہوتا ہے - وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ دنیا میں سب سے زبردست انسان وہ ہے جو تنہا ہے' مگر وہ خود تنہا نہیں - یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ تنہائی سے مراد اس کی سیاسی فرقہ

بڑی کی اصلاح ہے ' لوگ اس نکتے کو اس کی موت کے تیس برس بعد سمجھے ہیں۔ ابسن ماحول کے اثر سے بے خبر نہیں ہے ' وہ کہتا ہے کہ خوردہ بینی روح کو تنگ اور نیم مردہ کر دیتی ہے ' شاید اسی لیے وہ ناروے سے بھاگ کر میونک ' روم ' تریستن میں ہمیشہ چکر لگاتا رہا - اب ابسن کے اس خیال سے گذشتہ خیال کی مطابقت کیجئے ' اور دیکھئے کہ اس کی تنہائی کہاں تک کام آتی ہے ' وہ روم میں زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے ' وہاں کی فضا ابسن کی روح کی مقفل کھڑکیاں کھول دیتی ہے ' مگر وہ وہاں زیادہ مدت تک قیام نہ کر سکا کیوں کہ روم کی فضا ناروے سے بہت بعید ہے ' وہ میونک میں آ کر دم لیتا ہے ' جہاں وہ نسبتاً ناروے سے قریب ہوجاتا ہے ' وہ بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ ماحول کا تخیل پر بڑا اثر پڑتا ہے ـــ

وہ کہتا ہے کہ " Peer Gynt " میں وطن سے دور رہ کر ہی لکھ سکتا تھا ' کیوں کہ مجھے لکھتے وقت نتائج سے خائف نہیں ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ کتاب تصنیف نہ ہوسکتی تھی - اگر ذرا ہم اور غور کریں تو یہ بات روشن ہوجائے گی کہ ماحول نہ صرف اس کے دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ خود اس کی تصانیف کے نفس کو تبدیل کر دیتا ہے - اگر وہ ناروے سے باہر قدم نہ نکالتا تو عمر بھر غزلیں لکھتا رہتا ' اگر وہ جرمنی میں رہ کر وہاں کی جدید ترین تہذیب اور طرز معاشرت سے آشنا نہ ہوتا اُس کے سوشل ڈراموں سے دنیا ہمیشہ کے لیے محروم رہ جاتی ' اور آخر عمر میں اگر وہ ناروے واپس نہ جاتا ' اور وہاں کے تغیر پذیر حالات اور اُبھرتے ہوئے نو جوانوں سے نہ ملتا تو اس کے آخری تین چار ڈرامے کبھی نہ لکھے جاتے ـــ

ابسن کے ڈراموں سے جو خیالات اخذ کئے جاتے ہیں وہ اکثر متضاد ہوتے ہیں، اس سے ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ابسن مہمل ہے؛ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابسن کم و بیش پچاس سال تک برابر تصنیف کے شغل میں مصروف رہا، اس دوران میں ضرور ہے کہ اس کے خیالات بدلتے رہے ہوں گے چنانچہ یہی تبدیلی ہم اس کے کلام میں پاتے ہیں۔ وہ نہایت سچائی سے ہر حالت کو جو اس پر طاری ہوتی ہے ہمارے سامنے من و عن پیش کردیتا ہے۔ "گڑیا کا گھر" میں وہ جس امر کی تلقین کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی مخالفت وہ "بھوت پریت" میں کرتا ہے۔ "دشمن خلق" میں ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر فرد بجائے خود تنہا سب سے بہتر شے ہے، حالانکہ "بھوت پریت" میں یہ بات دکھائی ہے کہ آزادی کی حد ہونا چاہیے؛ جو آزادی حدود سے متجاوز کرجاتی ہے وہ مہلک ہوجاتی ہے۔ "جنگلی بط" میں ایک آئیڈیل پرست نوجوان اپنی خطرناک زبان سے ایک پوشیدہ صداقت کو بے نقاب کرتا ہے، اور ایک اچھے خاصے گھر کو برباد کرکے چھوڑتا ہے۔ "Romersholm" میں پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھرنے کے خطرے کو واضح کیا ہے، "The Lady from the Sea." میں آزادیء عمل کو سراہا ہے حالانکہ Rebekka اسی آزادی کا شکار ہوکر فنا کا جام پیتی ہے۔ ہلدا بااختیار بننا چاہتی ہے؛ مگر یہی خبط ہلدا کی بدولت ایک خوش حال خاندان کی تباہی کا موجب ہوتا ہے، Borkman محبت کو روپے پیسے پر قربان کردیتا ہے؛ اور اپنی تباہ شدہ زندگی کے اختتام پر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس سے ایک ناقابل عفو گناہ سرزد ہوا کہ اس نے سیم و زر کی خاطر اپنی محبوبہ کی پاک محبت تباہ کی۔ آخری ڈرامے میں ابسن پھر پہاڑوں پر جاتا ہے جو

اس کے لیے آزادی کا نشان ہیں اور وہاں اُس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آرٹ سے زیادہ اہم محبت ہے، اور یہ کہ جس شے سے زندگی مقصود ہوتی ہے وہ صرف محبت ہی ہے۔ ابسن کے خیالات اور تعلیم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہم نے بیان کردیا۔ ابسن نے اپنی زندگی کا ہر پہلو اور ہر منزل ہمارے سامنے پیش کردی ہے، اُس نے تسلسل یا ربط پیدا کرنے کے لیے کوئی بات چھپائی نہیں، اس کے دماغ میں جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ بر ملا بیان کر جاتا ہے، اس کے عقائد میں جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ ہماری نظر کے سامنے موجود ہے، اس کے دماغ کا نشو و نما خود اس کی تصانیف سے ہویدا ہے؛ وہ حقیقت نگار ہے، جو حالت اس پر طاری ہوتی ہے یا جو نتائج وہ مرتب کرتا ہے وہ بلا کم و کاست ہمارے سامنے لے آتا ہے، جوں جوں ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے اور نئے تجربے ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں اسی قدر ہم خود تبدیل ہوتے جاتے ہیں، اس ناگزیر تبدیلی کی سب سے بہتر رام کہانی ابسن کے ڈراموں سے مرتب کی جا سکتی ہے —

ابسن نے محض اس خیال سے کہ کوئی اچھا موضوع ہاتھ آگیا کبھی قلم نہیں اُٹھایا، اس نے جو کچھ لکھا وہ یا تو اس کے غور و فکر کا نتیجہ تھا یا ان تجربوں سے متعلق تھا جو خود اسے پیش آئے۔ اس کا ہمیشہ یہ مقصد رہا کہ وہ کردار کو آزادی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے چھوڑ دے، خود تماشائی بن جائے، اور جو کچھ دیکھے وہ بیان کر دے؛ فیصلہ اور رائے زنی آپ پر چھوڑ دے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ پڑھنے یا دیکھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا کرے کہ وہ درحقیقت اصلی زندگی کے ایک وقوع پذیر ہونے والے پہلو سے

روشناس ہو رہا ہے' پھر زندگی کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے' مگر وہ وہاں پہنچکر دم نہیں لیتا اور آگے بڑھتا ہے یہاں تک کہ اندھیرے میں جا پہنچتا ہے؛ مگر وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہتی ہے' کیونکہ آگے بڑھنا' حرکت کرنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ تنگ نظر؛ مدت پسند' اور بے حد جوشیلا آرٹسٹ تھا جس نے برینڈ کی طرح خود اپنی ذات' اپنے خاندان' اپنے احباب اور اپنے ملک کو آرٹ کی خاطر قربان کردیا' اور ان مذہبی آدمیوں میں جا ملا جن کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا وہ خود خاکہ اُڑایا کرتا تھا۔ ابسن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ سوسائٹی کو آزاد کیا جائے' اس مقصد نے زندگی کی چپقلشوں کی صورت اختیار کی' اور یہ چپقلشیں ہمیشہ ڈرامے کی صورت میں رونما ہوئیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی تصانیف میں شستگی پیدا ہوتی جاتی ہے' تحریکات کا گورکھ دھندا کمبلک ہوتا جاتا ہے' خیالات میں گہرائی اور فراوانی بڑھتی جاتی ہے' اور رفتہ رفتہ سطحی زندگی کے غیر اہم واقعات بلند تر ہوتے ہوے روح کی گہرائیوں کا پتہ دیتے ہیں' اور ڈرامے کے میدان میں ابسن کی تصانیف ایک نئی دنیا کا منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ ہر ڈرامے میں اختصار اور انتخاب اس کمال پر جا پہنچتا ہے کہ ہر فقرہ اور ہر سین تصنیف کی جان ہو جاتا ہے' ہر ڈراما اپنی جدا فضا رکھتا ہے' پھر بھی سب ایک ہی لڑی کے موتی معلوم ہوتے ہیں' اور آرٹ کی حسین لا فانی بنیاد پر قائم ہیں —

ابسن ذرا بھی خوشامدی نہیں' پہلے ڈراما نویس کو نین کی گولی پر شکر لپیٹ دیتے تھے مگر ابسن جب حملہ کرنا شروع کرتا ہے تو پے در پے

وار کئے چلا جاتا ہے - جب ہم ابسن کا ڈرامہ دیکھنے تماشہ گاہ میں جاتے ہیں تو ہماری حالت ایک خونی مجرم کی ہوتی ہے جو عدالت میں پیش کیا جا رہا ہو، ہم ہال میں داخل ہوتے ہیں اور ہمارے جرم کی رام کہانی ہمارے سامنے پیش کردی جاتی ہے، ہم اپنی رسوائی کا منظر دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں —

ابسن کے پاس کچھ نئے خیالات، نئی تحریکات، نئی باتیں ہیں جو وہ بیان کرنا چاہتا ہے، وہ ایک نئی آنے والی دنیا کی آہٹ پاتا ہے؛ اس کے استقبال کے لیے دنیا والوں کو تیار کرنا چاہتا ہے - وہ زندگی کے ہر باب پر تنقید کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی خامیوں کا اسے علم ہوسکے؛ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک مشن لے کر اس دنیا میں داخل ہوا ہے چنانچہ اس کی تبلیغ میں ساری عمر اور ساری قوتیں صرف کردیتا ہے - عرصے تک وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اپنا پیام کس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کرے - وہ تجربے پر تجربہ کرتا ہے، اور کسی سے مطمئن نہیں ہوتا - شاعری زیادہ عرصے تک اس کا ساتھ نہیں دیتی اور اسے اپنے مقصد کے لیے کافی نہیں سمجھتا - ابسن میں آرٹ اور سائنس کا ایک مرکب موجود ہے؛ وہ دراصل سب سے زیادہ سائنٹیفک آرٹسٹ ہے؛ وہ شاعری کو خیر باد کہہ کر نثر پر اتر آتا ہے؛ یہ طرز نگارش اس جیسے سائنس پرست کے لیے بے حد موزوں تھی- اُسے عرصۂ دراز کے بعد علم ہوا کہ اس کی زبان نظم نہیں ہو سکتی، وہ اپنی ذات، اپنی روح، اپنے دل کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے اور اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ نظم کی پابندیاں اس کے مدعا کی وضاحت میں رکاوٹ پیدا کریں گی —

ابسن اپنے ڈراموں میں طنز و ہجو سے بہت کام لیتا ہے - بریانڈ اور

پھر میں جا بجا یہ نظر آتا ہے - لیگ آف یوتھہ میں ہنسی مصوری اور ہنسو کا مرکب موجود ہے ' سوسائٹی کے ستون میں حقیقت نگاری کا رنگ نمایاں ہوتا جاتا ہے ' مگر اس ڈرامے کی طنز بہت معنی خیز ہے ' ملک کا حامی اپنے کام میں مصروف ہے ' اور سوسائٹی کے خلاف ایک اور اتہام پیش کرتا ہے ' وہ ایک فریب کو بے نقاب کرتا ہے ' سائنس کا پرستار کہتا ہے ' دیکھو تمہاری سوسائٹی کے یہ ستون ہیں ' یہ ہتھیار ہیں جن سے سوسائٹی تیار ہوتی ہے ' یہ تمہاری شادی ہے جسے تم کامیاب کہتے ہو جس کا نتیجہ سمس گڑ یا کا گھر ہے ' یہ تمہارا واجب التعظیم خاندان ہے اور یہ تمہارا اصول حیات ہے ' " اپنے ماں باپ کا ادب کرو " اور توارث کی خفیف سی بھنک تمہارے کان میں یہ کہہ جاتی ہے - " بھوت پریت " یہ فریب ہے ' فریب جو ادب و احترام کے پیچھے چھپا ہوا ہے ' فریب جو شادی کے پیچھے پوشیدہ ہے ' وہ فریب جو دنیا کی جڑیں کھوکھلی کئے ڈالتا ہے ' صداقت اس کا تعاقب ان خفیہ مقامات تک کرتی ہے جہاں وہ پوشیدہ ہے - گناہوں کے خلاف کوئی وعظ نہیں کرتا ' وہ صرف ایک سائنٹیفک اصول کو پیش کرتا ہے اور پھر نظریہ کے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے ' چونکہ یہ نظریہ اسی قدر صحیح ہے جس قدر کہ خوفناک ہے ' اور اس کے طریق عمل کی منطق بے عیب ہوتی ہے اس لیے ہم پر ایسی حالت طاری ہوجاتی ہے جو موجودہ زمانے کا آرٹ آسانی سے پیدا نہیں کرسکتا - ابسن کے تین درمیانی ڈرامے اس کے کمال کا بہترین نمونہ ہیں ' وہ اپنے مناسب مصوری ' کردار ' مکالمے کی دلکشی اور خوبی کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہیں - لٹریچر میں اس سے اچھا سائنٹیفک کام کبھی نہیں ہوا - ہر لفظ بجائے خود اپنے اندر مفہوم کا ایک دریا پنہاں رکھتا ہے ' در

ڈرامے میں قطع برید کر کے روح کو یا بہ الفاظ دیگر حضرت انسان کی ذات کو برھنہ کردیا گیا ہے ۔ ڈرامے کے ظاھری آرٹ میں Sophocles کے بعد ابسن ھی کا رتبہ ہے ــ

ابسن کے کردار اس کے ڈراموں کی طرح تین قسم کے ھیں ، ایک تو اس کے پہلے ڈراموں میں پائے جاتے ھیں جو بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں نہیں پائے جاتے ۔ مثلاً Emperor And Galilean کی فضا اور اس کے کردار اس زمانے میں نہیں مل سکتے ۔ دوسری قسم کے کردار ابسن کے سوشل ڈراموں میں پائے جاتے ھیں جو اس صدی کی دنیا کے ھر گوشہ میں آپ کو مل سکے ۔" نورا ، ھلمر ، مسز الونگ ، کرسچینہ " سے ھم آئے دن ملتے رہتے ھیں ، اور ھماری فضا ان کے اثرات سے سرشار ہے ۔ تیسری قسم کے کردار ابسن کے آخری ڈراموں میں پائے جاتے ھیں جیسے مسٹر سولنس ، مسز سولنس ، ھلڈا ، اربن ، روبک ، یہ اس دنیا کے افراد نہیں اس لیے انھیں یہاں تلاش کرنا بے سود ھوگا ۔ ان کا مسکن ھوائی قلعے ھیں اور وھیں ان کی جستجو کرنی چاھئے ۔ پھر بھی ابسن کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے ایسے کرداروں کا ایک نہایت دلکش مرقع تیار کیا ہے جن کو ھم پہچان سکتے ھیں اور جن سے ھم مانوس ھوکر ان کے جذبات اور خواھشات میں شریک ھوسکتے ھیں ، ان کی ذھنیت ، ان کے عادات و خصائل اور ان کی خصوصیات سے بہت جلد آشنا ھوکر ھم انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرسکتے ھیں ۔ اس کی سب سے کامیاب مثال نورا ، ھلڈا ، مسز الونگ اور ھلمر ھیں ، " گڑیا کا گھر " کے آپ دو صفحے پڑھ لیجئے ، نورا کی ھیئت کذائی کا صحیح ترین نقشہ آپ کے دل میں جم جائے گا ، اس کے علاوہ ابسن کے کردار زمانۂ حال کے مطابق ھوتے ھیں ، وہ سراسر فطری ھیں اور ان سے کوئی ایسی بات ظاھر نہیں ھوتی جو

ہماری نگاہ کے سامنے موجود نہ ہو' مگر اس کے ساتھہ یہ باور کرنا ضروری ہے کہ ابسن کے ڈرامے ایسے عظیم‌الشان کردار سے عاری ہیں ' جیسے سیزر ' میکبتھہ ' لیر وغیرہ - کوئی ابسن کا انوکھے سے انوکھا کردار بہت زیادہ انوکھا نہیں ہوتا ' اس کے سوشل ڈراموں میں ایک بھی کیرکٹر ایسا موجود نہیں جو ہمارے ادراک پر بار ہو ' یا جس سے ہم آئے دن نہ ملتے رہتے ہوں ' اس کی ایک خاص وجہ ہے ' شکسپیر اور یونانی ڈرامہ نویس بالعموم اپنی ہمہ گیری میں عالمگیر پائے جاتے ہیں ' وہ شاہی خاندان ' متوسط طبقہ ' غربا کے جھونپڑوں ' جہلا کے اکھاڑوں ' علما کی خانقاہوں میں یکساں داخل ہوتے ہیں اور اپنے لیے ہر گوشے سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ڈراموں میں ایسے کردار درج کرتے ہیں جو سوسائٹی کے ہر طبقے کے حالات کی غمازی کرسکیں - ابسن اس کے خلاف دنیا کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ' ایک مختصر سے حلقے کو اپنی جولاں گاہ بناتا ہے ' اور اس کا گوشہ گوشہ چھان مارتا ہے ؛ یہ حلقہ عرف عام میں سوسائٹی کے نام سے نامزد ہے - اس حلقے میں نہ تو بادشاہوں کا ذکر ہے ' نہ ان میں علما کے علم و فضل کے ضیاباری ہے ' اور نہ ان میں غربا اور جہلا کے غربت و جہالت کا پر تو نظر آتا ہے - ابسن کی خوردبین آنکھیں محض سوسائٹی کے حلقے میں حیرت انگیز جستجو کے ساتھہ حرکت کرتی ہیں اور اس کا جائزہ لے کر اپنے مشاہدات دنیا کے سامنے پیش کردیتی ہیں - یہ مختصر ' محدود موضوع سائنٹیفک مطالعہ کے لیے موزوں ہے ' مگر اس میں شاعری اور تخیل کی بلند پروازی کا موقع نہیں - ابسن سوسائٹی کا کچا چٹھا دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے ' حسن کی نیرنگی ' آنکھوں کا متوالاپن ' زلفوں کی عنبر

باری ، جذبات کی فراوانی ، محبت کے ولولے ، رشک کی رنگ آمیزیاں ابسن کی نظر سے اوجھل ھیں - وہ ایک جراح کی حیثیت سے سوسائٹی کی رگ رگ کو چیرنا چاھتا ھے ، اس کے ڈرامے سراسر سوشل ھیں اس لیے ان کی فضا اور اس کا پس منظر دونوں ناقص ھوتے ھیں ؛ اگر اس کے ڈراموں سے ڈرامیٹک عنصر نکالدیا جاے تو وہ چند اھم موضوعات پر اچھے خاصے سوشل مقالے بن سکتے ھیں —

شاعری کا زیرو بم ترنم ریز ھوتا ھے ، ابسن کے ڈراموں میں بھی ایک خاص قسم کا مکمل زیرو بم موجود ھے مگر یہ زیرو بم مادی ھے ؛ اس لیے اس کا تعلق براہ راست نثر سے ھے ، شکسپیر کے ڈراموں کا زیرو بم موسیقی کا جادو بن کر خون میں حرکت پیدا کرتا ھے شکسپیر کے ڈرامے جب ھم دیکھتے یا پڑھتے ھیں تو ھم پر وجد کی سی حالت طاری ھو جاتی ھے ھمارا خون رگوں میں تیزی کے ساتھہ دوڑنے لگتا ھے ، اس کی زبان ، اس کی روئداد ؛ اس کے کردار ، اس کے حالات میں شاعری کی لہر موجزن ھوتی ھے - یہی وجہ ھے کہ اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی شکسپیر اب تک ھر دلعزیز ھے - یہ ضرور ھے کہ اس نے جو تحلیل نفسی اور خصائل انسانی کی تشریح ھمارے سامنے پیش کی ھے وہ بذات خود دلکش ھے لیکن اس سے بدرجہا زیادہ دلکش شاعری کی وہ لہر ھے جو شکسپیر کے ڈراموں میں بدرجۂ اتم موجود ھے - ابسن کے ڈرامے اس کے بر خلاف ایک اقلیدس کا معمہ ایک عقدۂ لا ینحل ھوتا ھے ، جس کی وضاحت کے لیے ھمارے دماغ کو بہت تیزی کے ساتھہ کام کرنا پڑتا ھے - ان ڈراموں میں شاعری کے بجاے منطق ؛ جذبات کے بجاے دلائل ، اور تخیل کے بجاے براھین موجود ھوتے ھیں - ان کا تعلق سراسر دماغ سے ھے ، وہ جذبات میں بھی ارتعاش پیدا کرتے ھیں لیکن یہ ارتعاش بہت جلد

اس معمے سے ٹکرا کر فنا ہو جاتا ہے جو ابسن کا ہر ڈراما ہمارے دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ واردات (Situation) کے تخلیق کرنے میں ابسن کے کوئی ہمسر نہیں، ابسن نے جو کردار اسٹیج پر پیش کئے ہیں ان سے زیادہ ذی حیات افراد پیدا کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ ابسن کی خواتین پیکار حیات میں مصروف جنگ ہیں اور آنے والی نسل کی خواتین بنا رہی ہیں، اس کی خواتین نے دنیا بدل دی، انھوں نے نہ صرف اپنی صنف کی اصلاح کی بلکہ دوسری صنف (یعنی ہامرون) کو سمجھنے، سوچنے، غور کرنے اور محسوس کرنے کا درس دے کر انھیں ملک اور بنی نوع انسان کے لیے مفید بنایا ہے۔

ابسن کے لکھنے کی میز پر ایک گلاس میں ایک بچھو، ایک تھالی میں چند کھلونے رکھے رہتے تھے، ان کے بغیر ابسن اپنی تصانیف میں مشغول نہ ہوتا تھا، ممکن ہے کہ یہ کھلونے اس کے کردار کی صورت اختیار کر لیتے ہوں؛ بذات خود یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے مگر اس سے ایک امر ضرور روشنی میں آ جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ابسن واردات سے زیادہ کردار کو اہم تصور کرتا ہے، وہ کیریکٹر کے خصائل اور خصوصیات کا پہلے اندازہ کرتا تھا، اس کے بعد وہ واردات کی جانب متوجہ ہوتا تھا جو ان مخصوص اشخاص کے لئے لا بدی اور ناگزیر ہوتی تھی۔ بالعموم روئداد، اور واردات پہلے تیار کی جاتی ہے، اور بعدہ یہ لباس چند کٹ پتلیوں کو پہنا کر ڈراما مکمل کر دیا جاتا ہے۔ ابسن اپنے مسودے پر مہینوں کام کرتا رہتا تھا اور غیر معمولی محنت، غور و فکر، کاٹ چھانٹ کے بعد اسے تکمیل کو پہنچاتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ نفسی تحریکات کو عمیق بناتا، پوشیدہ اوصاف اور خصوصیات دریافت کرتا اور اس کے بعد وہ اپنے فرد ڈراما کو ایک

مستقل صورت دیتا - ابسن کی نفسیاتی نظر بہت اعلیٰ ہے' اس کا تیز نظر آن واحد میں ہمارے دلوں کی اور روحوں کی گہرائیوں میں پیوست ہوجاتا ہے' اور اس پردے کو چاک کر دیتا ہے جو ہمارے رازوں کے اظہار پر پڑا ہے —

ابسن ایک انقلاب کے لیے کوشاں ہے' مگر یہ انقلاب سیاسی نہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ سلطنتیں' دول' مذاہب سب فنا ہو جائیں گے' انسان باقی رہ جاے گا - وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ سلطنت' دولت' مذہب' سیاست' علم و فن سے انسان اور اس کی زندگی کو بہتر بنانا چاہیے' ہاؤس آف پارلیمنٹ کی شان و شوکت' شاہ وقت کا محل بڑے بڑے تاریخی کلیسے اور کتب خانے یہ سب بیکار ہیں اگر یہ انسان کی حیات کو بہتر بنانے میں کام نہیں آ سکتے ۔ ابسن سلطنت سے ذرا بھی مانوس نہ تھا بلکہ ایک حد تک وہ اس کا مخالف نظر آتا ہے - وہ یہودیوں کی مثال دیتا ہے' جو دولت' علم و فضل' قومی بیداری' فیاضی میں اس قدر نیک نام ہیں گو وہ کہیں حکمراں نہیں ۔ وہ ایک موقعہ پر کہتا ہے کہ " اب تک ہم محض روٹی کے ان ریزوں پر زندگی بسر کرتے رہے جو گذشتہ صدی کے انقلاب کے دستر خوان سے گرتے تھے' ان ریزوں میں سے غذائیت فنا ہو چکی تھی' پرانے الفاظ میں اب نئے معنی منتقل کرنے کی ضرورت ہے ...... یہ وہ بات ہے جو سیاسی مدبر نہیں سمجھ سکتے اس لیے میں ان سے متنفر ہوں' وہ اپنے مخصوص ظاہری سیاسی انقلاب کے آرزو مند ہیں' مگر یہ سب بے حقیقت ہے ۔ سب سے زیادہ اہم انسان کی روح کا انقلاب ہے " ۔ (Maximus) کی طرح ابسن تیسری سلطنت کا خواب دیکھتا تھا - وہ اپنے ملک کے لیے آزادی کا خواہش مند ہے لیکن وہ لبرل پارٹی کے پروگرام میں

شریک عمل ہونے کے لیے تیار نہیں؛ اس کی وجہ اس نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہے۔ "لبرل لوگ آزادی کے سب سے بڑے دشمن ہیں، روح اور خیال کی آزادی "مطلق العنانی" کے دور دورے میں سب سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے، یہ فرانس میں واضح ہوا، اس کے بعد جرمنی میں اور اب ہم یہ بات روس میں دیکھ رہے ہیں"۔ ابسن سیاسی فرقہ بندی کا سخت دشمن ہے، یہ خیالات اُس نے اپنے دراموں میں جا بجا درج کئے ہیں مثلاً ڈاکٹر استا کمین کی تلخائی اور صداقت کا ہم اندازہ کرچکے، اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بقول ابسن اکثریت کبھی صحیح رائے پر قائم نہیں رہتی، وہ امارت کی پرستار ہے، لیکن امارت نہ خاندان چاہتی ہے اور نہ دولت بلکہ قوت ارادی، اور کیریکٹر کی خواہاں ہے —

ہم شکسپیر، مولئیر، ڈکنس، تھیکرے، ڈوما؛ وکٹر ہیو گو کی تصانیف شروع سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں لیکن ہمیں ذرا بھی پریشانی پیدا نہیں ہوتی، ان مصنفوں کے کارنامے گو بہت پرانے ہو چلے ہیں مگر اب بھی ان میں بڑی دلچسپی موجود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فطرت انسانی کے اصلی مرقعے موجود ہیں جو ہر صدی میں بنی نوع انسان کے تفنن کا موجب ہوسکتے ہیں، اس لیے ان کی دلچسپی نہ وقتی ہے اور نہ مقامی، ہر زمانے میں یہ کتابیں ہماری دلچسپی اور مسرت کا موجب ہوسکتی ہیں۔ مگر اس کے برخلاف ٹوالسٹائے ہے، اس کے قصے اور اس کا ہر ناول ہمیں بے حد پریشان اور از خود رفتہ کرنے کے لیے کافی ہے، "وار اینڈ پیس" اس کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کا مطالعہ ہمارے اخلاق کی بنیادیں متزلزل کردیتا ہے، ہمارے قدیم روایات اور خیالات کی دنیا کو زیر و زبر کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے، اور ان عقائد

کے برباد کرنے کے لیے آمادہ ہے جن کی صحت پر ہم روایتاً ایمان رکھتے ہیں۔ ابسن کی تصانیف کا بھی یہی رنگ ہے' ان کو پڑھتے ہی ہمارے اخلاق کی بنیادیں زیر و زبر ہوجاتی ہیں۔ "گڑیا کا گھر" "بھوت پریت" اور "جنگلی بط" کو پڑھتے ہی ہم اپنی دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے اخلاقی معیار نادرست معلوم ہونے لگتے ہیں' ہم اپنے روایات اور عقائد کو دھوکا تصور کرنے لگتے ہیں۔ شکسپیرنے Ekdal سے زیادہ مہمل کوئی کردار پیدا نہیں کیا' مگر فرق یہ ہے کہ Ekdal کی حماقت آرائی ہمارے دل میں درد پیدا کرتی ہے اور Falstaff ہمیں ہنساتے ہنساتے بے خود کردیتا ہے۔ مگر ابسن ہر انسان کو ایک بڑی قربانی تصور کرتا ہے' اس کا خیال ہے کہ نظام عالم غلط اصول پر کاربند ہے' اس لیے اس کی نظر میں حیات انسانی ایک بہت بڑی قربانی ہے' اسی لیے Ekdal کا چربہ کھینچنے میں بھی ابسن کے انداز بیان میں رنج و الم کا عنصر موجود ہے —

انشا کی طرح بہت سے حضرات ایسے ہیں جو قہقہہ کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں' جو تفنن و تفریح کے شیدائی ہیں' جو اپنے ماحول کو رنگین بنا کر "عیش با فراغت" کے مزے حاصل کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ یہ دراصل خوف اور بزدلی کا دوسرا نام ہے' ان لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ یہ دنیا کے کٹھن واقعات کا مقابلہ کرسکیں —

ہم نے رفتہ رفتہ نیکی' بھلائی' اور شرافت کے چند نصب العین بنا لئے ہیں اور ہم امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے پجاری ہوگئے ہیں' چنانچہ اب ہماری سوسائٹی میں کھوٹے کھرے کی تمیز انہیں معیاروں کے ذریعہ سے ہوتی ہے' ابسن ان نصب العینوں کو مسمار کرنا چاہتا ہے' ان کو پاش پاش کرنے پر تلا ہوا ہے' وہ ہمیں بت پرست سمجھتا ہے' اور کہتا

ہے کہ ہم ان پتھر کی مورتیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہیں' وہ ایک بت شکن کی طرح ہاتھ میں گرز لےکر ایک ایک مورتی کو چکنا چور کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ زمانہ بہت آگے نکل آیا' نئے حالات پیدا ہو چکے' فضا بالکل تبدیل ہوچکی' اب پرانے نصب العین اس زمانے میں کام نہیں آسکتے' ان کا تتبع کرنا سم قاتل ہے' زمانے کی رو دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے' جو ادارے زمانے کے ساتھ نہیں چلتے انہیں زمانے کی رو بہا لے جاے گی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت' دنیا کی قدیم سے قدیم تہذیب' دنیا کے بہتر سے بہتر آرٹ' دنیا کے مکمل سے مکمل مذاہب' غرض یہ کہ دنیا کے ہر انسٹیٹوشن کو حالات زمانہ کے مطابق تبدیل کرتے رہنا ہوگا ورنہ اس کی حیات معرض خطر میں ہے۔ اس خیال کے ذریعہ سے ہم تاروں کے ارتقا تک پہنچتے ہیں جو دنیا کے ہر شعبے میں کارفرما نظر آتا ہے' چنانچہ ابسن کہتا ہے کہ ارتقا کا امکان رواداری کا بنیادی پتھر ہے۔ ابسن کے نزدیک کوئی اخلاق ایسا مکمل نہیں جس کے بقا کے لیے ہر امکانی کوشش روا رکھی جا سکے' حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ ارتقانے خیالات اور جذبات کی وسیع دنیا پر جس قدر ہمہ گیر اثر ڈالا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان کام نہیں —

——:*:——

ادب

مجموعۂ نغز

(تالیف میر قدرت اللہ قاسم مرتبۂ پروفیسر محمود شیرانی - شایع کردۂ پنجاب یونیورسٹی - موتی لال بنارسی داس تاجر کتب لاہور سے مل سکتا ہے) —

یہ تذکرہ پروفیسر محمود شیرانی نے بڑی احتیاط و اہتمام اور محنت اور صحت سے مرتب کیا ہے - جس پر فاضل مرتب اور ان کے طفیل میں پنجاب یونیورسٹی قابل مبارک باد ہے —

اس میں چھ سو ترانوے شعرا کے حالات درج ہیں اور کتاب کی ضخامت (جو بڑی تقطیع پر ہے) علاوہ دیباچۂ مرتب کے آٹھ سو صفحے سے زائد ہے - اس تذکرے کے چھپ جانے سے اردو مطبوعات میں اور خاص

کر اردو شعرا کے تذکروں میں جو اس سے قبل شایع ہوچکے ہیں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے - یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جو کسی قدر کرم خوردہ اور بہت خستہ حالت میں تھا - دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانہ کا تھا جس کی حالت اُس سے بھی بد تر تھی - اس سے قابل مرتب کی محنت اور کاوش کا اندازہ ہو سکتا ہے —

اس تذکرے کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۲۱ ھ ہے - اس سے قبل متعدد تذکرے تصنیف ہوچکے تھے جن کا ذکر شیرانی صاحب نے اپنے دیباچے میں فرما دیا ہے لیکن بعض تذکروں کے سنین تالیف کے متعلق کسی قدر غلطی واقع ہو گئی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی تصحیح کردی جائے —

تذکرۂ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ ھ بتایا گیا ہے ' لیکن خود گردیزی اپنی تالیف کے آخر میں اسے سنہ ۱۱۹۶ ھ کی تالیف بتاتے ہیں * - تذکرۂ میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سنہ ۱۱۸۸ و سنہ ۱۱۹۴ کے مابین کی تالیف ہے - لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ میر حسن نے سودا کے ذکر میں نواب شجاع الدولہ (متوفی سنہ ۱۱۸۸) کو بقید حیات لکھا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ تذکرے کی تالیف سنہ ۱۱۸۸ سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غالباً سنہ ۱۱۹۲ کے بعد تک جاری رہی کیونکہ فصیح کے حال میں لکھا ہے کہ " در سال یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست " - اسی طرح عمدۂ منتخبہ کا

* ختم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنتظم فی ثمام ستہ و ستین و مائۃ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ النبویۃ —

سنہ تالیف ۱۲۱۶ ھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ خود صاحب تذکرہ قاسم کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت سنہ ۱۲۱۹ ھ ہے —

ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ بیان صحیح ہے کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے (عمدۂ منتخبہ) پر مبنی ہے - اس کی شہادت خود سرور کے تذکرے میں موجود ہے - وہ قاسم کے حال میں لکھتے ہیں —

" درینولا کہ سنہ ۱۲۱۹ ہجریست بہ سبب مطالعۂ این مجموعہ خود هم ذوق تالیف نمودن تذکرۂ پیدا کردہ ' چنانچہ از مولف مسودہ راگرفتہ انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است " —

اس کا ثبوت ان دونوں تذکروں کے مطالعے سے بھی ملتا ہے - متعدد شعرا کے حالات خفیف لفظی تغیر کے ساتھ بالکل وہی ہیں جو سرور کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں اور منتخب اشعار بھی اکثر وہی ہیں - خود قاسم نے بھی تذکرہ سرور کا دو ایک جگہ حوالہ دیا ہے * - علاوہ اس کے وہ تذکرۂ میر ' تذکرۂ مصحفی اور تذکرۂ ذکا کا بھی حوالہ دیتا ہے - لیکن قائم ؛ میر حسن ' قدرت اللہ شوق کے تذکروں کا کہیں نام نہیں لیا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد میر فتح علی الحسینی الگردیزی کے تذکرے کا مطلق ذکر نہیں کرتا ' حالانکہ وہ اپنی دوسری تصانیف میں ان کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتا ہے —

فاضل مرتب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ " یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آبحیات کا ایک اہم ماخذ ہے " - اور اس لیے اس زمانے میں جو بعض غلطیاں یا غلط بیانیاں آزاد مرحوم سے منسوب کی

* صفحہ ۲۰۱ و ۲۹۵ (جلد اول)

گئی ہیں۔ دراصل ان کا ملزم قاسم ہے۔ منجملہ ان کے میر صاحب کی بد دماغی اور تنک مزاجی کے متعلق آزاد نے نمک مرچ لگا کر ایک طومار لکھ مارا ہے جو مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے اصل فقرے قاسم کی عبارت کے لفظ بلفظ ترجمے ہیں۔ خصوصاً ولی کی نسبت یہ فقرہ کہ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" جو سراسر میر صاحب پر اتہام ہے، اسی تذکرے سے نقل کیا گیا ہے۔ میر خان کمترین کا یہ مصرع "ولی پر جو سخن لاے اُسے شیطان کہتے ہیں" کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ قاسم خود اس امر کے مقر ہیں کہ یہ (کمترین) ہر شخص کی نسبت کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتا تھا اور ایک عامی وضع شخص تھا۔ بات یہ ہے کہ بعض اشخاص جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے اور میر صاحب سے داد کے طالب ہوتے تھے وہ انہیں منہ نہیں لگاتے تھے۔ یہ اپنے دل کا بخار اس طرح نکالتے تھے۔ غالباً قاسم کا شمار بھی اسی قسم کے شعرا میں تھا۔ چنانچہ اس کے ضخیم کلیات سے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ مشاق شاعر ہے مگر کلام لطف سے خالی ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا انجمن ترقیء اُردو نے مدت ہوی شایع کردیا ہے۔ وہ قلمی نسخہ جس پر مطبوعہ نسخہ مبنی ہے اب تک میرے پاس موجود ہے۔ یہ سید عبدالولی عزلت کا نسخہ ہے جو میر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نسخہ بہت صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہے اور عزلت نے اپنے لیے نقل کروایا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۷۲ ھ (یعنی تالیف تذکرہ کے سات سال بعد) ہے۔ اس میں ولی کی نسبت صاف لکھا ہے "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"* ایسا

---

* نکات الشعرا صفحہ ۹۴ —

معلوم ہوتا ہے کہ کسی بد طینت مخالف نے "مشہور تر از شیطان" کی اڑادی، چلتا ہوا فقرہ تھا، عام و خاص میں مشہور ہوگیا —

بعض حضرات نے جو یہ قیاس قائم کیا ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ہو اور بعد میں یہ فقرہ خارج کردیا گیا ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ میر صاحب اس مزاج کے آدمی نہ تھے کہ وہ کسی کے کہنے سننے یا مخالفت سے اپنی رائے بدل دیتے یا اپنے تذکرے میں سے کوئی عبارت خارج کردیتے۔ ایک شہادت اور میں اپنی تائید میں پیش کرتا ہوں۔ شفیق نے اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا میں میر صاحب کے حق میں بہت زہر اُگلا ہے اور دل کھول کر ان کی مذمت کی ہے اور نکات الشعرا میں جہاں کوئی ذراسی بھی بات مل گئی ہے تو اس نے اس بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا، جا بجا اس کا ذکر ہے۔ اگر اس میں ولی کی نسبت یہ فقرہ ہوتا تو وہ کبھی در گزر نہ کرتا، در گزر کرتا، کیا معنی ایک آفت برپا کردیتا۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ میر صاحب پر اتہام ہے اور اس کا الزام قاسم کے سر ہے۔

پروفیسر شیرانی تحریر فرماتے ہیں "حکیم صاحب میر صاحب (میر تقی میر) سے بھی خفا ہیں۔ خفگی کے اسباب سے ہم تاریکی میں ہیں"۔ ناراضی کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے پیر و مرشد سید فتح علی گردیزی میر صاحب سے کسی وجہ سے ناراض تھے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے متعلق میں اپنی رائے تذکرۂ گردیزی کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں یہ خفگی اُن کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے۔ میر صاحب کے ذکر میں صرف ایک سطر ہے اور انتخاب کلام میں صرف ایک شعر۔ حالانکہ معمولی معمولی شعرا کے کلام سے کئی کئی شعر اور بعض بعض کے کلام سے کئی کئی صفحے نقل کیے ہیں۔ مرشد کی ناراضی سے مرید بھی ناراض ہے۔ اور

جو کام مرشد سے نہ ہو سکا وہ مرید نے کر ڈالا —

دوسرا بہتان قاسم نے میر صاحب پر یہ باندھا ہے کہ باوجود یکہ خان آرزو کے شاگرد ہیں مگر بوجہ نخوت و غرور اس سے بالکل منکر ہیں۔ اول تو میر صاحب کو خان آرزو سے تلمذ نہیں' ذکر میر میں اپنی تعلیم اور شعر گوئی کے متعلق صاف صاف لکھ دیا ہے۔ دوسرے نکات الشعرا میں جتنی تعریف خان آرزو کی کی ہے شاید کسی دوسرے کی کی ہو۔ ان کے علم و فضل و کمال کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں "حاصل کمالات اوشاں از حوصلۂ بیاں بیرونست۔ ہمہ اوستادان منضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوارند "۔ یہ باتیں آزاد کے کام کی تھیں' انہوں نے اپنے دلکش انداز میں اس طرح لکھا کہ عام طور پر مشہور ہوگئیں —

بہر حال یہ تذکرہ بہت قابل قدر ہے' اس میں اکثر ایسے شعرا کا ذکر آتا ہے جن سے مولف بذات خود واقف تھا اور ان کے حالات جہاں تک اُس کو معلوم ہوسکے بے کم و کاست لکھ دیے ہیں' اسی ضمن میں بعض پر لطف لطیفے اور حکایتیں بھی آگئی ہیں جو اُس زمانے کی معاشرت' شعر گوئی' مشاعروں اور دوسرے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سوائے دو چار کے ہر ایک کے حالات قلم بند کرنے میں انصاف اور راست بازی سے کام لیا ہے۔ ہر ایک کے کلام کی تعریف میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عام تعریف سے اُن کے ذوق سخن کی طرف سے تھوڑی سی بدگمانی پیدا ہوتی ہے لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اور معقولیت کے ساتھ تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاق صاحب فن ہونے کے علاوہ صاحب ذوق بھی تھے —

فاضل مرتب نے علاوہ دیباچے کے جس میں قلمی نسخوں کی کیفیت

مولف کے حالات ' تذکرے کی تنقید وغیرہ ہے ؛ کتاب کے آخر میں دو فہرستیں بھی شامل کردی ہیں - ایک اسماے اشخاص کی اور دوسری کتب و مقامات و دیگر امور کی - اسی کے ساتھ علحدہ اُن اغلاط کی بھی تصحیح کردی ہے جو مولف تذکرہ سے اتفاقیہ سرزد ہوگئی ہیں - دیباچے کے شروع میں ایسے الفاظ کی فہرست بھی (بقید صفحہ) دیدی ہے جو مولف کے زمانے میں مختلف طریقے پر لکھے جاتے تھے —

غرض کہ فاضل مرتب کی محنت و کاوش اور حسن ترتیب ہر لحاظ سے قابل داد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تذکرے کی اشاعت سے اردو زبان کی تحقیق و تاریخ میں جس کا شوق اس زمانے میں پیدا ہو چلا ہے بیش بہا مدد ملے گی —

پھول کماری

(مصنفۂ جناب پنڈت پیارے موہن دتاتریہ -
۲۴ (C) نسبت روڈ لاہور - قیمت بارہ آنے)

اردو میں اچھے ڈراموں کی جیسی کچھ کمی ہے وہ ظاہر ہے - اگرچہ اردو ادبیات کی ہر صنف میں کچھ نہ کچھ ترقی ہو رہی ہے لیکن ڈرامے کی حالت ابھی تک نہیں ابھری - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر ڈراما نویس تھیٹروں کے مالکوں کے ملازم تھے یا نہیں تو ایسی چیزوں کے لکھنے پر مجبور تھے جو اُن کی نظروں میں مقبول ہوں - اُن کو

فن ادب سے کچھہ تعلق نہ تھا وہ اپنی آمدنی کو دیکھتے تھے ۔ انھیں وھی ڈرامے پسند تھے جو بقول ایک تھیٹر کے مالک کے چوتھے درجے کے ٹکٹ والوں کو بھاتے تھے ۔ ان میں جو لغویتیں ' غیر واقعی باتیں ' پست مذاقی ھوتی تھی اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ۔ ھمیں پھول کماری پڑھ کر خوشی ھوئی کہ پنڈت پیارے موھن صاحب نے ھماری موجودہ معاشرت کے بعض پہلوؤں کو واقعی حالت میں دکھانے کی کوشش کی ھے ۔ غریبوں کی بے بسی اور دولتمندوں کی بے پروائی اور سنگدلی کا نقشہ کھینچا ھے ۔ پھول کماری ایک غریب دھوبن کی بیٹی ھے ' غریب ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اُسے تعلیم دلائی ھے ۔ اگرچہ اس نے افلاس اور تنگدستی میں پرورش پائی ھے لیکن جب اس کی ماں بیمار ھوتی ھے اور مہینوں گھلنے کے بعد حالت بہت خراب ھونے لگتی ھے تو اُس کی آنکھیں کُھلتی ھیں ۔ وہ اپنے ججمانوں کے پاس جاتی ھے رحمدل ڈاکٹروں کے ھاتھہ جوڑتی ھے تو اُسے معلوم ھوتا ھے کہ غریب مزدور کی کیا حیثیت ھے اور سرمایہ دار کس قسم کے لوگ ھیں ۔ وہ فلم کمپنی میں شریک ھوکر شہرت حاصل کرتی ھے اور سرمایہ داروں کی مخالف جماعت کی رکن اور سرکردہ ھوکر انتقام لیتی ھے —

گو یہ ڈراما اردو ادب میں ممتاز جگہ پانے کا مستحق نہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے صحیح رستے کی رھنمائی کی ھے ۔ پنڈت پیارے موھن صاحب کی اردو میں یہ پہلی تصنیف ھے اور سعادت مند فرزند نے اپنے فاضل باپ حضرت کیفی (پنڈت برجموھن دتا تریہ) کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ھے ۔ ھمیں امید ھے کہ اردو میں اُن کی یہ پہلی تصنیف آخری تصنیف نہو گی —

فام ایکٹرس نرغے میں

(مصنفہ سید ابوتمیم صاحب فرید آبادی - مصنف سے یا قریشی بک ڈپو،
کلاں محل، دہلی سے مل سکتی ہے - مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے)

پر لطف قصہ ہے سراغ رسانی اور عشق و محبت کی داستان ہے - لیکن کہیں کوئی بات خلاف تہذیب اور فحش نہیں - کہیں کہیں ظرافت کا چٹخارا موجود ہے - دل بہلانے کے لیے اچھی کتاب ہے —

بارہ پھلجھڑیاں

(مصنفہ سید ابوتمیم صاحب فرید آبادی)

یہ بارھوں قصے اسم با مسمی ہیں - سید صاحب میں ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری ہے - اگرچہ بعض بعض جگہ ظرافت بھدی ہوگئی ہے لیکن سب قصے بہت ہی دل چسپ ہیں - روزمرہ کی باتیں ہیں مگر بڑے لطف سے کی گئی ہیں —

نغمۂ حیات

(مصنفہ ایم - اسلم صاحب - پنجاب بک ڈپو
لاہور - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ ایم - اسلم صاحب کی تازہ تصنیف ہے - یہ چند خیالات کا مجموعہ

ہے جس میں شاعری بھی ہے اور فلسفہ بھی اور بیان بھی دلاویز ہے۔ ظاہری صورت یعنی لکھائی، چھپائی، کاغذ سب نفیس ہے —

اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام

نوشتۂ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ؛ درمیانی تقطیع، کتابت کاغذ وغیرہ عمدہ صفحات ۹۷، قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں صوفیاے کرام نے بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ انھوں نے اس کو علم و اخلاق کے سکھانے، آئین و اصول دین کے سمجھانے اور اپنی ہدایت و تعلیم کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ انہی کا طفیل تھا کہ ایک بازاری اور عوام کی انگھڑ بولی کو یہ رتبہ ملا کہ علم و اخلاق اور تعلیم و ہدایت کے اظہار کا آلہ بن گئی۔ یہ صوفیاے کرام کی جرأت تھی کہ انھوں نے اُردو سے وہی کام لیا جو عربی اور فارسی جیسی وسیع اور ترقی یافتہ زبانوں سے لیا جاتا تھا۔ فاضل مصنف نے نہایت تحقیق و تلاش سے مواد جمع کیا اور اس کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ابتدائی مسلمان درویشوں کی آمد سے لے کر گیارھویں صدی ہجری تک کے ان مشاہیر صوفیا و اولیا کا تذکرہ کیا ہے جن سے اُردو کی ترقی و توسیع میں بڑی بنیادی اور تعمیری مدد ملی ہے —

اس کتاب سے اُردو زبان کی قدیم تاریخ جو بڑی حد تک تاریکی میں

تھی روشنی میں آگئی ہے۔ اور زبان کی ابتدائی اور تدریجی ترقی و توسیع کا واضح نقشہ پیش نظر ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اُردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس موضوع پر اس قدر مرتب، مفصل، صحیح، مستند اور متحقق معلومات کہیں نہیں ملیں گے۔ اس کے سوا پوری کتاب زبان کی صفائی و پاکیزگی اور بیان کی سلاست و پختگی کے اعتبار سے ہمارے ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں داخل ہونے کے قابل ہے —

(چ)

مرحوم دھلی کالج

نوشتۂ مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ۔ تقطیع رسالہ اُردو کی۔ صفحات ۱۷۱۔ قیمت ڈیرھ روپیہ، ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

دھلی کالج ایسا نام ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یہ وہ کالج ہے جو آج سے کچھ اوپر سوا سو سال قبل قایم ہوا تھا اور اسی (۸۰) برس جاری رہا۔ اس کی اہمیت ہندوستان کی تاریخ تعلیم اور تاریخ زبان میں اس لیے ہے کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ یہ ان صحیح بنیادوں پر قایم ہوا تھا جن کے سمجھنے کی آج بھی اکثر تعلیم یافتہ دماغوں میں صلاحیت نہیں —

اس کتاب میں فاضل مصنف نے کالج کی تاریخ، اس کے نصاب،

تدریجی ترقی ؛ انقلابات ' اُس کے اساتذہ اور مشہور طلبہ ' اس کی اُردو تالیفات و تراجم وغیرہ پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے اور اس کالج کے کارناموں کو نہایت قابلیت و محنت سے رو شناس کرایا ہے۔ ہمارے ذہن میں اس کا نام تک نہ تھا ' ہم اسے بالکل بھولے ہوے تھے۔ فاضل مصنف کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ایک بھولی بسری داستان کے منتشر اجزا کو نہایت تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو سے جمع کرکے پیش کیا ہے۔ اب ہم اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور تفاخر کے مزے لیتے ہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کو ضرور مطالعہ کرنی چاہئے جو ہندوستانی زبان اور ہندوستانی تعلیمات سے دلچسپی رکھتے ہیں —

(چ)

تذکرۂ ریختہ گویاں

مولفۂ سید فتح علی حسینی گردیزی ' مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ ۔ درمیانی تقطیع ' طباعت کاغذ وغیرہ عمدہ صفحات ۱۶۸ ' قیمت مجلد سوا روپیہ ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

جو لوگ اُردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ گردیزی کے نام سے ضرور آشنا ہیں۔ گردیزی سید عوض خاں (امیر عہد محمد شاہی) کے فرزند اور اپنے وقت کے صوفی اور اہل دل تھے۔ انہوں نے میر صاحب کے تذکرہ کے ایک سال بعد ۱۱۶۶ھ میں یہ تذکرہ لکھا ہے ۔ اس میں ۹۸ ریختہ گو شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے ہیں ' جن میں بعض

قدیم اور اکثر مولف کے معاصرین ہیں —

اس کی تالیف کی غرض یہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے اکثر نازک خیال رنگین نگار شعرا کو اپنے تذکروں میں جگہ نہیں دی اور حالات و اخبار کے لکھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں ' اس لیے یہ کتاب لکھی ہے کہ صحیح حالات درج ہوں اور بے لاگ تنقید کی جائے ۔ یہ دراصل میر صاحب کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا ہے ۔ میر صاحب کے اکثر خیالات اور آرا سے مولف نے اختلاف کیا ہے لیکن میر صاحب کے تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا ۔ ان دونوں تذکروں کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔ دونوں کے اختلافات سے بڑے پر لطف تنقیدی سوالات پیدا ہوتے ہیں —

یہ تذکرہ اب تک چھپا نہیں تھا ' فاضل مرتب نے اسے مختلف تین نسخوں سے ترتیب دیا ہے اور شروع میں سترہ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں گردیزی کی حیات ' تصانیف اور تذکرہ کی حیثیت وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے ۔ گردیزی کے حالات اب تک بالکل تاریکی میں تھے فاضل مرتب نے نہایت تحقیق سے اس کے معتبر اور صحیح سوانح لکھے ہیں کہ مزید جستجو کی احتیاج نہیں رہی —

انجمن ترقی اردو نے یہ بڑا کام کیا کہ تذکروں کو شایع کرنے کا خاص اهتمام کیا ہے ۔ انجمن اب تک نکات الشعرا مولفۂ میر ' تذکرۂ میر حسن ' مخزن نکات مولفۂ قایم ' چمنستان شعرا مولفۂ شفیق شایع کرچکی ہے ۔ گردیزی کے تذکرہ کے ساتھ مصحفی کے تینوں تذکرے بھی چھاپ دیے ہیں جو عنقریب شایع ہوں گے ۔ اس کے علاوہ مخزن شعرا (تذکرۂ شعرائے گجرات) بھی شایع کردیا ہے ۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ

قدیم اساتذہ اردو کے دواوین کو بھی جلد شایع کیا جائےتا کہ ہمارے قدیم مستند ادب کا معتبر ذخیرہ روشنی میں آجائے اور تلف و ضایع ہونے سے بچ جایے ۔ اس کے لیے انجمن خاص کوشش اور تگ و دو سے قلمی ذخائر جمع کر رہی ہے ۔ قدیم ادب کی طرف انجمن کی یہ توجہ اور دلچسپی ہر طرح قابل مبارک باد ہے ۔ اس کے بعد انجمن کو فوراً جدید علوم و فنون اور دوسرے مفید و ضروری موضوعات کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ موجودہ ضروریات اور حالات کا ہم ساتھہ دے سکیں ۔

(ح)

مخزن شعرا

مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ ، درمیانی تقطیع ، لکھائی چھپائی نہایت پاکیزہ کاغذ دبیز اور عمدہ صفحات ایک سو بیس مطبوعۂ جامعہ ملیہ ۔ قیمت مجلد سوا روپیہ ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ گجرات کے ایک سو گیارہ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جس کو بھڑوچ (گجرات) کے مشہور فاضل قاضی نورالدین حسین فائق نے ۱۲۶۸ ھ میں تالیف کیا تھا ۔ یہ وہی تذکرہ ہے جس کا حوالہ آزاد نے

آب حیات میں دیا ہے —

اس میں گجرات کے قدیم و جدید شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے درج ہیں ۔ اس کا ماخذ ایک اور تذکرہ ہے جس کو سورت کے ایک فاضل مولانا شیخ احمد نے لکھا تھا اور جس میں بلا تخصیص مکان و زمان تمام ہندوستان کے تقریباً بارہ سو اردو گو شعرا کے حالات ہیں ۔ یہ تذکرہ مولانا شیخ احمد سورتی کی کتاب ہندوستان کا ایک باب ہے اس سے حضرت فائق مرحوم نے گجراتی کے اردو گو شعرا کا تذکرہ الگ کر دیا ہے اور اپنی معلومات کی حد تک اس میں کچھ اضافہ کیا ہے ۔ اس تذکرہ سے اردو زبان کی اس ترقی و توسیع کا حال معلوم ہوگا جو گجرات میں ہوئی ہے ۔ تاریخ زبان میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے —

مولف نے یہ التزام کیا ہے کہ قدیم گجراتی اردو کے اشعار اس میں داخل نہ ہوسکیں اس لیے کہ اُنکے دور میں اُن کا سمجھنا آسان نہیں ۔ اسی لیے انھوں نے قدیم شاعروں کے کلام کا ایسا انتخاب کیا ہے کہ جدید زبان کے مطابق ہو اور غالباً اسی التزام کی بناء پر بعض مشہور اور مستند بلند پایہ قدیم ترین گجراتی شعرا کا ذکر نہیں کیا ۔ اس کی تلافی فاضل مرتب نے اپنے مقدمہ میں کردی ہے ۔ گجرات میں مسلمانوں کی تاریخ اور قدیم ترین گجراتی مصنفین و شعرا کا حال مختصراً اس میں لکھ دیا ہے ۔ اس کے علاوہ مولف تذکرہ کے سوانح بھی لکھ دیے ہیں ۔ اب یہ کتاب گجراتی اردو کا بہترین تذکرہ ہوگئی ہے —

مولف تذکرہ حضرت فائق سے ہمیں بعض امور میں اختلاف ہے ۔ انھوں نے ولی اورنگ آبادی کو گجراتی مان لیا ہے ۔ اس خیال کے ثبوت میں جو باتیں لکھی ہیں وہ قابل قبول نہیں ۔ اس کے علاوہ فاضل مولف نے عزیزاللہ ہمرنگ کو

گجراتی شاعر سمجھ لیا ہے۔ اس کی نسبت لکھا ہے کہ اس کا مولد بمبئی میں ہے۔ تعلق بمبئی کی بنا پر عشرتی کو گجراتی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اورنگ آبادی شاعر تھا؛ اس کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے دو تفسیر چراغ ابدی اور مثنوی دودہ دلیا ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان میں اس نے صاف طور سے اپنے آپ کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ لایق مولف مرزا غالب سے متعارف تھے۔ ان سے خط کتابت تھی۔ مرزا نے اس تذکرہ پر نظر ثانی کی ہے اور ایک خط بھی اردو میں لکھ دیا ہے جو تذکرہ کے آخر میں درج ہے۔

(ع)

ترانۂ مغرب

(مصنفہ جناب سید راحت حسین صاحب
فلسفی بی۔ اے۔ چھوٹی تقطیع صفحات ۸۰ قیمت
چھ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ دارالتالیف چوہر ۲)

تھوڑی نظموں کا یہ مختصر سا مجموعہ بڑے طمطراق اور ادعا کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ حضرت فلسفی نے لکھا ہے کہ ہماری فرسودہ اردو شاعری از کار رفتہ ہوگئی ہے اور "اب اس کام کی نہیں رہی کہ اس سے کوئی اثر پیدا ہو یا بچوں کو تعلیم دی جائے...... مدارس میں ہمارے بچوں کے لیے نظم کی کوئی ایسی کتاب یا ذخیرہ جو اک سبق آموز بالاثر نصاب کا کام دے سکے موجود نہیں ہے۔ ایک مسدس حالی ہے اس کو کوئی کہاں تک پڑھے؟ اس امر ضرورت کو محسوس کر کے یہ کتاب جس میں چھوٹی

چھوٹی دل آویز نظموں کا ایک گراں بہا ذخیرہ ہے... تیار کی ہے" اس اہم ضرورت کے علاوہ اس تصنیف کی ایک اور غرض ہے "دوسری غرض اُردو شاعری کی ترقی اور اصلاح ہے" —

لائق مصنف نے جن مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھا ہے وہ بہت بلند ہیں اور جس جرأت سے ان کا اظہار کیا ہے وہ بھی لائق صد آفریں ہے - اوپر کے اقتباس سے معلاً یہ بھی پایا جاتا ہے کہ حضرت فلسفی ترانہ مغرب کو مسدس حالی کا نعم البدل سمجھتے ہیں —

ان دعاوی کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان نظموں کو دیکھتے ہیں تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے - یہ نظمیں (جن میں تین طبع زاد اور بقیہ مترجم ہیں) چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہیں جن میں بچوں کو نصیحتیں کی گئی ہیں - یہ وہی کہانیاں ہیں جن کو طالب علم اکثر درسی کتابوں میں پڑھتے ہیں - ان کا صرف قالب بدل دیا ہے - اس میں بھی کوئی خاص جدت اور ندرت نہیں بلکہ بعض الفاظ اور محاورات بچوں کی فہم سے باہر ہیں —

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے عمدہ نظمیں ترجمہ کی ہیں اور ان کو خوبی سے اُردو کا جامہ بھی پہنایا ہے ' بعض بھی مترنم اور رواں ہیں - لیکن کہیں کہیں ترجمے میں انگریزی طرز خیال اور اسلوب بیان کی جھلک نظر آجاتی ہے —

بعض الفاظ اپنے استعمال کی وجہ سے کچھ موزوں اور معنی خیز نہیں - مثال کے لیے دو لفظ جذب مرکزی اور انفعال نظر کو لیجیے —

چھ بار گرتی آئی اس طرح جب فضا میں
اور جذب مرکزی سے حیراں ہوئی ہوا میں

نور کیا ہے ؟ جس سے کہتے ہو کہ روشن ہے جہاں

کیا ہیں انفعال نظر اور کیا ہیں اس کی خوبیاں ؟

یہ مجموعہ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے مرتب ہوا ہے ۔

(چ)

تاریخ و سیر

تاریخ صقلیہ (تاریخ سسلی)

(جلد اول مولفہ سید ریاست علی ندوی - مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ - قیمت پانچ روپے)

یہ دار المصنفین اعظم گڈھ کا قابل قدر علمی کارنامہ ہے جس کے لیے سید ریاست علی صاحب واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں - انہوں نے کئی سالوں کی محنت سے اس ضروری کام کو سرانجام دیا ہے اور فی الحال پہلی جلد طبع ہوئی ہے جو قریب ۵۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دار المصنفین کی دیگر مطبوعات کی طرح عمدہ کاغذ پر مع چار رنگین ضروری جغرافی نقشوں کے طبع ہوئی ہے - اس میں خصوصیت سے صقلیہ کے جغرافی حالات؛ جزیرۂ صقلیہ؛ اٹلی و جزائر صقلیہ پر اسلامی حملوں کی ابتدا اور یہاں اسلامی حکومت کا قیام؛ اسلامی

حکومت کے ہر عہد کے عروج اور پھر اسلامی حکومت کے خاتمہ اور صقلیہ و جزائر صقلیہ میں مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقع خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ دور اسلامیۂ صقلیہ ' دولت اغالبہ سنہ ۱۸۴ھ سے لے کر دولت کلبیۂ صقلیہ و طوائف الملوکی سنہ ۴۴۴ھ تک کی سیاسی تاریخ ہے۔ یہ دراصل رزمیہ سرگذشت ہے اور دوسری جلد میں سسلی کی تمدنی معاشرتی اور ذہنی ترقیوں کا مرقع پیش ہوگا جو زیر طبع ہے۔ کتاب کی تیاری میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر ممکن ماخذ سے کام لیا جائے علاوہ یورپی ' عربی مصنفین کی تالیفات کے مولوی مرتضیٰ صاحب کے اردو مضامین (رسالہ معارف علی گڈھ سنہ ۱۸۹۹ع اور مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے مضمون " صقلیہ میں اسلام " سے بھی جو ابن اثیر سے ماخوذ ہے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی طباعت سے پیشتر ہم سسلی میں اسلامی سلطنت کی سرگرمیوں کا حال بعض مختلف اور منتشر تحریروں کے ذریعہ سے پڑھتے رہے مگر اب پورے طور پر ایک جگہ دو ضخیم جلدوں میں اسلامی جد و جہد کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر ڈاکٹر سر اقبال کے مرثیۂ سسلی کے یہ شعر یاد آجاتے ہیں —

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

یہاں ہم بعض فرو گذاشتوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں تاکہ دوسری جلد کے اختتام پر اس جلد کو پھر پڑھ کر ان کو دور کیا جائے —

صفحہ ۹ ابن اثیر کے نقل کردہ الفاظ میں " ینھون " کی بجائے " ینھبون " چاہئے ورنہ معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں —

صفحہ ۱۱ " عرب جغرافیہ نویسوں نے ...... صقلیہ کی شکل کو مثلث قرار دے کر دو مساوی ساقین اور تین زاویوں میں تقسیم کیا ہے الخ۔"

دراصل یہ الفاظ یاقوت حموی سے لیے گئے ہیں مگر اس کو اگر یوں کہا جاتا کہ "صقلیہ کی شکل مثلث مساوی‌الساقین ہے" تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا یاقوت کا اصل مطلب بھی یہی ہے —

صفحہ، ۱۳ "صقلیہ کا ساحل سطح سے بالعموم بہت مقام پر کم و بیش ۵۰۰ میل بلند ہے۔ یہاں غالباً ۵۰۰ فٹ مراد ہے —

اسی طرح بعض اور مقام بھی ملیں گے۔ کتاب کے آخر میں غلط نامہ دیا ہے مگر ان امور کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ اہم کام جو نہایت ضروری تھا دارالمصنفین نے بہ طریق احسن سرانجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جس کے لیے یہ ادارہ تحسین کا مستحق ہے۔ پھر انشاءاللہ دوسری جلد کے شائع ہونے پر تبصرہ کیا جائے گا، کیوں کہ اسلامی کلچر کا پہلو دوسری جلد سے وابستہ ہے —

(ع)

مورخین ہند

(مولفۂ حکیم سید شمس اللہ قادری۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالۂ تاریخ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپیہ۔ بڑا سائز صفحہ ۱۳۲) —

حکیم سید شمس اللہ قادری کی شخصیت تاریخی ذوق کے رکھنے والوں

کے لیے کوئی محتاج تعارف نہیں۔ ان کی اس تالیف پر نواب سر احمد حسین امین جنگ بہادر کا ایک تعارف نامہ "پیش لفظ" کے عنوان سے ہے۔ چنانچہ انہیں کے الفاظ "تاریخ آئینۂ گذشتہ و درس حال است فال مستقبل" اس کے متعلق ٹھیک صادق آتے ہیں۔ یعنی یہ تالیف ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی معتبر و مستند کتب تاریخ پر تبصروں اور ان کے مصنفین کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب یوں قائم کی ہے۔ ہندوستان کی عام تاریخیں، ہندوستان کی جغرافیائی تاریخیں، سلاطین دہلی کی تاریخیں، لودھی اور سوری خاندان کی تاریخیں، سلاطین تیموریہ کی تاریخیں (بابر سے لےکر جانشینان اورنگ زیب تک)، سندھ، کشمیر، گجرات، بہمنیہ، عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، آصفیہ، مرہٹہ، افاغنہ، بنگالہ، کرناٹک، میسور، غرضیکہ نہایت مفید فہرست کتب ابواب میں تقسیم کی ہے جن پر ایلیٹ وغیرہ نے اپنی کتب تاریخ کو مبنی کیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مفید کتابوں کا اندراج نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر مرات العالم از بختاور خاں، مرات واردات از محمد شفیع نگینوی، آداب عالم گیری، تاریخ ہفت کرسی زمانہ عالم گیر، تاریخ دلکشا از بھیم سین وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ اس قسم کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو ضروری ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اُن کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ بہرحال اُردو میں یہ نئی کوشش ہے جس کے لیے حکیم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں —

(ع)

جیبی اٹلس

(مولفہ سید شرف الدین قادری صاحب ایم' اے' بی' ٹی
چھوٹی تقطیع' کتابت طباعت اوسط درجے کی' کاغذ اچھا'
صفحات علاوہ تصاویر وغیرہ ۹۸' قیمت ایک روپیہ پانچ آنے
کلدار' ایک روپیہ نو آنے عثمانیہ - ملنے کا پتہ :-
مکتبۂ ابراھیمیہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن) -

یہ تاریخ و جغرافیہ کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ھے - تمام دنیا کا جغرافیہ اٹلس ھے' ایک علحدہ باب میں ھندوستان کی تاریخ کو صد سالہ ادوار کے التوام سے مختصراً درج کیا ھے - چار رنگی ۴۲ اور سادہ ۷۴ نقشے اور تصویریں ھیں جن کی مدد سے تمام تر جغرافی اور کمتر تاریخی و سیاسی مضامین سمجھائے گئے ھیں - یہ اٹلس بہت مفید ھے - مولف نے مختلف اور امکانی صحت کے ساتھ اس کو مرتب کیا ھے - کئی انگریزی مستند اٹلسوں اور کتابوں سے مدد لی ھے اور موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ھوئے کار آمد بنانے کی کوشش ھے - مروج و متداول اٹلسوں میں یہ بہت اچھا ھے - طلبہ اس سے استفادہ کرسکتے ھیں —

(چ)

سائنس

مفتاح الفنون

(پرائمر اور حصہ دوم)

(مرتبۂ انجمن صنایع و فنون - چھوٹی تقطیع صفحات اور

قیمت علی الترتیب ۹۲ - ۲۴۰ - پانچ آنے - ایک روپیہ -
ملنے کا پتہ :- رام نراین تاجر کتب کٹرہ روڈ الہ آباد)

ان رسالوں کا یہ مقصد ہے کہ سائنس کی ابتدائی اور ضروری معلومات وسطانی جماعت کے طالب علم اور عام اُردو داں حاصل کریں - یہ رسالے دراصل ہندی میں لکھے گئے تھے - ان کے ترجمے اُردو میں شایع کئے گئے ہیں -

سائنس پر اُردو میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن زیادہ ترفنی نقطۂ نظر سے ' جن کو صرف سائنس داں سمجھ سکتے ہیں عام لوگ ان سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں - عام فہم صاف سلیس اور غیر اصطلاحی زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں - مفتاح الفنون بے شبہ طلبہ اور عام لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے اور ان کے قارئین کے افادہ اور سہولت کو مد نظر رکھ کر اس کو سوال جواب کے طور پر لکھا گیا ہے - لیکن اصطلاحی عنصر اندر ہی اندر کام کر رہا ہے خصوصاً حصۂ دوم میں - اس میں سائنس کے ابتدائی اور اولین مسائل اور مضامین کو وضاحت اور عمدگی سے سمجھانے کی بجاے اصطلاحات کے معانی و مفہوم ذہن نشین کرائے گئے ہیں ' طلبہ اور سہولت پسند قارئین اکثر تعریفات اور اصطلاحات سے گھبرا جاتے ہیں اور جو محنتی ہیں وہ اس الجھیڑے میں پھنس کر اصل مضمون کو بہت دیر میں اور غیر واضح طور پر سمجھتے ہیں —

یہ رسالے موجودہ حالت میں طلبہ کے لیے مفید ہیں اگر آئندہ اشاعت کے لیے ان کو زیادہ سلیس زبان اور واضح اسلوب میں لکھا گیا تو عام اُردو داں بھی استفادہ کر سکیں گے —

(چ)

اصول حفظان صحت

(مولفۂ سید شرف الدین قادری صاحب۔ چھوٹی تقطیع،
کتابت طباعت اور کاغذ معمولی۔ صفحات ۳۲۔ قیمت چار آنے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ ابراھیمیہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن)

یہ چھوٹی سی کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں وہ ضروری اور ابتدائی باتیں درج ہیں جن کا جاننا صحت برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ کس جماعت کے لیے لکھی گئی ہے۔ چھوٹی جماعت کے بچوں کی استعداد کے لحاظ سے اس کی زبان بڑی حد تک یسیرالفہم نہیں۔ بڑی جماعتوں کے لیے یہ کتابچہ ہر طرح ناکافی ہے۔ مطالب اور مضامین سمجھانے کے لیے چند تصویریں اور نقشے بھی شریک کردیے ہیں —

(ج)

مجموعۂ تاریخ

(معروف بہ تاریخ آئینہ جمال۔ تصنیف سید محمود
ہاشم صاحب مرحوم جونپوری قیمت بارہ آنے)

تاریخ بھی ہمارے ادب میں منجملہ صنائع کے ہے اور ایک دلچسپ

اور اچھی صنعت ہے۔ سید محمد ہاشم صاحب مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ یہ مجموعہ انہی کی تاریخوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً اُنھوں نے کہیں اور اب ان کے فرزند سید مجتبیٰ حسین صاحب نے یک جا جمع کرکے شایع کی ہیں۔ بعض تاریخیں بہت اچھی اور بے تکلف کہی ہیں۔

تجدید عمل

(مذہب کی ایک نئی تھیوری۔ از مرزا عسکری علی خاں صاحب مجازی۔ اُردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور۔ قیمت آٹھ آنے)

یہ دوسری کتاب ہے؛ پہلی کتاب (تجدید عمل) پر اس سے قبل اس رسالے میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ ہندوستانی ریشنلسٹ سوسائٹی (لاہور) کی طرف سے شایع ہوی ہے۔ اس سوسائٹی کے بانی بھی کتاب کے مصنف مرزا عسکر علی خاں صاحب مجازی ہیں۔ وہ کسی مذہب یا کتاب کو آسمانی نہیں مانتے بلکہ مذاہب کو ملک و قوم اور زمانے کی ضروریات کی پیداوار خیال کرتے ہیں۔ اور تمام توہمات کو لغو اور مضر خیال کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اُنھوں نے ان امور پر بحث کی ہے کہ حقیقی مذہب قومیت ہے۔ مذہب قومیت سے زیادہ دیر پا نہیں۔ قومیت اور جنگ، تمدن اور گناہ، مذہب مساوات، قومیت جغرافی حدود کی پابندی کا نام نہیں۔ رجحانات ذہنی اور ہندوستانی یونیورسٹیاں، حقوق نسواں کی پابندی، ادبیات اور مفاد قومی —

مباحث دلچسپ ہیں اور پڑھنے کے قابل۔ کسی کو مرزا صاحب کے

خیالات سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ عقیدے میں صادق ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ ہمارے ملک کو جو سرتاپا توہمات میں مبتلا ہے خاص طور پر ریشنلزم (عقلیت) کی ضرورت ہے —

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی مختصر تاریخ

(مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب زبیری)

یہ مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ ہے جس میں قابل مرتب مولوی محمد امین صاحب نے ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام حالات و واقعات، یونیورسٹی کی تمام تحریکات، اندرونی انتظامات، عمارات اور تمام ضروری معلومات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد بعض نامور اور ممتاز اصحاب کی آرا کا انتخاب دیا ہے اور سب سے آخر میں اُن عطیات کی فہرست ہے جو سنہ ۱۹۲۱ ع سے سنہ ۱۹۳۳ ع کی پہلی ششماہی تک یونیورسٹی کو اُمرا و روسا اور بہی خواہان قوم نے عطا کی ہیں —

تہذیب عمل

(مولفۂ ملک محمد باقر نسیم رضوانی متعلم ایم۔ اے جامعۂ پنجاب۔ درمیانی تقطیع۔ کاغذ اچھا لیکن لکھائی چھپائی معمولی۔ صفحات ۷۹، قیمت چھہ آنے۔ دفتر تذکرۂ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات (پنجاب) سے مل سکتی ہے)

یہ کتاب عملی زندگی کی اصلاح اور آراستگی کے لیے لکھی گئی ہے

اس میں ان جسمانی اور عقلی و ذھنی قوتوں اور جذبات و خواھشات کا حال ھے جن سے اگر صحیح طریقے سے کام لیا جاے تو انسان زندگی کی مہم کامیابی کے ساتھہ سر کرسکتا ھے۔ اس میں ان عادات و افعال اور وظایف و اطوار کا بھی ذکر ھے جو انسانی قوای کو معطل و بیکار کردیتے ھیں۔ ان کے ازالہ کی تدابیر بھی مولف نے پیش کی ھیں اس میں کوئی نئی بات نہیں اور نہ کوئی ایسا نکتہ ھے جسے عام سمجھہ بوجھہ کا آدمی نہ جانتا ھو۔ بظاھر اس خامہ فرسائی کی زحمت گوارا کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھہ میں نہیں آتی۔ مولف نے لکھا ھے "یہ مختصر مقالات کسی فرد واحد کے بھی قواے ذھنی کی اصلاح کرسکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری مساعی مشکور ھوگئیں۔ انسانی ذھن کی طاقتیں غیر محدود ھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ انسان نے اب تک کن طاقتوں سے فائدہ اٹھایا ھے اور کون سی تا ھنوز بیکار یا معطل پڑی ھیں" —

خدا کرے کہ اس کتاب کی اشاعت سے مولف کے حسب توقع کوئی انسانی خوابیدہ قوت جاگ جاے —

(چ)

رھنمائے شکار

(مولفۂ صاحبزادہ محمد عبدالرحمن خان صاحب سابق کرنل افواج ریاست ٹونک (راجپوتانہ) صفحات ۲۷۸ قیمت تین روپے کلدار ملنے کا پتہ فتح منزل - ٹونک (راجپوتانہ)

مولف موصوف نے صید افگنی کے طور طریق اور نشانہ بازی کے نکات کو

ذاتی معلومات اور تجربات کی بنا پر جس بے تکلفی اور صفائی سے بیان کیا ہے اس کو ان کے شوق شکار کی تفسیر کہا جائے تو بیجا نہیں اس کتاب میں شکار کے متعلق جملہ امور کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ ایسے سادہ اور سہل الفہم طرز میں لکھا ہے کہ استاد کی مدد بغیر صرف پڑھنے سے ہر بات ذہن نشین اور مشق سے بخوبی حاصل ہوسکتی ہے۔ شکار کے سلسلے میں چند مفید علاج معالجے بھی لکھ دیے ہیں جن کا ایسے مواقع پر معلوم رہنا ضروری ہے۔ مائل بہ سیر شکار طبیعتوں اور شوقین مزاجوں کو شکار کے گر جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ سود مند اور باعث دلچسپی ہوگا۔ اردو میں اس قسم کی کتابوں کی بہت کمی ہے اس لیے مولف کی کوشش اور بھی قابل قدر ہے —

(ظ)

اُردُو کے جدید رسالے

روح تعلیم

(اڈیٹر مرزا سجاد علی خاں اختر بی۔اے، بی ٹی (علیگ)۔
کاشی ناتھ ملک لین، کلکتہ۔ سالانہ چندہ پانچ روپے)

یہ جدید رسالہ مہینے میں دوبار شایع ہوتا ہے، اس کا مقصد

اس کے نام سے ظاہر ہے - ۱۲۰ صفحے اردو کے اور پانچ چھ صفحے انگریزی مضامین کے ہیں - رسالہ مختصر ہے مگر کار آمد - اس قسم کے رسالوں کی شدید ضرورت ہے بشرطیکہ وہ صحیح اصول پر چلائے جائیں - اس رسالے کے قابل اڈیٹر سے یہ توقع ہے کہ وہ اسے حقیقی طور پر اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش کریں گے —

شاہجہاں

(اڈیٹر سید ولایت حسین صاحب دہلوی کٹرہ بریاں دہلی - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ رسالہ بھی مہینے میں دوبارہ شایع ہوتا ہے اور ادبی علمی و تنقیدی رسالہ ہے - اس کے پہلے نمبر سے جو ہمارے سامنے ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہونہار پرچہ ہے اور آگے چل کر زبان و ادب کی اچھی خدمت کرے گا - سب سے پہلا مضمون شمس العلما حضرت آزاد مرحوم پر حضرت کیفی (پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب) کا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے - فسانے اور نظم کی چاشنی بھی موجود ہے —

حیات نو

(اڈیٹر شیخ محمد بدر الاسلام فضلی صاحب بی - اے ، بی - ٹی (علیگ) ہیڈ ماسٹر حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت - سالانہ چندہ دو روپے)

یہ سہ ماہی رسالہ حالی مسلم ہائی اسکول سے مولانا خواجہ حالی

مرحوم کی یادگار میں شایع ہوا ہے - رسالے کے مضامین اور ترتیب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی - اگرچہ یہ رسالہ ایک اسکول کی طرف سے شایع ہوتا ہے لیکن بعض کالجوں کے رسالوں سے بھی بہتر ہے افتتاحیہ کے بعد "یاد حالی" کے عنوان سے ایک نظم درج ہے جو ابوالاثر حفیظ صاحب نے سر سید راس مسعود کی تشریف آوری اور معائنۂ مدرسہ کے وقت عام جلسے میں پڑھی تھی - بہت اچھی نظم ہے - اس کے بعد "ہماری درسگاہ" کے تحت میں حالی مسلم ہائی اسکول کے اغراض و مقاصد ' مختلف شعبوں اساتذہ و طلبہ ' عمارات ؛ نصاب تعلیم ' فیس ' کتب خانے ' انجمنوں وغیرہ کا تفصیلی اور دلچسپ ذکر ہے - مولانا حالی کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ بھی درج ہے - مولانا حالی کے خطوط سے ان کے بعض حکیمانہ مقولے انتخاب کرکے لکھے ہیں جو پڑھنے اور عمل کرنے کے قابل ہیں - ان کے علاوہ "فن سیرت پر ایک نظر" اور "جاپان پر ہندوستان کے احسانات" کے عنوان سے بہت مفید مضمون ہیں - کئی دلچسپ اور اخلاقی فسانے بھی ہیں - آخر میں طالب علموں کے لیے چھوٹے چھوٹے مضمون اور کام کی باتیں ہیں جو اچھی زبان اور اچھے پیرائے میں لکھی ہیں - اسی حصے میں دو تین مضمون مدرسے کے طالب علموں کے بھی ہیں - اس کے بعد "رونق محفل" کے عنوان کے تحت میں لطیفے ' کھیل اور معمے ہیں جو طلبہ کے لیے خاص طور پر دلچسپ ہیں - سب سے آخر میں تعلیمی اور دوسری خبریں ہیں —

رسالہ خاص طور پر طلبہ کے لیے نیز عام شائقین کے لیے نہایت موزوں ہے اور مضامین وغیرہ کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اور خصوصاً جس قسم کے مضامین فراہم کیے گئے ہیں وہ بہت قابل تعریف ہیں - اگر

رسالہ اسی احتیاط اور اهتمام سے جاری رہا تو یقین هے کہ مدارس نیز مدارس سے باهر بڑے شوق سے پڑھا جاے گا —

القاضی

(اڈیٹر ابوالقمر محمد جمیل الدین احمد شہدا بلگرامی - قاضی مقبول احمد اینڈ کمپنی دروازہ شہرانوالہ ' لاهور - سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماهانہ رسالہ لاهور سے نکلا هے - نام تو قاضی هے لیکن در حقیقت نیم طبی نیم شرعی رسالہ هے اور رسالے کا زیادہ تر حصہ طرح طرح کی عجیب و غریب دواؤں سے بھرا هوا هے —

همدرد صحت

(اڈیٹر حکیم حاجی عبدالحمید صاحب - همدرد منزل لال کنواں دهلی - سالانہ قیمت ایک روپیہ)

یہ دهلی کا ایک ماهانہ طبی رسالہ هے - طبی مضامین ' ادویہ کے خواص و اثرات ' مختلف بیماریوں کے علاج اور حکما کے حالات پر